سیاست نامہ

شام

علی حسین رضوی

حیدرآباد لطیف آباد، یونٹ نمبر ۸-C۹

سیاست نامہ
شام

(صرف شیعوں کے لئے)

سیاست نامہ شام

(صرف شیعوں کے لئے)

☆

مولفہ

علی حسین رضوی

سبیل سکینہ
حیدرآباد لطیف آباد، یونٹ نمبر C1-A

مطبوعہ

امامیہ اکیڈمی۔ کراچی

جملہ حقوق محفوظ

سیاست نامہ
شام

اشاعت	:	جولائی ۲۰۰۰ء
تعداد	:	ایک ہزار
قیمت	:	روپے

ترتیب کتاب

دیباچہ سیاست	۵	پانچواں خلیفہ راشد	۸۳
سرزمین عرب	۹	معاویہ کی عہد شکنی	۸۷
عراق وشام کے جغرافیائی حدود	۱۱	شاطرانہ دور حکومت	۹۰
طلوع اسلام	۱۴	قتل گاہ شام	۹۹
شام وعراق! تاریخ کی روشنی میں	۲۰	صحابی رسول	۱۰۵
اسلام میں منافقت	۲۳	دشمنان بانی اسلام	۱۰۹
باغیان خلافت	۳۱	نبوت سے خلافت تک	۱۱۵
خلافت شام کا پس منظر	۳۶	بدر واحد	۱۲۴
خلیفہ برحق	۴۵	جنگ خندق	۱۲۶
شام کا معرکہ خلافت	۵۰	صلح حدیبیہ	۱۲۸
شام کا نظریہ جہاد	۶۲	جنگ خیبر	۱۲۹
جنگ نہروان	۶۴	رجعت شمس	۱۳۱
کمیں گاہ کا تیر انداز	۶۵	جنگ موتہ	۱۳۳
مالک اشتر	۶۸	سریہ ذات السلاسل	۱۳۴
محمد بن ابی بکر	۷۰	فتح مکہ	۱۳۵
معاویہ کے مہمات	۷۲	غزوہ حنین	۱۳۷
شہادت امیر المومنین	۷۶	غزوہ تبوک	۱۳۹

عقبہ ذی فنق	۱۴۱
سورۃ برات	۱۴۲
غدیر خم	۱۴۳
مباہلہ نجران	۱۴۴
ختم المرسلین	۱۴۶
حدیث سازی کا تدریجی ارتقاء	۱۵۶
سیرت صحابہ تاریخ و قرآن کے آئینے میں	۱۶۳
خلافت سازی کی اساس	۱۷۲
منافقین	۱۸۴
اکابر اسلام	۱۸۷
سرمایہ احادیث	۱۹۲
تدوین حدیث	۱۹۸
تخلیق احادیث کا پس منظر	۲۰۰
ہادیانہ قیادت	۲۰۵
معاصرین صدیقیت	۲۱۰
اساس خلافت	۲۱۳
راویان حدیث	۲۱۶
ایک شیعہ محدث	۲۲۰
بنی امیہ کا نصب العین	۲۲۳
خلیفہ شام: ایک اسلام ساز	۲۲۸
حال سے مستقبل کی طرف	۲۳۰
مسلک فقہ	۲۳۲
متضاد احادیث	۲۳۳
کسی کو جانشین نہیں بنایا	۲۳۸
تدوین حدیث سے پہلے اور تدوین کے بعد	۲۴۰
پیغمبر کا جانشین	۲۴۳
حدیث سازی کا ایک بدیہی نتیجہ	۲۴۳
اکابر میں باہمی اختلاف	۲۵۱
ایک منزل: تین راستے	۲۵۹
حسبنا کتاب اللہ	۲۶۵
فرقہ امامیہ کا تاریخی فیصلہ	۲۷۰
دو اسلام: دو قرآن	۲۸۲
توحید	۲۸۵
رسالت	۲۸۹
خلاصہ تاریخ	۲۹۴
مآخذ	۲۹۰

دیباچۂ سیاست

بنی نوع انسان کی تاریخ جس سرزمین سے بھی شروع ہوئی ہو، اس وقت اس کا کوئی نام نہیں تھا اور آدم ثانی کا سفینہ جس چوٹی سے بھی ہمکنار ہوا ہو، اس کا تعین بھی غیر منفصلہ ہے لیکن یہ حقیقت تاریخ کے مسلمات میں ہے کہ عرب کا تعلق سرزمین انبیاء سے ہمیشہ محکم رہا اور شاید یہ بات شروع ہی سے مشیت میں داخل ہو، کہ انبیائے ماسبق ان ریگزاروں کو توحید سے آشنا کراتے رہیں جہاں ختم المرسلین کا نقش اول مرتسم ہونا تھا۔۔۔

ام القریٰ میں خانہ کعبہ کی تعمیر عرب میں توحید کا دوسرا آخری علامیہ، مشیت کی طرف سے ایک اشاریہ اور نسل ابراہیم کا نقش دوام تھا جو ہزاروں سال کے فصل سے وجود میں آیا اور جس نے دنیائے معلوم کے گوشے گوشے کو روشن کر دیا۔ اس روشنی میں خالق کی طرف سے تمدن مخلوقات کا آئین نافذ ہوا جس کو ''انسانیت کے نام، خدا کے آخری پیغام'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

حضرت آدم پہلے سفیر الٰہی اور پہلے انسان تھے۔ ان کے آئین کا کوئی نام علم انسانی میں پایا نہیں جاتا۔ اس کو اگر تعبیر کیا جا سکتا ہے تو انسانیت اور انسانیت کی روح میں خداشناسی اور خودشناسی کے وجود سے جو اگلی ہر شریعت الٰہیہ کا نصب العین رہی۔ حامل شریعت کو رسول اور نافذ و محافظ شریعت کو نبی قرار دیا گیا۔۔۔

پیغمبر عرب آخری رسول اور آخری نبی تھے۔ آپ کے بعد مشیت ایزدی میں آپ کی شریعت کے نافذ و محافظ کا منصب نبوت کے بجائے امامت قرار پایا تھا۔ جس کو آپ کی امت کی بڑی تعداد نے تسلیم نہیں کیا اور آپ کا جانشین خود منتخب کر لیا جس کو خلافت کہہ کر پکارا گیا۔ لیکن امت کا ایک گروہ امامت کا قائل رہا۔

اس طرح وفات ختم المرسلین کے پہلے دن سے امت مسلمہ خلافت وامامت کے دو حصوں میں منقسم ہوگئی۔

اس سرسری جائزے میں محرکین خلافت کے پیش نظر وہ مملکت اسلامیہ تھی جو افضل الانبیاء نے اپنے بعد چھوڑی تھی اور ریگزار کا سیاسی ذہن جس کے حصول کے لئے پہلے سے زمین ہموار کر چکا تھا۔ یہ حقیقت بھی اہمیت سے خالی نہیں کہ قبائل عرب باہمی چشمک میں ایک دوسرے کی بالادستی قبول کرنے کے عادی نہیں تھے اسی لئے اگر دو قبیلوں میں جنگ چھڑ جاتی تو اس کا سلسلہ نسلوں تک چلتا رہتا۔ ہوسکتا ہے کہ کسی نے سوچا ہو کہ زمین کے نظم و نسق میں آسمان کی مداخلت روا نہیں ہوسکتی، حق اہل زمین کا ہے، انھیں کو ملنا چاہئے۔ رہ گئی بات اسلام کی تو قرآن اس کا آئین ہے، حامل قرآن نہیں ہے تو وہ خود اس کو سمجھ لیں گے، خدا کی کتاب ہے تو اسی زبان میں جس کو وہ بولتے اور سمجھتے ہیں!

بدیہی طور پر خلافت کے دو اہم کردار حضرت ابوبکر اور حضرت عمر قرار دیئے جاتے ہیں۔ ان کے جو فضائل اموی خلافت کے دور اول میں قلمبند کئے گئے، وہ انھیں نیابت پیغمبر کے بجائے لائق پیغمبری ثابت کرتے ہیں۔ اس طرح ختم المرسلین اور مملکت ختم المرسلین دونوں پر پرچم خلافت لہرادیا گیا اور امامت منصوص من اللہ ایک دائرے میں سمٹ کر رہ گئی جس کو تاریخ اسلام میں خلافت کے چوتھے درجے پر فائز کیا گیا لیکن ہادی برحق کی وفات کو پچیس سال گزر چکے تھے۔ اس مدت میں مسلمان ایک ایسے مسلک پر چڑھ چکے تھے جس میں اسلام کی بساط پر روایات عرب کے نقش ونگار بہت گہرے ہو چکے تھے۔ بالفاظ دیگر بنی ہاشم کی صداقت پر سیاست بنی امیہ کی چھاپ لگ چکی تھی۔

ایسے میں پیغمبر عرب کے ازلی جانشین نے اسلام خالص کی نشاۃ ثانیہ کی کوشش کی تو پورے ماحول کو اپنا مخالف بنالیا۔ اس پر طرفہ ستم یہ ہوا کہ قدامت عرب کے علم بردار کا بیٹا موروثی ذہانت وفطانت لے کر میدان میں آ گیا۔۔۔۔ اور صداقت وسیاست کی معرکہ آرائی میں جیت سیاست کی ہوئی۔

امامت کے مقلدین کی قوت بازو اور جذبہ ایمانی اگرچہ اپنے امام کا حق چھین لینے پر قادر تھے لیکن امام کے ہاتھ خود وصیت رسول اور فرائض امامت کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ وہ اقتدار کے لئے امت پر ہاتھ اٹھا نہ سکتے اور جب امام کو ایسی مجبوریاں لاحق تھیں تو ماموم کیا کرتے مگر جب سوال پیدا ہوا حرمت رسول اور تحفظ اسلام کا تو قبضہ شمشیر پر رکھا ہوا پیغمبر اسلام کا ہاتھ خود بخود ہٹ گیا اور ذوالفقار نیام سے نکل کر علی کے ہاتھ کی طرف دیکھنے لگی۔

حضرت عثمان کے قتل کے بعد خلافت بڑی بے چارگی میں پڑ کر خود مسند امامت پر آ گئی تو

رسول کے جانشین برحق نے دین محمد کا جائزہ لیا جس کی وضع قطع، نصب العین وروح سب کچھ مسخ ہو چکے تھے۔ایسے میں خیبر و خندق میں چمکنے والی تلوار آخری بار دست حیدر کرار میں آ گئی اور صفین کی رزم گاہ میں پیروان امامت کو دل کے حوصلے نکالنے کا موقع مل گیا۔۔۔رسول کے اکثر برگزیدہ صحابی داعی اجل کو لبیک کہہ چکے تھے مگر ان کی جگہ دوسرے راسخ الایمان لے چکے تھے۔

تاریخ شاہد ہے کہ اویس قرنی، ابوایوب انصاری، اور ذوالشہادتین کے سے بزرگوں نے میدان صفین میں تیغ آبدار کے وہ جوہر دکھائے کہ ان کی جوانیاں کٹے ہوئے گلوں سے داد تحسین دیئے بغیر نہ رہیں۔لیلۃ الحریر نے جہاد بالسیف اور جہاد بالنفس کے جو مناظر دیکھے، وہ شاید غزوات رسول میں روز روشن کے آفتاب نصف النہار نے بھی نہ دیکھے ہوں گے۔۔۔۔

صبح ہونے سے قبل سیاست کار شام کی شکست یقینی تھی لیکن اس نے کلام باری کو آلہ فریب بنا کر فاتح خیبر کو فرض امام پورا کرنے پر مجبور کر دیا اور حکم امام نے مالک اشتر کے سے شجاع روزگار کو جہاد بالنفس کی منزل میں لاڈالا۔صداقت کی فتح سیاست کی مکاری سے شکست میں بدل گئی اور خلافت شام کی بنیاد ہزاروں مسلمانوں کے خون پر رکھ دی گئی۔۔۔جس کا عنوان مسجد کوفہ میں پیغمبر اسلام کے جانشین ازلی کی شہادت پر ثبت ہے۔

شام کی خلافت تاریخ اسلام میں خلافت مدینہ کا ایک سلسلہ قرار دی جاتی ہے لیکن بہت فرق ہے دونوں خلافتوں میں۔مدینے کی خلافت ترمیم و تنسیخ کے باوجود خلافت اسلامیہ کہی جا سکتی تھی۔کوئی اجنبی اس کو دیکھ کر اچانک کہہ نہ سکتا کہ پیغمبر عرب سے اس کا تعلق نہیں ہے۔مگر یہی خلافت جب دمشق کے دارالامارہ میں لائی گئی تو اس میں قیصریت اور کسرائیت کی اتنی رنگ آمیزی کی گئی کہ اس کا ظاہر و باطن سب کچھ بدل کر رہ گیا۔اس کو دیکھ کر کسی کو یہ کہنے میں تامل نہ ہوتا کہ عرب کی قدامت کو روم کی شان وشوکت اور ایران کے جاہ وجلال سے مزین کیا گیا ہے۔

ختم المرسلین کا اسم گرامی اب بھی اس کی پیشانی پر لکھا ہوا تھا اور اس کا نام ''خلافت مملکت اسلامیہ'' تھا مگر اس کا آئین اہل بیت کے خون سے تحریر کیا گیا تھا جس کی دفعات وقت کی تدریجی ترقی کے ساتھ بدلتی رہیں اور قرآن کی معنی آفرینی سے ان میں مزاج شاہی شامل ہوتا رہا۔

سرزمین عرب

عرب کا شمار ہفت اقالیم تہذیب میں نہیں ہوتا لیکن بابل و نینوا اور مصر کے اثرات اس سرزمین پر مختلف جہتوں سے پڑتے رہے ہیں۔ سندھ و ہند، ایران و چین اور یونان و روم شاید اس کو بُعدِ مکانی کے سبب متاثر نہیں کر سکے پھر بھی عربوں کی توہم پرستی میں ان سب کی کچھ نہ کچھ جھلک پائی جاتی تھی۔

طوفانِ نوح کے بعد ایک مدت تک سرزمین عرب پر تاریکیوں کے پردے پڑے رہے پھر کلام مجید کی صداقت سے اس کی روایتی تاریخ روشنی میں آئی اور حضرت اسمٰعیلؑ کی تشنگی سے زمزم کے سوتے پھوٹے۔۔۔ اس ریگزار میں پانی کا چشمہ یقیناً نومولود اسمٰعیل کا معجزہ تھا لیکن صحیح معنی میں توحید کے چراغ حضرت ابراہیم کے ہاتھوں روشن ہوئے اور تعمیر کعبہ سے ریگزار میں ایک وجود لامکانی کا علامیہ وجود میں آیا۔

حضرت ابراہیم کا دور ایک اندازے کے مطابق ہندوستان میں مہاتما گوتم کا عہد کہا جاسکتا ہے۔۔۔ واسدیو کرشن اور رام چندر جی کے زمانے ہزاروں ہزاروں سال کے پس منظر میں ہیں جن کا تعین ممکن معلوم نہیں ہوتا۔

انسان کی تمدنی زندگیوں میں نیل، دجلہ و فرات اور سندھ کی وادیوں کو اولیت حاصل ہے جن کو پانچ ہزار سال قبل مسیح بتایا جاتا ہے۔ بادی النظر میں بندرابن اور گنگا جمنا کے دوآبے ملحقات سے خارج نہیں کیے جاسکتے مگر واقعات کے آثار پائے جانے کے باوجود افسانوی تاریخ نے عقیدے کی شکل اختیار کر لی ہے۔۔۔ محققین، تہذیب انسانی کا نقطہ آغاز وادی نیل کو قرار دیتے ہیں اور بابل کو اس کا ہم عصر بتاتے ہیں۔ وہی زمانہ وادی مہران میں تہذیب کے ارتقاء کا ہے۔

ان تمام تہذیبوں نے ضروریات زندگی کے تقاضوں میں آنکھ کھولی اور توہمات کے دامن

میں پرورش پائی۔ شاید خالق کون ومکان کا کوئی تصور عام خیالوں میں ابھرتا ہو اور ناپختہ ذہنوں میں تشکیل پاتا ہو۔ یہی سبب ہے کہ ان کے آثار میں ایک قسم کی مماثلت ملتی ہے جو فہم وادارک کی بھول بھلیوں میں گم ہو جاتی ہے۔

مافوق الفطرت طاقت کے یقین میں جادو اور سحر وساحری کی راہیں پیدا ہو جانا ناگزیر تھا لہٰذا وادی دجلہ وفرات کے سامری دور میں اس کا آغاز ہوا پھر بابلی تہذیب کے عہد میں بھی وہ مادی ترقیوں کے ساتھ پروان چڑھتا رہا۔ مصر کی بھی کچھ ایسی ہی صورت حال تھی جو حکومت سازی کے مد وجزر میں آگے بڑھتی چلی گئی۔

مادی ترقی ہمیشہ انسان کے قومی اور علاقائی اقتدار کی راہیں پیدا کرتی رہی ہے۔ مصر اور عراق وشام کی باہمی نبرد آزمائی بھی اس کا نتیجہ تھی جس سے پہلے عرب کا مغربی حصہ متاثر ہوا پھر آہستہ آہستہ پورے صحرا کے قبائل اس کا اثر قبول کرنے لگے۔

حضرت ابراہیم کے ورود عرب کے وقت عربوں کا مسلک و مذہب کیا تھا؟ اس کے لئے اتنا ہی کہنا کافی ہوگا کہ مادیت میں خالقیت کا تصور عام تھا اور انسان چاند سورج، شجر وحجر میں پیدا کرنے والے کو ڈھونڈھ رہا تھا۔ اصنام پرستی اور خود پرستی اس پر مستزاد تھی۔

اس سرزمین کو بابل کی طرح جادونگری تو کہا نہیں جا سکتا مگر انسان پر دیوی دیوتاؤں کا تسلط مسلّم سمجھا جاتا تھا اور قبائلی زندگیوں میں یہ انجانی طاقتیں کارساز حقیقی قرار دی جاتی تھیں۔ کوئی نہ کوئی بت کسی نہ کسی نام سے ہر قبیلے کا نشان امتیاز تھا اور اس میں خدائی طاقت کا ہونا قبیلہ کا جذبہ عقیدت۔ یہی جذبہ ہر قبیلے کا مرکز اتحاد قرار دیا جاتا تھا۔ نسلی تفاخر کے ساتھ ساتھ قبائلی عصبیت بھی پائی جاتی اور وطنیت ان سب پر مستزاد تھی اس لئے وہ ریگزار کی زندگی پر قانع رہے۔

عراق وشام کے جغرافیائی حدود

جزیرہ نمائے عرب کے ملحق علاقوں میں جو نام آتے ہیں، ان میں عراق وشام سرفہرست ہیں جن میں سے عراق شمال میں مشرق کی طرف اور شام شمال میں مغرب کی طرف واقع ہے اسی لئے عرب اس کو برالشام یعنی بائیں جانب کا ملک کہا کرتے تھے۔ لبنان بھی شام ہی کا ایک حصہ تھا اور بحر روم کے ساحل تک پھیلا ہوا تھا۔ یہی صورت فلسطین کی بھی تھی جو جنوب مغرب میں جبل کارئیل سے گلیلی تک واقع تھا۔ موجودہ اردن غالباً عراق کا حصہ تھا لیکن یہ جغرافیائی تقسیم کسی وقت بھی مستقل نہیں رہی اور اس کی حدود نوک شمشیر سے وقتاً فوقتاً بدلتی رہیں۔

ایران وعرب کے درمیان خلیج فارس حائل تھی اور عربوں کے لئے خشکی کا راستہ قدرے طویل تھا جن میں سلطنتوں کی حدود کو ہمیشہ بڑا دخل رہا اور آمد و رفت اور نقل مکانی بھی اسی تناسب سے ہوتی رہی۔

اس طرح شام سے عرب کا تعلق قبل تاریخ بھی براہ راست رہا اور عراق تو عرب سے ملا ہی ہوا تھا مگر شام کی زرخیزی کو قدامت حاصل تھی لہٰذا انسان کی تہذیبی بیداری کے اوائل سے دجلہ وفرات کے دوآبے میں عربوں کے سکونت پذیر ہونے کا سراغ ملتا ہے اس تحقیق کے بعد یہ نتیجہ اخذ کرنا کچھ دشوار نہ ہوگا کہ بابل ونینوا کی تہذیبوں سے عرب بالکل الگ تھلگ نہیں رہے اور ذہن وتہذیب کے ارتقاء میں نہ صرف شام بلکہ مصر نے بھی ایک غیر شعوری کردار ادا کیا۔

انسانی تہذیب کا ارتقاء مسلمہ طور پر دریائی وادیوں کا مرہون منت ہے جن میں نیل، دجلہ و فرات، مہران، گنگا وجمنا کے سواحل کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ چین کا شمار بھی اسی کے ذیل میں ہوتا ہے اور ایران کا نام بھی دجلہ وفرات اور سندھ مہران کے ساتھ لیا جا سکتا ہے۔

اجتماعی آبادیوں کے بعد انسان پر انسان کی بالادستی کا سوال خود بخود پیدا ہو جاتا ہے اور مادیت کی بساط پر کسی انجانی طاقت کا سہارا ذہانت انسانی کا تقاضا بن جاتا ہے۔ مصر کی جادوگری، بابل و نینوا کی ساحری اور ہندوستان کی برہمنیت اسی کے نتائج تھے۔ پھر آلات حرب اور طاقت کا استعمال ہونا ناگزیر ہو گیا اور چھوٹی بڑی حکومتوں کا وجود ان سب کا بدیہی نتیجہ!

مصر و بابل میں یہی سب کچھ ہوا اور چار ہزار سال قبل مسیح وادی دجلہ وفرات میں مندر کا پروہت پہلا سامری حکمران بنایا گیا پھر بابل کی سلطنت قائم ہوئی اس کے بعد آشور دیوتا کے پجاری برسر اقتدار آئے۔

دو ڈھائی ہزار سال (ق م) کا یہ عہد دنیا کی تمام قدیم تہذیبوں میں یکساں نظر آتا ہے جس نے متعلقہ حلقوں میں اپنے اپنے اثرات مترتب کیے اور شرک و بت پرستی انسانی ذہنوں پر مسلط ہوتی چلی گئی۔ عرب میں اس کی نوعیت میں ریگزار کی روایات بھی شامل تھیں اور بابل میں انسان کی جسمانی اور ذہنی توانائیوں کے دامن میں شخصیت پرستی کا غلبہ بھی تھا جس کے لئے حضرت ابراہیم کی بعثت ہوئی۔

کہا جاتا ہے کہ بابل ۳۵۔۴۰ مربع میل پر پھیلا ہوا شہر تھا۔ جس کے تخت سلطنت پر نمرود بن کنعان خدائی کا دعویدار تھا۔ حضرت ابراہیم کی جائے پیدائش حران ہو یا بابل لیکن پیغمبر کسی مختص علاقے یا سرزمین کے لئے نہیں آتا۔ وہ تو بھیجا جاتا ہے پورے عالم انسانیت کے لئے لہٰذا عرب آپ کے حیطۂ پیغمبری سے باہر نہ تھا اور یوں بھی ان کی نسل کا مستقبل عرب سے وابستہ تھا لہٰذا قدرت نے اس کے اسباب خود فراہم کیے اور آپ نے ام اسمٰعیلؑ کو اس سرزمین پر پہنچا دیا جہاں سے آسمان نبوت کا آخری آفتاب طلوع ہونے والا تھا۔

حضرت ابراہیم کا ورود سنگ بنیاد تھا ریگستان کی تطہیر کا، بالفاظ دیگر آپ شام و فلسطین کی برکتیں عرب کو پہنچانے آئے تھے جن کی واپسی ڈھائی ہزار سال کے فصل سے وارث اسمٰعیل کے ہاتھوں ہونے والی تھی۔

قبیلہ جرہم میں حضرت اسمٰعیل کی پرورش اور ابراہیمؑ کا کئی بار عرب پہنچنا حقائق تاریخ میں ہے لیکن کتنی عظیم حقیقت ہے یہ، جب باپ بیٹے نے مل کر روئے زمین پر وہ علامیہ تعمیر کیا جو قیامت تک بیت اللہ کے نام سے موسوم کیا جائے گا۔ اس تعمیر نے بھٹکے ہوئے صحرائی عربوں کو صراط مستقیم دکھائی یا نہیں لیکن ایک طویل مدت تک ریگزار کے ذروں میں وحدانیت کی آب و تاب نظر آتی رہی۔ ہادیوں کی

سرزمین سے عرب کا یہ رابطہ اتنا مضبوط ثابت ہوا کہ کئی پیغمبروں نے اس کو عزت بخشی۔ حضرت موسیٰؑ نے مصر سے اس کا ایک آہنگ پیدا کیا اور جناب سلیمانؑ نے ملکہ بلقیس کے حوالے سے خالق مطلق سے متعارف کرایا۔

انجام کار ختمی مرتبت کی پیدائش سے قبل جب صحرائے عرب صنم کدہ بن چکا تھا تو نسل اسمٰعیل کے موحدین کے ساتھ ساتھ توریت وانجیل کے عالم توحید باری کا آوازہ بلند کر رہے تھے مگر کوئی خرافات مختلفہ میں مبتلا قوم کی اصلاح پر قادر نہ ہو سکا۔ شاید ان میں سے بعض کو ورقہ بن نوفل کی طرح کسی کے آنے کا انتظار تھا جسکی بشارت انہیں کتب آسمانی سے مل چکی تھی۔

حضرت ابراہیم نے ریگستان میں خدا کا گھر بنایا تھا مگر وہ دیوی دیوتاؤں کا مرکز بننا شروع ہوا تو نہ صرف عرب کا بلکہ دور دور کے علاقوں کا معبد بن گیا۔

تہذیبوں کا ارتقاء بنی نوع انسان کے لئے بہر طور ایک فال نیک ثابت ہوا تھا۔ اس سے مصر و شام، چین و ہند، یونان و روم اور عرب و ایران، ایک دوسرے سے اجنبی نہیں رہے تھے اور بالواسطہ دور دراز کے علاقے بھی آپس میں متعارف ہو گئے تھے مگر جو علاقے ایک دوسرے سے قریب تر تھے، ان میں آپس کے روابط زیادہ مضبوط تھے۔ اس طرح شام وعراق نے عرب پر گہرے نقوش مترتب کیے تھے۔

پھر باہم ضروریات زندگی کے تبادلے شروع ہوئے تو عقائد میں بھی ایک آہنگ پیدا ہو گیا اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ مصر کے مقابلے میں بابل ونینوا نے عرب کی توہم پرستی میں زیادہ اہم کردار ادا کیا۔

حضرت ابراہیم کے بعد اولاد اسحٰقؑ میں ان گنت پیغمبر گزرے جنہوں نے شام وفلسطین میں خدا شناسی اور خود شناسی کی اشاعت کی۔ ان میں سے بعض کا آوازہ عرب کے صحراؤں میں بھی گونجا مگر ریگزار کے ذروں میں اس سے کوئی آب وتاب پیدا نہیں ہوئی۔ اوہام پرستی مادیت کے دائرے سے باہر نہ نکل سکی حتیٰ کہ وہ زمانہ آ گیا جب نسل اسمٰعیلؑ کے شہرہ آفاق وارث نے کوہ صفا کی بلندی سے وحدانیت کا نعرہ لگایا اور مکے کے در و دیوار میں ایک لرزہ پیدا کر دیا۔

طلوع اسلام
چند لفظوں میں

مکے میں سید بطحیٰ کے پوتے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بن عبداللہ کی پیدائش نہ صرف نسل آدم کی سربلندی کا ایک علامیہ تھی بلکہ تاریخ کائنات کی وہ کروٹ بھی جس نے عبد و معبود کے ہر رشتے میں ایک ارتعاش پیدا کر دیا۔ علامات قبل و مابعد ولادت مورخین نے بڑی صراحت سے بیان کی ہیں اور عبداللہ کے عظیم بیٹے کا مختلف زاویوں سے جائزہ لیا ہے۔ میری گزشتہ تصنیف ''سیاست نامہ عرب'' میں بھی اس کا ایک قلمی مرقع پیش کیا گیا ہے جس میں ریگزار کے نجات دہندہ کی اس تصویر کے داغ دھبے دور کیے گئے ہیں جو ذات واجب الوجود کے آخری سفیر کو مسند حکمرانی کی زینت بنانے کے لئے بنائی گئی تھی۔

آدمیت کے خمیر میں انوار پیغمبری کا متحرک مجسمہ یقیناً ایک انسان تھا۔ نوع بشر میں بالکل عام انسان کی طرح مگر تھا خاتم المرسلین اور ایک لاکھ چوبیس ہزار کا آخری عدد، جو خطا و نسیان سے مبرا اور سرتاپا انسانیت کے سانچے میں ڈھلا ہوا اور یہی وہ خصوصیات تھیں جن کی بنا پر اس کو صادق و امین بطحیٰ کہا جاتا۔

بنی ہاشم کا یہ نوجوان اٹھتی جوانی ہی میں ریگزار کی آبرو بن چکا تھا اور خود کفار قریش کی طرف سے سچائی اور دیانت کی سند حاصل کر چکا تھا۔ مکہ اور نواح مکہ میں ہر عمر کے لوگ اس کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے، بالخصوص نوعمروں کے دلوں پر اس کا سکہ بیٹھا ہوا تھا۔ اس لیے جب اس نے کوہ صفا کی بلندی سے توحید کی آواز بلند کی اور قریش کی اکثریت اس کی دشمن بن گئی تب بھی بعض نوجوانوں نے اس کا ساتھ نہیں چھوڑا۔

عمائدین مکہ کے سامنے ان لوگوں کی کوئی وجاہت نہیں تھی۔ فلپ ہٹی نے ان کا تقابل گلیلی کے ان ملاحوں سے کیا ہے جنہوں نے شروع شروع میں ناصری پیغمبر کی آواز پر لبیک کہا تھا لیکن یہ تبصرہ عصبیت سے خالی نہیں۔ بلاشبہ ان کا شمار مقتدرین مکہ میں نہ ہو سکتا مگر وہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بن

عبداللہ کے لئے ایک مخلصانہ اور عقیدت مندانہ جذبہ ضرور رکھتے۔ نیتوں میں کھوٹ کب پیدا ہوا؟ اس کے وقت کا تعین نہیں کیا جاسکتا تاہم اتنا کہا جاسکتا ہے کہ جب ان کی نظروں کو عرب کا عظیم ہادی کسی فرمانروا کی شکل میں دکھائی دینے لگا تو بعض اس کی جانشینی کا خواب ضرور دیکھنے لگے اور ایک تعداد درحقیقت اس پرچم کے نیچے چڑھتے سورج کی پجاری بن کر جمع ہونے لگی۔

اسلام کے پیغمبرؐ نے اعلان توحید کے بعد جو شدائد جھیلے تھے، وہ تاریخ کا حصہ ہیں اور بلاشبہ ان کو برداشت کرنا کسی ہادی مطلق کا کام تھا ایسے ہادی کا کام جس کا ہر عمل مشیت کا تابع اور جس کی نظر میں اس کی موت وحیات، سب مرضی الٰہی کی پابند۔ یہ سلسلہ ہجرت مدینہ تک چلتا رہا۔

مدینے کی ہجرت بظاہر کفار قریش کے مظالم سے بچنے کے لئے تھی لیکن بنگاہ غائر دیکھا جائے تو مکے کی بھیانک فضا اشاعت اسلام میں راستے کی دیوار بن گئی تھی اور ختمی مرتبت کو پرسکون ماحول کی ضرورت تھی جس میں وہ اپنا پیغام دوسروں تک پہنچا سکتے۔ مدینے میں توقع کے مطابق ایسے حالات میسر آ گئے کہ ارتباط باہمی میں ذہنوں کو بدلنے کے مواقع مل گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے انصار کی بڑی تعداد حلقہ بگوش اسلام ہوگئی۔

مکے کے صنم پرستوں کو اس کی خبریں ملیں تو وہ انگاروں پر لوٹنے لگے اور ابوسفیان کی سرکردگی میں مدینے پر چڑھ دوڑے۔ کمزور اور ناطاقت مسلمان کسی طرح مقابلے کے لائق نہ تھے مگر اپنا دفاع نہ کرنا خودکشی کے مترادف تھا۔ مجبوراً مفلوک الحال اور نہتے تین سو تیرہ مسلمان ٹوٹی پھوٹی تلواریں لے کر میدان میں آ گئے۔ مقابلہ مسلح و منظم اور کئی گنی تعداد سے تھا مگر سر سے کفن باندھ کر لڑنے والوں نے موت کے پیغامبروں کو ان کا تحفہ واپس کر دیا اور بدر کے مقام پر اسلام کو پہلی کامیابی حاصل ہوئی۔

کٹر ابوسفیان کئی نسلوں کے پروردہ بتوں کا سرپرست تھا اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ دور دور تک پھیلے ہوئے صحرا میں عقائد فاسدہ کا قد آور نمائندہ۔ اس نے احد میں پوری ترتیب اور پوری تنظیم کے سامنے مسلمانوں کو آنے پر مجبور کر دیا۔ اب کے وہ جنگ کی پوری چالیں بروئے کار لایا تھا۔ خود مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کا جال میدان داری سے قبل بچھا دیا تھا جو ہمتیں پست کرنے میں کارگر ثابت ہوا اور پھر بھی شکست نہ ہوئی تو قتل رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جھوٹا آوازہ بلند کرا کے خریدے ہوئے منافقوں کا فرار عمل میں لایا، اور اسلام کی فتح شکست میں بدل دی۔

اس جنگ سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کچھ مشکل نہیں ہے کہ مسلمانوں میں منافقوں کی شمولیت جنگ

بدر کے بعد شروع ہوئی اور پھر بتدریج بڑھتی رہی۔۔۔یہیں سے یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ فتح بدر مملکت اسلامیہ کا نقطہ آغاز تھی۔

احد نے قدرے مایوسی کے حالات ضرور پیدا کر دیئے تھے تاہم اہل اسلام اپنے معجز نما قائد کی رہبری میں ایک مدافعتی طاقت بن کر پیغمبر عرب اسلام کی صداقت کا پیغام دوسروں تک پہنچاتے رہے اور چھوٹے بڑے سریات کی کامیابی اس کی ضمانت بنتی رہی۔ جس کے نتیجے میں اسلام کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا رہا۔

وہ لوگ جنہوں نے مکے میں اسلام کی اٹھان دیکھی تھی اور اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لہولہان پایا تھا، وہ آج انہیں مجاہدوں کے لشکر کا سپاہ سالار دیکھتے تو ان میں سے بعض کے دلوں میں یہ خیال ضرور پیدا ہوتا ہوگا کہ عرب کا پیغمبر کسی بڑی حکومت کا فرمانروا بننے والا ہے اور اسی مقام سے ہادی مطلق کی شخصیت دو حیثیتوں میں بدلتی نظر آتی ہے :- ایک پیغمبر کی اور دوسری اس حکمران کی جس کے ہاتھوں میں سلطنت عرب کی باگ ڈور آنے والی تھی۔

اس کے بعد خندق اور خیبر کی جنگوں میں اسلام کی فتوحات اس خیال پر مہر توثیق ثبت کر دیتی ہیں۔تب ہی تو فتح مکہ کے وقت ابوسفیان نے حضرت عباس سے کہا تھا:-

''عباس! تمہارے بھتیجے کی بادشاہت بہت عظیم ہوگئی ہے!''

ابوسفیان عرب کے دور جاہلیت کا ترجمان تھا اور بدترین دشمن کی حیثیت سے اس نے حلقہ اسلام کا سیاہ وسفید بھی دیکھا تھا لہذا اس کے الفاظ کو اگر بعض دوسروں کی آوازوں سے تعبیر کیا جائے تو بعید از قیاس نہ ہوگا البتہ ابھی کسی کا نام لیا نہ جا سکتا۔۔۔جن کو مستقبل نے ابوسفیان کا ہم آواز ثابت کر دیا۔

جنگ خیبر میں حضرت عمر نے کہا تھا۔

''آج سے زیادہ علم پانے کا ارمان کبھی میرے دل میں پیدا نہ ہوا تھا''۔

لشکر اسلام کی سربراہی کی تمنا کچھ غلط نہ تھی کیونکہ مخبر صادق نے فتح کی پیشن گوئی کر دی تھی اور اس دن بعد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سرخروی کا اعزاز اس کو ملنے والا تھا جس کے ہاتھوں قلعہ خیبر کی تسخیر ہوتی۔ یہ جذبہ ہر لحاظ سے مستحسن تھا اور شخصیت پیغمبر کی موجودگی میں وقتی قیادت کی آرزو کو دل کے کھوٹ سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا تاہم ایک بات یہ ضرور ثابت ہوتی ہے کہ اسی محاذ پر دوبار شکست یاب ہونے کے بعد بھی بعض افراد کے دلوں میں ایک تمنا چھپی ہوئی تھی کہ وہ ہر بار مظفر و منصور ہونے والے کی

جگہ لے سکتے۔

یقیناً اس کو معاصرانہ چشمک بھی کہا جا سکتا ہے اور رشک و حسد بھی۔ پھر بعض دوسرے مواقع پر علیؑ کی برتری پر ناپسندیدگی کا اظہار چند بزرگوں کی طرف سے اس حقیقت کو آئینہ کر دیتا ہے کہ وہ آنحضرت کے بعد اپنی افضلیت کے دعویدار تھے۔

اس موضوع پر میری گزشتہ تصنیف ''سیاست نامہ عرب'' میں سیر حاصل بحث کی جا چکی ہے اور علی دشمنی کے پس منظر میں یہ نتیجہ اخذ کیا جا چکا ہے کہ رسول اسلام کی نیابت کے نام پر فرمانروائے عرب کی جانشینی کا منصوبہ بہت پہلے بنایا جا چکا تھا وقت آنے پر اس کو بروئے کار لے آیا گیا اور اس کو برحق ثابت کرنے کے لئے اسلام کے گلے پر چھری پھیر دی گئی۔

ضروری تھا کہ حصول مقصد کے لئے اسلام کے ڈھانچے میں اتنی ترمیم و تنسیخ کر لی جائے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانشینی اس ذات واحد کے لئے مختص نہ رہے جس کا نام روز ازل سے جبین اسلام پر لکھ دیا گیا تھا لہٰذا اسلام کے اصول اور ہادی اسلام کی شخصیت دونوں میں تخلیقی روایات سے لچک پیدا کر دی گئی اور صحرا کی تمدنی روایات کو اسلام کا نام دے دیا گیا۔

افضل المرسلین کا نور کائنات سے ہزاروں سال پہلے خلق ہوا تھا دنیا نے آپ کو اپنا جیسا انسان بنا لیا اور ہادیانہ وجود کو مشتبہ کر دیا کہ کبھی عام آدمی کی طرح اور کبھی منصب پیغمبری سے کلام کرتے تھے۔ کیا پیغمبر کی حیثیت سے کہا اور کیا انسانی سطح سے؟ ہر بات میں تیقن کو متزلزل کر دیا گیا۔

ان خصوصیات کے پیغمبر کی جگہ لینے کے لئے صاحب عصمت ہونے کی قید باقی نہ رہی تو بعد وفات میت کو چھوڑ کر اسلام کے نام پر سربراہ عرب کی جانشینی کا التزام کر لیا گیا اور سقیفہ بنی ساعدہ میں خلافت کی دستار باندھ کر نئے بادشاہ کو چن لیا گیا۔ ان حقائق کو تاریخ نے مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے دیکھا ہے۔

حکومت میں باپ کے بعد بیٹا اس کی جگہ لیتا ہے لہٰذا اس مقام پر تخت سلطنت کو مسند پیغمبری سے تعبیر کر دیا گیا اور ایک من گھڑت روایت بیان کر دی گئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہا تھا ہم انبیاء اپنی میراث نہیں چھوڑتے۔ جو کچھ ہوتا ہے، وہ قوم کا حق قرار پاتا ہے۔ اس طرح صحرائی سیاست کی بساط پر ایک تیر سے دو شکار کئے گئے :- رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصل وارثوں کی جانشینی سے محرومی اور ان کی اقتصادیات پر ایک ضرب کاری تاکہ فلاکت و ابتلاء کی مسلسل آزمائش میں وہ اس قابل نہ رہیں کہ اپنے حقوق کا آوازہ بلند کر سکیں۔

شاطران سیاست کا خاکہ ایک طویل بحث کا محتاج ہے۔ یہاں تو صرف یہ عرض کرنا ہے کہ عرب کے تاریخ سازوں نے اپنی وضعی تاریخ کا تانا بانا ذہنی طور پر پہلے سے تیار کر رکھا تھا جن پر عمل درآمد نجات دہندہ کی علالت سے شروع کیا اور آنکھیں بند ہوتے ہی ہادیانہ قیادت کو روایت سازی کے جال میں جکڑ لیا جس کے بعد اسلام کے نام پر ملک گیری کا ایک دستور العمل مرتب ہو گیا جو آج بھی دین محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ پھر اس میں اضافے ہوتے رہے حتیٰ کہ جنگ صفین کی شکست کے بعد ابوسفیان کے بیٹے نے قرآن کو سیاسی حربہ بنا کر نیزوں پر بلند کر دیا اور زر خرید حکمین کے ہاتھوں شکست کو فتح میں بدل لیا۔

مسجد کوفہ میں رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے جانشین ازلی کی شہادت ملک گیری کی سازش کا فیصلہ کن وار تھا جس کے بعد امام حسنؑ کی خلافت سے دست برداری بساط پیغمبری کا ناگزیر تقاضا!

اب اسلام کی عنان حکومت سقیفہ بنی ساعدہ سے براہ راست اس منزل پر آ گئی تھی جس کا اعلان ابوسفیان نے حسینؑ کو قبر رسول پر لے جا کر کیا تھا اور خلافت عثمانؓ کے آغاز پر کہا تھا۔

''محمدؐ! عرب کی حکومت ہمارا حق تھی، ہم نے لے لی۔ دیکھو، ہمارے بچے خلافت سے کھیل رہے ہیں!''۔

خلافت سازی میں ابوسفیان کا کیا کردار تھا؟ اس کو تاریخ نے کھل کر بیان نہیں کیا کیونکہ وہ اسلام دشمنی میں اتنا بدنام ہو چکا تھا کہ اس کا نام منظر عام پر آتا تو سیدھے سادے مسلمان بھڑک اٹھتے اس لئے اس کی جگہ اس کے بیٹے نے لے لی اور شام کی امارت میں پہلے اپنے پنجے بڑی مضبوطی سے بساط اسلام پر گڑ دئے پھر دین محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے حقیقی محافظ کو راستے سے ہٹا کر اور خلافت کو پابہ زنجیر کر کے دمشق لے آیا۔

یہ تھا ابوسفیان کا خواب جو اس کے بیٹے معاویہ نے پورا کیا۔

اسلام کو ریگزار عرب کے مزاج میں ڈھالنے کی ابتداء بلاشبہ مسلمانوں کی بزرگ ترین شخصیت نے کی تھی اور رسول عرب کے حقیقی ورثاء کو محروم کرنے کے لئے یہ حدیث بیان فرمائی تھی کہ انبیاء اپنی وراثت نہیں چھوڑتے حالانکہ اس کے بارے میں خود انہیں کے جانشین نے یہ کہا تھا کہ ابوبکر سے پہلے یہ حدیث انہوں نے کسی کی زبان سے نہیں سنی۔

اس طرح حدیث سازی کے آغاز کا شرف یقیناً مسلمانوں کے پہلے خلیفہ کو حاصل ہے۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ اور دوسرے لوگوں نے ایسے اعزاز حاصل کیے پھر تصانیف احادیث اور اسلام سازی

مسلمانوں کا وطیرہ بن گئی اور ملک گیری جہاد کے نام پر داخل اسلام ہوگئی۔

قرآن مجید پتھروں اور کھالوں پر لکھا جا چکا تھا لیکن احادیث ابھی حافظوں کی زینت تھیں، جس میں کچھ اضافے ابتدائی ادوارِ خلافت میں ضرور ہوئے پھر بھی جب متاع مدینہ دمشق کے خزانے میں پہنچی تو تعداد کے اعتبار سے بہت حقیر تھی۔ صنادید عرب کے آخری نمائندے کا بیٹا اس تقلیل کو برداشت نہ کرسکا۔ اس نے طباع اور ذہین حفاظ کو دین کی اس اہم خدمت پر لگا دیا حتیٰ کہ دمشق کا خزانہ احادیث کے انبار سے ابلنے لگا پھر اس سے مرتبین احادیث نے اپنے مجموعے تیار کئے جو صحیحین کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔

ان کے لئے مرتبین پر اتنا ہی جرم عائد کیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے حکومت کے حدیث ساز ادارے پر پورا اعتبار کیا جس کی تصانیف بازار میں ماری ماری پھر رہی تھیں۔ تحقیق کی زحمت کم کی اور یہ نہیں سوچا کہ باہر والوں کی بات سند اعتبار دینے کے لائق نہیں ہوتی، گھر والوں سے پوچھ لیا جائے کہ واقعی رسولِ اسلام نے کیا کہا تھا اور کیا نہیں کہا؟

شام و عراق تاریخ کی روشنی میں

شام و عراق، مصر و سندھ کی طرح تمدن انسانی کی بساط اول تھے جس پر سامری، نینوائی اور آشوری تہذیبیں پروان چڑھیں پھر انبیاء و مرسلین نے خود شناسی اور خدا شناسی کی روشنی پھیلائی۔ حضرت موسیٰ نے اس کو مصر سے ہم آہنگ کر کے اس کا دامن سرزمین عرب تک پھیلا دیا اور حضرت سلیمانؑ نے اپنے دور حکومت میں یمن کی ملکہ سبا سے ایک رشتہ قائم کر لیا۔ یہاں تک کہ یونان اور روم کی سلطنتیں وجود میں آئیں اور حضرت عیسیٰ کی نبوت کا آغاز ہوا جو قیام سلطنت روم کا ابتدائی زمانہ تھا۔

پانچویں صدی کے شروع میں، مغربی یورپ میں جداگانہ اور خود مختار سلطنتیں نہیں تھیں۔ انگلستان، فرانس، اسپین اور اٹلی جس زمین پر آباد ہیں۔ اس وسیع سلطنت کا صرف ایک جزو تھی جو رومیوں کے شہنشاہ اور اس کے کثیر التعداد افسروں کے زیر نگیں تھی۔ جرمنی اس وقت تک جنگلات کا ملک تھا جس کو صرف وحشی اور نیم وحشی فرقے، جو اس میں آباد تھے جانتے تھے۔

''سلطنت روما میں، جو جنوبی اور مغربی یورپ، مغربی ایشیاء نیز شمالی حصہ افریقہ پر مشتمل تھی، بے حد مختلف قومیں اور نسلیں آباد تھیں۔ مصری، عرب، یہود، یونانی، جرمن، گال، اہل برطانیہ اور اہل اسپین و اہل پرتگال، سب کے سب روما کے زیر فرمان تھے''۔ (۱)

شام کی تاریخ کو بالاختصار چند لفظوں میں بیان کیا جائے تو ''اسرائیلی دور کے بعد شام و عراق پر ایران کا اقتدار تھا لیکن دارا کی شکست کے بعد یونان نے اس پر قبضہ کر لیا۔ اور ۶۹ (ق م) میں مقامی حکمران مہرداد سے پورے علاقے کو چھین لیا۔ آخر ۴۰ (ق م) میں ہیروڈ شام کا حاکم مقرر ہوا جو تاریخ میں ہیروڈ اعظم کہلاتا ہے۔ اس نے رومی حکومت کو مضبوط کیا، سبسط اور قیاریہ دو شہر آباد کئے اور متعدد عمارتیں تعمیر کرائیں جن میں بیت المقدس کی عمارت بھی شامل تھی''۔

''پھر تقریباً پچاس سال بعد اسی مقام پر، جہاں یروشلم آباد تھا، ایک نیا شہر ایلیا آباد کیا، وہاں رومی دیوتا اور دیویوں کے مندر تعمیر کرائے اور یہودیوں کے داخلے کو قطعاً روک دیا۔

ہارڈرین کی موت سے تقریباً دوسو اسی سال بعد ۳۲۴ء میں رومی سلطنت دو حصوں، مشرقی رومی حکومت اور مغربی رومی حکومت میں تقسیم ہوئی۔ مشرقی رومی حکومت کا، جسے بازنطینی حکومت بھی کہتے ہیں، دارالحکومت قسطنطنیہ قرار پایا اور قسطنطین اعظم، جس نے عیسائی مذہب قبول کرلیا تھا، اس کا پہلا فرمانروا ہوا۔ اس نے ۳۲۵ء میں ایلیا (سابق یروشلم) کو عیسائیت کا مرکز بنایا اور اس کی تبلیغ کی کوشش شروع کی۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصے میں ملک شام کی اکثریت نے اس مذہب کو قبول کرلیا''۔ (۲)

شام کی آبادی سامی النسل یونانیوں، فلسطینیوں اور اسرائیلیوں پر مشتمل تھی اور شام اپنے محل وقوع کے اعتبار سے ایک بین الاقوامی گزرگاہ تھا۔ اسی لئے اس کا تعلق عرب سے براہ راست رہا اور مغربی عرب سے اس کی تجارت بحرمیت کے ذریعے ہوتی تھی۔ شمال مغرب سے ایک راستہ ایشیائے کوچک کو جاتا تھا، شمال مشرق سے کردستان، ایران اور مغربی ایشیا تک ایک تجارتی شاہراہ تھی۔ یہی تجارتی راستے اس کی سیاسی تاریخ میں ردوبدل کا باعث ہوئے۔ ہمسایہ اقوام اپنی طاقت کے بل پر اس کی دولت کو لوٹتی رہیں اور نوک شمشیر سے اس کی بساط پر اقتدار کی تاریخ لکھتی رہیں۔

تفصیلات کو نظر انداز کر کے ایک سطحی تاریخی جائزے میں دو ہزار سال قبل مسیح میں شام ایک سامی النسل سرزمین تھی جو مصر عراق اور ایشیائے کوچک سے مربوط تھی۔ اس کی تمدنی بساط پر اشوریوں، مصریوں، ایرانیوں اور یونانیوں کی معاشرتی تہذیب کے نقش و نگار پائے جاتے تھے۔ پھر اس کو رومیوں نے یونانیوں سے چھین لیا اور انھوں نے اس کے تمدن پر اپنے اثرات مترتب کئے۔

یوں تو شام کی سیاسی تاریخ دنیا کے دوسرے حصوں کی طرح تلواروں کی دھاروں پر چلتی رہی لیکن حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے پانچ چھ سو سال قبل کا زمانہ کافی انقلاب آفریں تھا مگر روم کی طاقت ہر بار غالب آتی رہی۔ یہاں تک کہ بیت لحم میں پیغمبر عرب کا پیش رو عالم وجود میں آیا جو جور و ستم کے سایے میں پروان چڑھ کر اور صلیب پر سربلند ہو کر عدم تشدد کا نعرہ لگاتے لگاتے خاموش ہو گیا۔

تاریخ انبیاء کا یہ عظیم سلسلہ پانچ سو ستر سال تک پرامید نگاہوں سے کرہ ارض کے اس مرکزی نقطے کی طرف دیکھتا رہا جہاں سے رسالت کا آخری آفتاب طلوع ہونے والا تھا۔ آخر نوشیرواں عادل کی حکومت کے بیالیسویں سال سیکڑوں برس سے جلتا ہوا فارس کا آتش کدہ اچانک گل ہو گیا اور رئیس مکہ

عبدالمطلب کے گھر کے درودیوار آسمانی شعاعوں سے جگمگا اٹھے۔

عبداللہؓ کے یتیم بچے کی ولادت نے شام کے چاہ بابل پر فی الوقت کسی ماہتاب کو روشن نہیں کیا لیکن ایک صدی گزرتے گزرتے حکومت روم کی بنیادیں ہلا ڈالیں جس کی ذمہ داری خود فرمانروائی کے زعم باطل پر عاید ہوتی ہے۔ شرجیل غسانی والی شام نے آنحضرتؐ کے قاصد، حارث بن عمیر کو قتل کرا دیا تھا اور اس کے جرم کی سزا اس کو ملنا چاہئے تھی۔ جنگ موتہ صحیح معنی میں مستقبل کی فتوحات کا نقطہ آغاز تھی جس میں مسلمانوں کو شکست ہوئی اور زیدؓ بن حارثہ، جعفر طیارؓ اور عبداللہؓ بن رواحہ شہید ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسامہ بن زید کی سرکردگی میں دوسرا لشکر بھیجنے کا التزام کیا۔ یہ لشکر آنحضرت کا وقت آخر آ جانے کے باعث اور بعض سازشوں کی وجہ سے نہ جا سکا۔ حضرت ابوبکرؓ نے تخت خلافت پر متمکن ہونے کے بعد اس کو روانہ کیا پھر جنگ کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا جس کے دامن میں خالد بن ولید کی تلوار چلتی رہی، فتوحات کا سیلاب آگے بڑھتا رہا یہاں تک کہ ابوبکرؓ کا ڈھائی سالہ دور ختم ہو گیا اور زمام خلافت حضرت عمرؓ کے ہاتھ میں آ گئی۔

۱۴ھ میں مسلمانوں کے سیف اللہ حضرت عمرؓ سے پرانی دشمنی کی بنا پر معزول ہو گئے۔ ان کی جگہ ابوعبیدہ، مثنیٰ اور عمر عاص نے لے لی اور انہوں نے سکندر اعظم کی یاد تازہ کر دی۔ فتوحات کا جو سیلاب حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں آگے بڑھا تھا، حضرت عمرؓ کی تیز مزاجی کی طرح اس میں سرعت پیدا ہو گئی اور یزید بن ابوسفیان کے بعد معاویہ بن ابی سفیان شام کے حاکم بنا دیئے گئے۔

یہ ہے آغاز اس تاریخ کا جس کو سیاست نامہ شام کی بساط اول قرار دیا جا سکتا ہے۔

اسلام میں منافقت

ہادیانہ نظام حکومت کے سلسلے میں پہلا نام حضرت یوسف کا آتا ہے پھر حضرت داؤد اور جناب سلیمان کا۔ حضرت سلیمان کی سلطنت عظیم اور باجبروت تھی، شام و فلسطین بھی آپ کے زیر نگیں تھے۔ کوئی ڈیڑھ ہزار سال بعد اس سرزمین پر ختم المرسلین کی حکومت قائم ہوئی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام نہاد خلیفہ نے شام میں دمشق کو اپنا دارالخلافہ بنایا۔

عقیدے کی روشنی میں حضور تمام انبیاء سے برتر تھے لہٰذا جناب سلیمان سے آپ کے جانشین کا توازن و تقابل کیا جاسکتا تھا، بشرطیکہ وہ جانشین منصوص من اللہ ہوتا لیکن یہ بدنصیبی ہے امت مسلمہ کی کہ جانشین پیغمبر، مملکت اسلامیہ کے لئے مسلمانوں نے خود منتخب کیا، پیغمبر عرب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا خالق کونین کے متعینہ جانشین کو نظر انداز کر دیا اس لئے قائمقام پیغمبر کا نام ایک اولوالعزم نبی کے ساتھ نہیں لیا جاسکتا۔

سلسلہ خلافت کو دیکھا جائے تو حضرت ابوبکرؓ کو تو نمائندہ یا غیر نمائندہ جماعت نے کسی نہ کسی طرح منتخب کیا تھا لیکن اس کے بعد حضرت عمر کو ابوبکرؓ نے نامزد کر دیا اور حضرت عثمان بھی ایک قسم کی نامزدگی ہی سے خلیفہ بنے پھر حضرت علیؑ کو عوام نے مجبور کر کے خلیفہ بنایا لیکن معاویہ بن ابی سفیان نے تو پہلے علیؑ کو مسجد کوفہ میں شہید کرایا پھر امام حسنؑ کو بجبر دست بردار کرا کے خلافت حاصل کی۔ اس میں انسانی جانوں کی قربانی بھی لی گئی اور تاج و تخت پر قبضہ کرنے کے ہر طریقے کو بھی استعمال کیا گیا۔

یہ صورت حال بعد نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی رونما ہوتی، اگر علیؑ نے سقیفہ بنی ساعدہ کی سازش پر اپنے حق کے لئے تلوار بے نیام کر لی ہوتی مگر خلافت الٰہیہ خدا کی دین ہوتی ہے، بزور بازو حاصل کرنے کی چیز نہیں۔ افسوسناک حقیقت تو یہ ہے کہ اس منصب کے لئے انسان کے اہل اور نا اہل

ہونے کا امتیاز بھی نہیں کیا گیا۔ پیغمبرؐ عرب کی جانشینی کے لئے انتخاب کا جو ڈھونگ رچایا گیا اس کے نتیجے میں دو نظریے کھل کر سامنے آ گئے کہ کس نے پیغمبرؐ کو انسان کا نجات دہندہ سمجھا اور کس نے عرب کا فرمانروا؟

مانا پڑتا ہے کہ ایک کھلے کردار کا آدمی تھا صنادید عرب کا آخری نمائندہ کہ فتح مکہ کے دن اس نے حضرت عباس سے جو کچھ کہا تھا وہ اس کے دل کی آواز تھی ''تمہارے بھتیجے کی بادشاہت تو بہت عظیم ہوگئی ہے''؟ یہ تصور مستقبل میں اس کی نسلی وراثت بن گیا اور کئی پشتوں تک کوئی اس راستے سے نہ ہٹا۔ اسی کے ساتھ ساتھ ابوسفیان نے اسلام کا جو نقاب اپنے چہرے پر ڈال لیا تھا، وہ بھی اسی طرح وارثوں کے چہروں پر پڑا رہا۔

اس مسلک میں کفر پرست عمائدین مکہ کی اولاد ہمیشہ اس کے ساتھ رہی جن کی سربراہی میں کچھ لوگ وہ بھی تھے جن کا جادہ منافقت قدرے مختلف تھا مگر نصب العین میں پوری ہم آہنگی تھی۔ اس کی تفاصیل پچھلی کتاب میں پیش کی جا چکی ہیں۔ پیش نظر پہلے دن سے شاہ عرب کا تخت تھا جس کا حصول آتنا آسان نہ تھا کیونکہ وہ نبوت کے سجادے پر رکھا ہوا تھا اور اس پر بیٹھنے کے لئے خلقی صلاحیت اور مشیت الٰہی درکار تھی جو نہ ان میں سے کسی میں تھی اور نہ کوئی حکم خداوندی منگوا لینے پر قادر تھا لہٰذا ضرورت اس کی تھی کہ ایسی تمام قیود کا بطلان کر دیا جائے اس لئے وضعی احادیث کا سہارا لیا گیا جن کے ذریعے پیغمبر کی سیرت میں ایسی تبدیلیاں کر دی گئیں کہ کوئی بھی صحرائی عرب جانشینی کا دعویٰ کر سکتا!

خود اہل نہ بن سکتے منصب پہ ہدایت کے
اپنا سا بنا ڈالا لوگوں نے پیمبر کو

اس کارگزاری میں ابوسفیان یا اولاد ابوسفیان کا ہاتھ نظر نہیں آتا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اہالیان مکہ کے نزدیک اسلام دشمنی میں سرفہرست رہا تھا لہٰذا سازشوں کے تانے بانے میں وہ الگ تھلگ رہا، خفیہ خفیہ ڈور ہلاتا رہا۔ انجام کار ہوا ویسا ہی جو کچھ وہ چاہتا تھا۔

شروع کی دو خلافتوں میں ابوسفیان منظر عام پر دکھائی نہیں دیتا اور اس کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ اس کے نمائندے وہی سب کچھ کر رہے تھے جو زائد سے زائد وہ کر سکتا لیکن جب حضرت عمرؓ کے منشائے وصیت کے مطابق حضرت علیؑ نے سیرت شیخین پر عمل کرنے سے انکار کر دیا اور تخت خلافت پر حضرت عثمانؓ متمکن ہو گئے تو ابوسفیان نے ایک بار پھر نعرہ لگایا ''ہاشمیو! دیکھ لو، حکومت ہمارا حق تھی، ہم نے لے لی''!

بنی امیہ کے اس دور میں اولادِ فاطمہ پر تشدد اور محرومیوں کے دروازے بدستور کھلے رہے اور توقع بھی اسی کی تھی لیکن حضرت عثمانؓ نے حکم رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اپنے پیش رو خلفاء کی روش کے خلاف اقربا پروری کے جو کارنامے انجام دیئے، انہیں شاید ان لوگوں نے بھی روا نہ رکھا ہوگا جن کی بدولت وہ خلیفہ ہوئے تھے۔

داد دہش سے لوگوں کو ہمنوا تو خلفائے اولین نے بھی بنایا تھا مگر عثمانؓ نے بیت المال کے دروازے بنی امیہ کے لئے کھول دیئے۔ اپنے چچا ابوسفیان کو دو لاکھ درہم عنایت فرمائے، حارث ابن حکم کو تین لاکھ اور عبداللہ بن خالد کو دو لاکھ درہم عطا کئے اور چھوٹی چھوٹی رقوم کے عطیات تو گنوانا ہی فضول ہے، آخر کس خوشی میں؟ صرف اس لئے کہ ان سے قریب و دور کی قرابت تھی۔ اس کی تصدیق تو انصاف پسند عقیدت مندوں نے بھی کی ہے اور بعض اقدامات تو ایسے ہیں کہ وہ ختمی مرتبت سے بغاوت کی تعریف میں آسکتے ہیں۔

حکم بن عاص دشمن رسول تھا۔ حضور نے اس کو مدینے سے خارج البلد کر کے طائف بھجوا دیا تھا۔ حضرت عثمان نے اس کو واپس بلا کر محصل زکواۃ بنا دیا۔ جلا وطن کیا کس کو؟ حضرت ابوذر غفاری کو، ایک بے آب و گیاہ ریگستان کی طرف جہاں عالم غربت میں ان کا انتقال ہوگیا۔ انہی ابوذر کے لئے رسول نے صادق القول ہونے کی سند دی تھی۔

مروان بن حکم چچیرا بھائی تھا حضرت عثمانؓ کا۔ اس کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حکم تھا کہ مدینے سے ایک فرسخ کے اندر نظر آئے تو اس کا خون مباح ہوگا۔ حضرت عثمانؓ نے اس کو طلب کر کے اپنا داماد بنالیا پھر مشیر خاص مقرر کر دیا اور باغ فدک جس کو حضرت ابوبکرؓ نے بنت رسولؐ سے چھین کر جمیع مسلمین کی ملکیت قرار دیا تھا وہ بھی مروان بن حکم کو دے دیا۔ جو حکم رسول کے خلاف تھا اور سیرت شیخین کے برعکس۔ جبکہ خلیفہ بننے کے لئے سیرت شیخین پر عمل کرنے کا وعدہ حضرت عثمانؓ نے کیا تھا۔

عبداللہ بن سرح کا قتل بروز فتح مکہ آنحضرت نے مباح کر دیا تھا۔ حضرت عثمان نے اس کو حاکم بنا دیا۔ ایسی اور بھی نظیریں ہیں جن کو بخاری کی مبینہ احادیث کی روشنی میں دیکھا جائے تو اہل نظر کے لئے قابل عبرت ہوگا۔

"جس نے میری نافرمانی کی، اس نے خدا کی نافرمانی کی"۔۔۔

"جس نے وہ عمل کیا جس کی میں نے ہدایت نہ کی ہو، وہ جہنمی ہے"۔۔۔

اور رسول کے اصحاب کبار پر ظلم وستم کی داستانیں تو دامن خلافت پر ایسے داغ ہیں جو قلم کی روشنائی گرداینے سے چھپ نہیں سکتے۔ عامر ابن قیس، عبداللہ ابن عامر اور عمار یاسر جیسے برگزیدہ صحابیوں سے جو سلوک روا رکھا گیا، اس کا جواز کسی بھی مورخ کا قلم پیدا نہ کر سکا۔

اس طویل دور حکومت کے بعد حضرت علی کی خلافت اثرات ماسبق کے خمیازے کو بھگتانے میں گزر گئی اور ابوسفیان کے کردار وعمل کی پرچھائیاں اس پر پڑتی رہیں جن کا مداوا مسلمانوں کا خلیفہ چہارم مسجد کوفہ میں اپنا خون دے کر بھی نہ کر سکا۔

آنحضرت کو تبلیغ اسلام کے لئے پرسکون ماحول درکار تھا لیکن حلقہ کفر کی یلغار نے عرب کے ایک حصے پر چھوٹی سی حکومت کی شکل پیدا کر دی تھی جو اسلام دشمنی کے سبب خود بخود پھیلتی رہی اور آپ کی وفات کے وقت اس کی حدود تقریباً پورے عرب کا احاطہ کر رہی تھیں اور یہی وسعت، روشنی طبع بن کر روح اسلام کے لئے کسی بلا کی تعریف میں آ گئی۔

عربوں کا بگڑا ہوا ذہن صراط مستقیم پر ڈانوا ڈول ہونے لگا اور وہ تلوار جو صرف تحفظ اسلام کے لئے اٹھی تھی ملک گیری کی شاہراہ پر چلنے لگی۔

حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں اسامہ بن زید کی فتح سے اس کا آغاز ہوا۔ یہ جنگ یقیناً اسلام کے لئے لڑی گئی تھی اور روم کے عامل شام سے جنگ موتہ کے شہیدوں کا خون بہا وصول کرنا جس کا مقصد تھا۔ نتیجے میں اشاعت دین کے لئے مملکت شام کا ایک حصہ مل گیا پھر خالد بن ولید کی تلوار اس سرزمین پر بے نیام ہوئی تو چمکتی ہی رہی، جس طرح فتح مکہ کے وقت قبیلہ بنی حذیمہ پر چمکی تھی اور خود حضرت ابوبکرؓ کے ابتدائی دور میں حاکم بطاح مالک بن نویرہ کے قبیلے پر چلی تھی، خالد نے زکواۃ کے طور پر مالک شہید کی بیوی ام تمیم سے نکاح کے نام پر زنا بھی فرمایا۔ کہا جاتا ہے کہ فتح مکہ کے وقت ان کی غلطی کو پروردگار نے معاف کر دیا تھا۔ کیسے معلوم ہوا؟ یہ آج تک بتایا نہیں گیا۔ البتہ زنا کو حضرت ابوبکرؓ نے ضرور معاف کر دیا جس کی شہادت حضرت عمرؓ دیتے ہیں۔ انہوں نے خالد سے پرانی دشمنی کی بنا پر حد جاری کرنے کو کہا تھا مگر جاری نہیں کی گئی۔

پھر خالد سے شام و ایران کی فوجوں کے معرکے شروع ہو گئے جو جاری رہے اور حضرت عمر کے عہد میں نتیجہ خیز ثابت ہوئے۔ شام کی مکمل فتح پر یزید بن ابی سفیان کو حاکم بنایا گیا۔ پھر معاویہ بن ابی سفیان نے ان کی جگہ لے لی۔ حضرت علی کا دور خلافت شروع ہونے پر معاویہ ہی شام کے والی تھے۔

معمولات انبیاء میں اصول رہا ہے کہ کسی صاحب شریعت کے بعد جو نبی آتا ہے وہ شارع ماسبق کی تعلیمات کی اشاعت کرتا ہے۔ یہی اس کا فرض منصب ہوتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سلسلہ مرسلین کی آخری کڑی تھے جن کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں تھا لہٰذا مشیت الٰہی میں بارہ امام منصوص ہوئے تھے جس کو ایک گروہ مسلمین نے نہیں مانا اور خود اپنی خلافت کے قیام کا منصوبہ بنالیا۔

یہ خلافت اپنے منصب کے لحاظ سے نظم و نسق مملکت کے لئے تھی اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانشینی کے نام سے قائم ہوئی تھی لہٰذا اشاعت اسلام بھی اس کی ذمہ داری تھی۔ اس فرض کو پورا کرنے میں وہ ناکام رہی۔ ستم ظریفی یہ ہوئی کہ نام تھا اسلام کا لیکن عملی طور پر اس میں رسم و رواج صحرا اور حکمران کا ذہنی رجحان بھی شامل ہو گیا اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات دین و دنیا کا آمیزہ بن کر رہ گئیں۔

خود نبی برحق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تیئیس سال میں اپنے دین کے جو اصول تعلیم کیے تھے، پچیس سال کی سہ حرفی خلافت میں اس کا ڈھانچہ ہی بدل چکا تھا اور اتنی ترمیم و تنسیخ ہو چکی تھی کہ خالص اسلام عام مسلمانوں کے سامنے رکھا گیا۔ تو اس سے انھوں نے بڑی اجنبیت محسوس کی۔

بات صرف داخل بیت اور خارج بیت کی نہ تھی بلکہ اصول دین میں تبدیلی کی بھی تھی۔ نماز، روزہ، امر و نہی، مستحبات و ممنوعات ہر بات میں کافی ردوبدل ہو چکا تھا۔ اکثر باتیں جو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حلال و جائز کی تھیں، حرام و ناجائز قرار دی جا چکی تھیں۔ کئی عمل جو آنحضرت صلی اللہ عیہ وآلہ وسلم کے وقت میں نہیں کئے جاتے تھے، انہیں داخل اسلام کر لیا گیا تھا۔

تفصیلات میں جانے کی گنجائش نہیں۔ چند کے نام مشتے از خروارے لکھے جاتے ہیں:۔

متعہ حرام قرار دیا گیا، حیّ علیٰ خیر العمل اذان سے نکلوا دیا گیا، تقیہ ناجائز ٹھہرایا گیا، طلاق کے لئے جبر و تشدد کو جائز ٹھہرایا گیا، تراویح کو بڑی شد و مد سے رمضان میں وجوب کا درجہ دیا گیا۔ اسی طرح کی اور بھی باتیں ہیں جو ارکان دین میں داخل کی گئیں حالانکہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا:۔

''دھوکا دینے والا جہنم میں ہے۔ جو کوئی ایسا کام کرے، جس کے لئے ہمارا حکم نہ ہو، وہ مردود ہے''۔ (۳)

یہ تبدیلیاں حضرت ابوبکرؓ کے وقت میں برائے نام، حضرت عمرؓ کے دور میں بہت زائد اور حضرت عثمانؓ کے عہد میں صرف کھنے کے لئے عمل میں آئیں۔۔۔ اور جب پایہ تخت خلافت مدینے سے دمشق منتقل ہوا تو نہ صرف ان پر مہر ثبات لگ گئی بلکہ ان کا جواز اس طرح پیدا کیا گیا کہ موجودہ تاریخ

اسلام مرتب ہو گئی گویا تاریخ ایران کا شاہنامہ تیار ہو گیا۔

رسول برحق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانشین ازلی کو پچھلے تجربات سے اکتا کر دوست و دشمن سب نے دعوت خلافت دی تھی۔ ان میں سے ایک بڑی تعداد اسلام کی اصل تصویر کو بھول چکی تھی۔ اس کے سامنے تو وہ تصویر تھی جس پر سن وسال کی ڈھائی دہائیوں تک رنگ آمیزی کی گئی تھی اور اس کے کچے رنگ امتداد وقت سے آہستہ آہستہ پکے ہوتے جا رہے تھے۔

ایک حلقہ ذہنوں کی خرید وفروخت کا عادی بھی ہو چکا تھا۔ خواص بیت المال کے کھلے ہوئے دروازوں میں داخلے کو اپنا حق سمجھتے تھے۔ عوام میں سے اکثر خلیفہ کے لئے رائے دہندگی کی قیمت پانے کے منتظر رہتے لیکن چوتھے دور میں ہر ایک کو اپنی توقعات میں مایوسی ہوئی۔ اسلام کی جو میزان عدل ان کے سامنے پیش کی گئی، وہ کسی کے وہم وخیال میں بھی نہیں تھی۔ نتیجے میں چند ہی روز بعد مخالفین کا حلقہ مضبوط سے مضبوط تر ہونے لگا۔

بلاشبہ حضرت علیؑ کو خلافت کی پیش کش اکثریت نے بے چارگی میں کی تھی کیونکہ تین خلافتوں کے باہمی تضاد نے عوام کے ذہنوں کو الجھا کر رکھ دیا تھا۔ مسائل شرعیہ کی مختلف تاویلیں داخل اسلام تھیں۔ برسر اقتدار طبقہ کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ دین محمدی کے اصول کا درجہ رکھتے تھے۔ ایسے میں علیؑ بھولا بسرا اسلام لے کر سامنے آئے تو مفاد ذاتی کو ٹھیس لگی اور مخالفت کی چنگاریاں دلوں سے پھوٹنے لگیں۔

عرب کے تیسرے شیخ کی خلافت حقیقتاً بنی امیہ کی حکمرانی کی اٹھان تھی جس کا ڈھانچہ تو اسلام کی بساط پر رکھا ہوا تھا لیکن اس کی اساس میں ابوسفیان کے دل و دماغ کی کارفرمائی تھی۔ ۳۰ھ میں ابوسفیان کا انتقال ہو گیا تب بھی اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی کیونکہ اب ابوسفیان کے ارشد تلامذہ میں بہت سے ابوسفیان پیدا ہو چکے تھے۔ جن میں مروان بن حکم سرفہرست تھا اور اسی کی ریشہ دوانی کے باعث بغاوت کی آگ کو ہوا ملی تھی۔

مخالفین میں ایک بڑی تعداد ان لوگوں کی تھی جو مظالم کا شکار ہوئے تھے، کچھ لوگ مفاد ذاتی کے سبب خلافت دشمن بن گئے تھے اور ایک حلقہ وہ تھا جو دل ہی دل میں امیدوار خلافت تھا۔ ان میں طلحہ و زبیر اور خلیفہ اول ودوم کی اولاد شامل تھی۔ انہی افراد کے ہاتھوں خلیفہ سوم کی جان گئی تھی۔

محمد بن ابی بکر کی دشمنی تاریخ سے ثابت ہے کہ مروان بن حکم نے ان کے قتل کی سازش کی تھی مگر انہوں نے حضرت عثمان کو قتل نہیں کیا، صرف توہین کی البتہ قرائن وشواہد سے طلحہ کا نام لیا جا سکتا ہے اور

محاصرے میں ملوث پورے افراد کا جائزہ لیا جائے اور حالات کو بنگاہ غائر دیکھا جائے تو طلحہ کے باہر نکلنے کے وقت مسلمانوں کے تیسرے خلیفہ راشد کا خون ہو چکا تھا جس کا الزام محمد بن ابی بکر پر رکھ دیا گیا کہ انہوں نے علیؑ کے اشارے پر عثمانؓ کو قتل کر دیا۔ اس طرح علیؑ کے خلاف بغاوت کا ایک جواز پیدا کر لیا گیا۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی نے حضرت عثمانؓ کی خوبیاں اور خرابیاں بیان کرتے ہوئے لکھا ہے :-

''ان کے خلاف شورش برپا ہوئی اور یہی نہیں کہ وہ خود شہید ہوئے بلکہ قبائلیت کی دبی ہوئی چنگاریاں پھر سلگ اٹھیں جن کا شعلہ خلافت راشدہ کے نظام کو پھونک کر رہا''۔ (۴)

تخت خلافت کو، تخت حکومت کی طرح مسلمانوں نے کبھی خالی نہیں چھوڑا تھا لہٰذا بڑی تیزی کے ساتھ امیدواران خلافت کی سرگرمیاں شروع ہو گئیں اور مختلف حلقوں میں مختلف لوگوں کے لئے رائے عامہ ہموار کی جانے لگی لیکن پچیس سال کی مدت میں اولاد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محرومی نے پتھروں کو وقتی طور پر موم کر دیا تھا یا شاید اہل کو چھوڑ کر نا اہل کو نوازنے کا سبق مل چکا تھا لہٰذا اب متفقہ طور پر علیؑ ابن ابی طالب کو منتخب کر لیا گیا۔ یہ انتخاب حقیقتاً بعد رسول پہلا جمہوری انتخاب تھا کیونکہ سقیفہ بنی ساعدہ کا اجتماع اہالیان مدینہ کے حلقے کی ہر نمائندگی پر مشتمل نہ تھا۔ وہاں تو صرف مہاجروں کا وہ گروہ تھا جس کو اطلاع دے کر بلایا گیا تھا یا انصار جو اطلاع پا کر آ گئے تھے، یا بعض بنی ہاشم۔

اس کا فیصلہ اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ مدینے کے بالغ مردوں کی تعداد معلوم کی جائے تو اندازہ ہو جائے گا کہ اس کے سامنے ساٹھ ستر یا زائد سے زائد سو آدمیوں کا کیا تناسب ہو سکتا ہے پھر طریقہ انتخاب کتنا عبرت ناک تھا کہ صحبت رسول کے تربیت یافتہ جب اپنا قائد منتخب کر رہے تھے تو دھینگا مشتی اور چیخ پکار میں ایک دوسرے کو دھکیل رہا تھا کہ بیمار سعد بن عبادہ کچلتے کچلتے نیم مردہ ہو گئے پھر بلند آواز حضرت عمر کی پکار پر حضرت ابوبکر نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا، ابوعبیدہ الجراح اور خالد بن ولید وغیرہ بیعت کرنے لگے۔ مہاجروں کے جو لوگ اس مقصد کے لئے آئے تھے۔ انہوں نے بیعت کی اور انصار قیس بن سعد کے ساتھ واپس چلے گئے۔

صحیح معنی میں تو مدینے والوں سے بیعت ان ساڑھے تین ہزار سواروں نے لی جن کو خالد بن ولید نے مسجد نبوی میں لا کر ٹھہرایا تھا۔ اہل مدینہ باری باری بلائے جاتے اور تلواروں کی چھاؤں میں ان سے بیعت لی جاتی۔

اس کے مقابلے میں علیؑ کے انتخاب کو دیکھا جائے تو لوگ بنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انتقال کے چوبیس سال بعد خانہ زہراؑ کے دروازے پر علیؑ کو گھیرے میں لئے ہوئے تھے، علیؑ معذرت کر رہے تھے اور خلقت متفق اللفظ ہو کر مصر تھی۔ آخر امام دین و دنیا نے بساط اسلام پر مسلمانوں کی قیادت قبول کر لی لیکن بگڑا ہوا مسلمان جس ڈگر پر پڑ چکا تھا اس پر علی تو علی، خود علی کے مرشد ازلی کو بھی قبول نہ کیا جاتا۔ شکوے شکایت کے دفتر کھلنے لگے اور انجام کار چند ہی روز میں دنیا داروں نے دین کے رہنما کا ساتھ چھوڑنا شروع کر دیا۔

معاویہ بن ابی سفیان کا علیؑ سے عناد نسلی و ذہنی اختلاف پر مبنی تھا۔ اس پر مستزاد یہ حقیقت تھی کہ علیؑ اموی خلافت کو روندتے ہوئے مسلمانوں کی قیادت تک پہنچے تھے۔ معاویہ کو یقین تھا کہ عثمانؓ بن عفان کے بعد تخت خلافت بنی امیہ کا حق ہوگا۔ عثمانؓ کے اچانک قتل پر ایک دھچکا لگا پھر جب انہیں یہ خبر پہنچی کہ علیؑ خلیفہ بن گئے تو وہ تلملا گئے اور انہوں نے بڑی تیزی کے ساتھ علیؑ کے قاتل عثمانؓ ہونے کا پروپیگنڈا شروع کر دیا اور ان کے جاسوس عراق و عرب میں یہ زہر پھیلانے لگے۔

ممکن ہے کہ انہوں نے ام المومنین عائشہؓ سے بھی کوئی رابطہ قائم کیا ہو حالانکہ ام المومنین خود عثمان کو خلافت کا ناسور سمجھتی تھیں اور ان کو راستے سے ہٹا دینے کے حق میں تھیں لیکن انہیں مکے میں علی کے خلیفہ بن جانے کی اطلاع ملی تو معاویہ سے زائد برہم ہو گئیں۔ علیؑ سے ان کی ناپسندیدگی کوئی ڈھکی چھپی نہ رہی۔ عثمانؓ کی جگہ کسی اور نے لی ہوتی تو شاید وہ غیر جانبدار رہتیں مگر علیؑ کو برداشت کرنا ان کے لئے ممکن نہ تھا۔

طلحہ و زبیر علیؑ سے ان کی نفرت کو جانتے تھے۔ حالانکہ دونوں علیؑ کی بیعت کرنے والوں کی صف اول میں تھے لیکن ان کے دلوں میں کھوٹ تھا۔ حضرت عائشہؓ کے بصرے کی طرف جانے کی خبر انہوں نے سنی تو خلیفہ بننے کی آرزو کروٹیں لینے لگی وہ بہانہ بنا کر مدینے سے نکلے اور ام المومنین سے جا ملے۔ پھر انہوں نے ام المومنین کو قتل عثمان کا بدلہ لینے پر اکسایا اور حضرت عائشہ ان کی شہ پر لشکر تیار کرنے لگیں جس میں شام کی پوری ہمت افزائی شامل تھی مسلمانوں کے چوتھے خلیفہ کے خلاف انتقام خون عثمانؓ لینے کے نام پر یہ پہلی بغاوت تھی۔۔۔!

باغیانِ خلافت

حضرت علیؑ کے دوستوں اور دشمنوں میں ایک سوال اکثر موضوع بحث بنتا رہتا ہے کہ آپ نے انتخاب سقیفہ کے بعد تلوار کیوں نہیں اٹھائی۔ دشمن تو یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ مسلمان آپ کے ساتھ تھے ہی نہیں، آپ اپنے حق کا مطالبہ کیا کرتے! دوست الٹا جواب دیتے ہیں۔ ان کا جی چاہتا ہے کہ کاش آپ اٹھ کھڑے ہوتے اور عرب کی بھیڑوں کو کاٹ کر رکھ دیتے۔ دوستوں کو معلوم ہے کہ ان میں کوئی ایسا مرد میدان میں نہیں تھا جو بنی ہاشم کے شیروں کا مقابلہ کرتا۔ دو چار نام جو لئے جاسکتے ہیں ان کی تلواروں کا تقابل ذوالفقار سے تو کیا نہ جاسکتا!

اس سوال کا جواب امیر المومنین نے اکثر موقع پر دیا ہے اپنے موقف کو واضح کیا ہے اور ان موانعات پر روشنی ڈالی ہے جو جانشین پیغمبر کی حیثیت سے ان کے ہاتھ کو روکتے رہے۔ شیعہ قلمکاروں نے بھی بار بار صراحت کی ہے مگر طوطے کی ایک رٹ ہے کہ اگر مسند خلافت پر غاصبین نے قبضہ کر لیا تھا اور مسلمانوں کی اکثریت انہیں چاہتی تھی تو میدان میں کیوں نہیں آ گئے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر آ جاتے تو علیؑ پہلے باغی خلافت قرار پاتے اور آج جو شرف ام المومنین کو ملنے والا تھا، وہ اس سے محروم رہ جاتیں!

اس کی کوئی تاویل ممکن نہیں ہے کیونکہ آپ کے اسلام میں خلیفہ سے بڑا درجہ کسی کا نہیں ہے، اور ام المومنین کی جنگ کو کسی طرح جائز نہیں کہا جاسکتا کیونکہ آپ خود اپنے اقدام پر پشیمان ہوئی تھیں اور جمل میں مکمل شکست کے بعد جب محمد بن ابی بکر نے عزت و احترام کے ساتھ آپ کو ہودج میں بٹھایا تھا تو آپ کے منہ سے نکل گیا تھا۔

”کاش ایسا قدم اٹھانے سے قبل مجھے موت آ گئی ہوتی!“

''اس کے بعد مسلسل اپنے فعل پر نادم ہوتی رہیں اور جب کبھی جنگ جمل کا خیال آ جاتا تو اس قدر روتی تھیں کہ چادر آنسوؤں سے تر ہو جاتی تھی، غش آ جاتا تھا اور فرماتی تھیں کہ اے کاش میں بصرہ جانے سے بیس برس پہلے مر چکی ہوتی!'' (۵)

اس اظہار ندامت کو ہر مورخ نے لکھا ہے۔۔۔رہ گئی بات خون عثمانؓ کا قصاص لینے کی تو انہیں شرعی طور پر خود فیصلہ کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ اگر لوگوں نے علیؑ کو ملوث کر کے کان بھرے بھی تھے اور انہیں غلط فہمی ہوگئی تھی تو علیؑ کے خلاف ثبوت کے ساتھ عدالت شرعیہ میں جاتیں اور علیؑ پر حد جاری کراتیں۔

اپنے پدر محترم کی خلافت نظیر کے طور پر ان کے سامنے تھی۔ وہ خود حدیث تو ریث کی واحد گواہ تھیں۔ انہیں معلوم تھا کہ حدیث جھوٹی ہے اور سچی بھی ہوتی تو مسلمانوں کے خلیفہ پر چڑھ دوڑنے کا حق تو کسی کو اسلام نے نہیں دیا جبکہ علیؑ نے خلافت پر زبردستی قبضہ بھی نہیں کیا تھا۔ مسلمانوں کی اکثریت نے اس منصب کے لئے آپ کو چنا تھا۔ جناب فاطمہ کی مثال کو پیش نظر رکھ سکتی تھیں۔۔۔شوہر صاحب ذوالفقار تھا۔ رسول کے برگزیدہ اصحاب جاں نثاری کو موجود تھے۔ بنی ہاشم کی تلواریں بے نیام ہونے کو بیقرار تھیں مگر آپ نے مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنا پسند نہیں کیا۔ تحریری ثبوت اور گواہ لے کر دربار خلافت میں پہنچ گئیں، یہ بتانے کے لئے کہ عرب کے صادق و امین کے تحریری وثیقے کی تردید وہ نہیں کر سکتے۔ میینہ حدیث جھوٹی ہے!

ام المومنین اس واقعے میں خود ایک فریق تھیں۔ بنت رسول کا طریقہ عمل انہوں نے دیکھا بھی تھا اور سمجھا بھی تھا لیکن علیؑ سے انہیں اتنی نفرت تھی کہ ان کا نام بھی خلافت کے ساتھ وہ سن ہی نہ سکتیں۔ انہوں نے اپنے بعض عقیدت مندوں کا مشورہ بھی قبول نہ کیا۔ حتیٰ کہ جنگ کے دوران جب زبیرؓ کو اپنے حق پر نہ ہونے کا احساس ہوا اور اپنے بیٹے عبداللہ کی مخالفت کے باوجود انہوں نے میدان چھوڑ دیا تب بھی ام المومنین کی آنکھیں نہیں کھلیں بلکہ وہ زیادہ شدت سے لوگوں کے حوصلے بڑھا کر یلغار کی تلقین کرتی رہیں۔

اس کے برعکس زبیرؓ نے جب رزم گاہ سے بھاگ کر بنی تمیم کے ایک موضع میں قیام کیا اور عمر بن جرموز مجاشعی نے علیؑ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے زبیر کو قتل کر دیا تو علیؑ نے زبیرؓ کا سر اور ہتھیار دیکھ کر خود قاتل کو قتل کرا دیا کیونکہ زبیرؓ حق کا راستہ اختیار کر چکے تھے۔

ام المومنین کے فدا کار بڑی سرفروشی سے لڑے مگر جانشین رسولؐ جہاد کا شرف حاصل کر رہے تھے انجام کار طلحہ جنگ میں مارے گئے۔ جمل کے باغیوں کو مکمل شکست ہوئی اور ام المومنین ارشادات پیغمبرؐ کو یاد کرتے کرتے واپس ہو گئیں۔

خلافت کا دوسرا بڑا باغی حاکم شام تھا، مسلمانوں کی تاریخ جس کو امیر معاویہ کے نام سے یاد کرتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت علیؑ معاویہ کو معزول نہ کرتے تو وہ بغاوت پر آمادہ نہ ہوتے۔ یہ بھی خطائے اجتہادی کی طرح جانبداری کا ایک پہلو ہے۔۔۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ علیؑ کے لئے اپنے دور خلافت میں ایسے شخص کو برسر اقتدار رکھنا ممکن ہی نہ تھا جو دین میں تحریف کر رہا تھا اور مفاد اقتدار کے لئے شعائر اسلام کو ترک کر کے ملوکیت کا انداز اختیار کر رہا تھا۔ اسی لئے حضرت عمرؓ اس کو مسلمانوں کا کسریٰ کہا کرتے تھے۔

معاویہ کو بنی امیہ کا تاریخ ساز کہا جاتا ہے اور کسی حد تک یہ صحیح بھی ہے کہ بیٹے کی حیثیت سے انہوں نے باپ کے خواب کی تعبیر پیش کی اور وہ سب کچھ کر دکھایا جس کی آرزو بھی شاید ابوسفیان نے نہ کی ہو۔ غزوات رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں فتح مکہ تک ہر موڑ پر ابوسفیان کا چہرہ نظر آتا ہے اور اس کو اسلام دشمنی پر مبنی قرار دیا جاتا ہے اور یہ غلط بھی نہیں ہے کہ ابوسفیان بلکہ ابومعاویہ کے مادہ پرست ذہن میں روحانیت کا خیال پیدا ہونے کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی اور اس نے روایتی عرب کو زندہ رکھنے کے لئے ہر حربہ استعمال کر لیا تھا اور جب کامیابی کا ذرا بھی امکان باقی نہ رہا تھا تو عباسؓ کے بھتیجے کی بادشاہی میں فتح مکہ کے دن منافقت کا نقاب چہرے پر ڈال لیا تھا حضرت بلال کی اذان پہلے پہل جب اس نے سنی تھی تو دل کا جو عالم ہوا تھا، اس کو وہی جانتا تھا۔ زبان سے بلا ارادہ نکل گیا تھا:-

''شاید خدا نے عتبہ بن ربیعہ کو یہ سعادت بخشی کہ اس نے اپنی آنکھوں سے یہ منظر نہیں دیکھا'' شاید وہ کہنا چاہتا تھا کہ اے کاش یہ دن دیکھنے سے قبل وہ بھی مر گیا ہوتا مگر بہت پختہ عزائم اور مضبوط اعصاب کا آدمی تھا روایات عرب کا علمبردار کہ بڑے تحمل سے اندرونی کرب کو چھپائے رہا اور رحمۃ للعالمین کی چادر کو دوش پر ڈالے ہوئے کسی حلقہ بگوش اسلام کا کردار ادا کرتا رہا۔

ابوسفیان کی یہ حیرت مخالفین اسلام کی صف اول میں مثالی تھی جو اگلی کئی نسلوں تک چلتی رہی البتہ حالات کے تقاضوں کا اثر اس پر پڑا اور ذہنی رجحانات کے بقدر اس میں تبدیلی ہوتی رہی۔ پیغمبرؐ

اسلام اس کی بھر پور جوانی میں پیدا ہوئے تھے اور انہوں نے اس کی آنکھوں کے سامنے اسلام کی بساط بچھائی تھی۔ اس کا شمار شخصیات عرب میں ہوتا تھا۔ محمدؐ بن عبداللہ کو وہ خاطر میں بھی نہ لاتا لیکن اس کے مقابل آ گئے تھے ابوطالب پشت پناہ محمدؐ بن کر جو اپنے باجبروت پس منظر کے ساتھ ابوسفیان کیا، اس کے تمام ہم آوازوں پر غالب آ سکتے تھے لہٰذا وہ ابن عبداللہ کا بال بیکا نہ کر سکا، لیکن جب ابوطالب کا رعب و دبدبہ خود ابوطالب کے ساتھ چلا گیا تو وہ کھل کھیلا اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب اس کی دسترس سے نکل کر مدینہ منتقل ہو گئے تو اس نے لشکر کشی کا سلسلہ شروع کر دیا۔

پھر اسلام کے غلبے میں اپنے کو کمزور پا کر اس نے حصول مقصد کے لئے اندرونی سازش اور دوستی کی شکل میں دشمنی کا راستہ اختیار کر لیا اس کی یہ روش موروثی بن گئی۔ خلافت کے دور اول میں جب یزید بن ابی سفیان عامل شام ہوئے تو ابوسفیان زندہ تھا۔ اس نے چھوٹے بیٹے معاویہ کو بڑے بھائی کا مضبوط بازو پا کر ایک اطمینان کا سانس لیا پھر جب یزید کے بعد اقتدار معاویہ کے ہاتھ میں آ گیا تو اس کو یقین ہو گیا کہ اب محمدؐ کی بادشاہی پر اس کی اور اس کے ورثاء کی اجارہ داری کو کوئی ختم نہیں کر سکتا۔

خلافت کے ابتدائی ادوار میں ابوسفیان دور کا تماشائی نظر آتا ہے مگر عرب کا جہاندیدہ سیاست کار اب ایک کہنہ مشق کھلاڑی کا کردار ادا کر رہا تھا۔ اس کے مہرے شطرنجی بساط پر اپنی اپنی جگہوں پر رکھے ہوئے تھے اور اس کی دوررس نگاہیں ہوا کے دوش پر تخت خلافت کو شام کی طرف اڑتا دیکھ رہی تھیں۔ پھر جب عثمانؓ نے نظم خلافت ہاتھ میں لے لیا تو مدینہ بھی بنی امیہ کا اور شام بھی اولاد عبد شمس کا، بالفاظ دیگر پوری مملکت اسلامیہ ابوسفیان کی!

مسلمانوں کی تیسری خلافت حقیقتاً بنی امیہ کی تھی۔ اس میں ابوسفیان اپنے بھائی کے بیٹے سے حق استادی لیتا رہا اور شام میں معاویہ مطلق العنانی کا انداز اختیار کرتا رہا۔ مدینے میں حضرت عثمان کے خلاف بغاوت کے آثار نمودار ہوئے تو معاویہ نے انہیں مشورہ دیا تھا کہ وہ دمشق منتقل ہو جائیں جس کو خلیفہ سوم نے منظور نہیں کیا۔

بظاہر اس کی تہہ میں یہ جذبہ نظر آتا ہے کہ وہاں حضرت عثمانؓ محفوظ رہیں گے لیکن ایک چھپا ہوا نظریہ یہ بھی ممکن ہے کہ بوڑھے عثمانؓ کے بعد خلافت خود بخود معاویہ کو مل جائے گی۔ مستقبل کے حالات سے اس خیال کو تقویت پہنچتی ہے۔

دعوت شام میں فتور نیت کا سوء ظن بعید الممکنات نہیں لیکن اس کے عقلی دلائل ملنا مشکل ہیں کیونکہ عثمانؓ معاویہ کے چچیرے بھائی تھے اور حکومت بہر طور امویوں کی تھی۔ اس کے سربراہ معاویہ

ہوتے یا عثمانؓ لیکن ایک حقیقت یہ بھی ہے جو نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ جب حالات زیادہ خراب ہوئے اور مجبور خلیفہ نے شام سے امداد مانگی تو معاویہ نے کوئی فوجی مدد نہیں کی۔ یہاں تک کہ عثمانؓ دشمنوں کے ہاتھوں قتل ہو گئے۔

کہا نہیں جاسکتا کہ یہ سانحہ شام کے فرمانروا کے لئے غیر متوقع تھا مگر علیؑ کا خلیفہ بن جانا قطعاً خلاف امید تھا جس کو سنتے ہی حاکم شام اتنا بے چین ہوا کہ اس نے اپنا روایتی تحمل بھی کھو دیا۔

شام کی فوجی طاقت یوں بھی مرکز سے بہت زائد تھی پھر بھی مقابلہ تھا اسد اللہ الغالب سے اس لئے پہلا کام تو شام کے اسلامی حکمران نے یہ کیا کہ تمام ممالک محروسہ میں فوجیں بڑھانے کے احکام روانہ کیے پھر سیاسی تدابیر پر عملدرآمد شروع کر دیا جس کا بدیہی نتیجہ جنگ جمل تھا۔

شام کے جنگی انداز کو معیار حکمرانی اور میزانِ جہانبانی پر پرکھا جائے تو فاتحین ماضی و مستقبل سے داد و تحسین لیے بغیر نہ رہیں گے اور سچ بھی یہی ہے کہ یہ تمام مادی طور طریقے بروئے کار نہ لائے جاتے تو رسولؐ کے جانشین کو شکست دینا ممکن نہ ہوتا۔

خلافت شام کا پس منظر

اسلام ادیان عالم کا اختتامیہ تھا جس کا اعلان خاتم المرسلین نے کوہ صفا کی بلندی سے کیا تھا اور حجۃ الوداع کے بعد غدیر خم کے منبر کو جس کا حرف آخر قرار دیا تھا۔

تقریباً دو ماہ بعد ۲۸ صفر ۱۱ھ کو جب حضور نے سفر آخرت فرمایا تو ہر طرح اپنے فرائض منصبی کو ادا کر چکے تھے اور اپنے دین کا مستقبل جس کے ہاتھ میں دینا تھا، اس کو سونپ چکے تھے لیکن جو کچھ ہونے والا تھا، وہ بھی آپ کے علم میں تھا لہٰذا دینداروں اور بے دینوں کو الوداع کہہ کر آخری پیغمبرؐ دوسرے ہر پیغمبر کی طرح اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

ختم المرسلین کی موت نے روز روشن کو سیاہ کر دیا تھا لیکن ابوبکرؓ، عمرؓ، ابوعبیدہ الجراحؓ، سعد بن ابی وقاص اور دوسرے لوگ، جو اسی دن کے منتظر تھے، وقت آتے ہی سقیفہ بنی ساعدہ پہنچ گئے اور دور جاہلیت کی یاد تازہ کر کے پیغمبرؐ عرب کی بساط شاہی پر قبضہ کر لیا۔

قرآن اس حکومت کا دستور العمل تھا لہٰذا شوریٰ کی ایک آیت کو بنیاد بنایا گیا۔

"تم اپنے معاملات میں باہم مشورہ کر لیا کرو"

معاملات کا اطلاق نظم حکومت پر کیا گیا مگر آپس میں مشورے کے بجائے دھینگا مشتی سے حضرت ابوبکرؓ کو خلیفہ بنالیا گیا پھر قبائلی روایت کے مطابق مجلس شوریٰ ترتیب دی گئی جس میں ابتداءً عباسؓ ابن عبد المطلب کو شامل کر لیا گیا پھر انہیں نکال دیا گیا۔

یہ کارنامے تھے علیؑ کے دشمنوں کے اور پیغمبرؐ عرب کو بادشاہ سمجھنے والوں کے جنہوں نے اسلام کے نام پر صحرائی روایات کا ایک نظام حکومت قائم کر لیا تھا۔ بات صرف ایک قبیلے کی ہوتی تو اس کی کوئی تاویل کی جا سکتی تھی لیکن مدینے کے چند آدمیوں کو دور دور تک پھیلے ہوئے تمام قبیلوں پر اپنے جبریہ فیصلے کو

مسلط کرنے کا حق تو نہ تھا جبکہ ان کی تعداد کسی طرح سو سے زائد نہ تھی، ان میں بھی انصار میں سے حضرت عمرؓ کے تین چار دوستوں کے سوا سب کے سب بائیکاٹ کر کے چلے گئے تھے۔ باقی لوگوں میں جو تماشائی بن کر آ گئے تھے، وہ بھی خاموشی کے ساتھ غیر جانبدار رہے۔

ان سب سے اور مدینے کی باقی آبادی سے تلواروں کی چھاؤں میں بیعت لی گئی انہیں دو دو چار چار کر کے مسجد نبوی میں بلوایا گیا جہاں خالد بن ولید کے لائے ہوئے ساڑھے تین ہزار سوار دہشت پیدا کرنے کے لئے ٹھہرائے گئے تھے جو ایک طرح اصل حقداران خلافت سے مبارز طلبی تھی مگر خانہ سیدہ زہرا کے دروازے پر حاضری دینے والے اصحاب رسولؐ امام وقت کے چہرے کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھتے رہے اور علیؑ عالم خیال میں اپنے ہادی برحق کو یاد کرتے رہے جس نے بہر طور صبر وضبط کی وصیت کی تھی۔

بہر طور خالد بن ولید کے گھڑ سواروں کا مدینہ پہنچنا کسی سیاسی منصوبہ کی طرف ایک اشاریہ ہے جس کو پس منظر سے مربوط کیا جائے تو ایک قیاسی نتیجہ یہ نکل سکتا ہے کہ اگر سقیفہ کے نتائج کی مخالفت میں کوئی جماعت کھل کر سامنے آتی اور نوبت جماعتی تصادم کی پیدا ہوتی تو مخالف جماعت کو ان مسلح سواروں کا مقابلہ کرنا پڑتا جس کے سپہ سالار خالد بن ولید ہوتے اور مسلمانوں کے خلیفہ اول کی یہ فوج مدینۃ النبی میں مسلمانوں کے خون سے اپنی تلواروں کی پیاس بجھانے میں دریغ نہ کرتی۔

ہوسکتا ہے کہ حضرت علیؑ کی خاموشی میں ایسے امکانات مضمر ہوں اور آپ مسلم بن عقبہ کے حملے سے قبل اہل مدینہ کا خون بہنے کی ذمہ داری اپنے سر لینا نہ چاہتے ہوں لیکن ایسے قیاسات کبھی فیصلہ کن نہیں ہوتے۔

ہر لحاظ سے اس انتخاب کو پورے مدینۃ النبی کا انتخاب بھی کہا نہ جاسکا نہ کہ پورے عرب کا نتیجہ وہی نکلا کہ بیشتر قبائل نے اس کو ماننے سے انکار کر دیا۔ ان میں مالک بن نویرہ حاکم بطاح بھی تھے جنہوں نے اولاد رسولؐ کو چھوڑ کر کسی اور کو جانشین رسولؐ ماننے سے انکار کر دیا اور غاصبین خلافت کو زکواۃ کی رقوم نہیں دیں۔ ایسے لوگوں کو منکرین زکواۃ کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

دوسرا گروہ مدعیان نبوت یا مرتدین کا تھا جنہوں نے علم وفکر کی روشنی میں اسلام قبول کیا تھا، لیکن اب پیغمبرؐ برحق کی اطاعت کا جوا کاندھے سے اتار پھینکا تھا۔ درپردہ ان کی روش میں خودسری کے ساتھ ایک احتجاج بھی تھا خلافت مدینہ کے خلاف کہ نیابت رسولؐ کا معیار علم وعرفان، زہد وتقویٰ، شجاعت وشرافت، جود وسخا، حکمت ودانائی، خطابت ونجابت اور وراثت وقرابت پر نہیں رکھا گیا بلکہ گروہ

بندی اور سیاسی سازش سے سن وسال کو میزان انتخاب بنا کر کرلیا گیا۔ افضل پر مفضول کو ترجیح دی گئی ان کے نزدیک جن لوگوں کو ختم المرسلین کی جگہ پر بٹھا دیا گیا تھا، ان سے وہ خود ہزار درجہ بہتر تھے۔ اگر انہیں پیغمبر کی جانشینی کا اہل قرار دیا جاسکتا تھا تو ان کے توازن سے خود وہ لوگ نیابت پیغمبری کے زیادہ اہل ہو سکتے تھے لہٰذا ایسے لوگوں کی اطاعت کو انہوں نے اپنی توہین قرار دیا۔ اس کو بعض مورخین نے صراحت سے لکھا ہے۔

یہ ہیں وہ نظریات جنہوں نے ان کے اندر ایک باغیانہ تحریک پیدا کی اور یکے بعد دیگرے کئی افراد نے دعوی خلافت کے مقابل دعوی نبوت کر دیا جو یقیناً گردن زدنی تھا لیکن انہوں نے اس اعلان سے مدعیان خلافت پر ایک طنز کیا تھا۔

اسی لئے ابن حزم اور طبری نے انہیں مرتدین کے بجائے باغیان خلافت کا نام دیا ہے (تاریخ طبری جزو ثالث ص ۱۱۴، ۱۱۵ اردو ترجمہ مطبوعہ حیدر آباد دکن)۔

چاہئے تو یہ تھا کہ صرف خبر پر اعتماد نہ کیا جاتا، افہام وتفہیم کی جاتی۔ مباہلہ نجران کی نظیر سامنے تھی لیکن سوال یہ تھا کہ ان سے فکری گفتگو کون کرتا لہٰذا خلیفہ اول نے خالد بن ولید کو متعین کر دیا۔ حضرت عمرؓ اور دوسرے اصحاب نے روکا مگر حضرت ابوبکرؓ نہیں مانے۔ حضرت علیؑ نے مدینے والوں کو جن تلواروں سے بچالیا تھا، وہ ان باغیان خلافت کے سروں پر چمکیں اور حق پسندی کی پاداش میں ریت کے ذروں کو ان کے خون سے رنگین کر گئیں۔

اس حقیقت کی صراحت کسی مورخ کا قلم نہ کر سکا اور دربار خلافت کے حکم سے وہ خاک وخون میں لتھاڑ دیئے گئے۔ ان کا موقف آج بھی تاریخ اسلام سے ایک سوال کر رہا ہے کہ کیا وہ علم وفکر میں ان لوگوں سے بہتر نہیں تھے جنہوں نے پیغمبر اسلام کی مسند پر بیٹھ کر مسلمانوں کی دینی رہنمائی کی تھی؟ خلیفہ اول کے اس فیصلے سے حکومت کو ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ ان سواروں کا مصرف نکل آیا جو مقصدی طور پر منصوبے کے مطابق مدینے بلوائے گئے تھے دوسرا یہ کہ خالد بن ولید کی محبوبہ کے وصل کی دیرینہ آرزو پوری ہوگئی اور تیسری یہ کہ اسلام میں زنا کے قابل معافی ہونے کی ایک نظیر قائم ہوگئی۔

منکرین زکواۃ کا انجام عبرتناک ہوا لیکن انہیں مورخین کا قلم بھی خارج از اسلام نہ کر سکا کیونکہ خود حضرت ابوبکرؓ کے ہمنوا اصحاب بھی ان پر لشکر کشی کے خلاف تھے کیونکہ انہوں نے رقوم زکواۃ

خلافت کے بجائے خانوادہ رسالت کو دینے کا اعلان کیا تھا اور خود حضرت عمرؓ کا کہنا بھی یہی تھا کہ بہر طور وہ مسلمان ہیں، آج خلافت کو برحق نہیں سمجھتے تو کل سمجھیں گے۔ اس مشورے کو خلیفہ اول نے نہیں مانا

اور خالد بن ولید کو روانہ کر دیا جو مالک بن نویرہ اور ہزاروں مسلمانوں کا خون بہا کر مالک کی حسین بیوی ام تمیم کو لے آئے جس پر وہ مدتوں سے عاشق تھے۔

اس سلسلے میں دو جرم خالد پر عائد ہوئے ' پہلا تو یہ کہ انہوں نے مالک بن نویرہ کو حالت نماز میں قتل کیا، دوسرے یہ کہ ان کی حسین بیوی سے اسی رات نکاح کے نام پر زنا کیا۔ واپسی پر حضرت عمر نے خالد پر حد جاری کرنے کو کہا مگر ابوبکر نے ان کو معاف کر دیا اور ام تمیم کو طلاق دلوادی۔ وراثت میں آیا ہوا عقیدہ جو بھی کہلوادے لیکن بے گناہوں کا خون آج بھی انصاف طلب ہے۔

ان حقائق کو ہر مورخ نے قلم بند کیا ہے اور حضرت ابوبکر اس کی جوابدہی سے بری الذمہ نہیں ہوسکتے۔ اس پر مستزاد ہے صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی متعدد احادیث کا متفقہ فیصلہ کہ کلمہ لا الہ زبان پر جاری ہونے کے بعد کسی کافر کو بھی کوئی مسلمان قتل کر دے تو مقتول صاحب ایمان اور قاتل کافر متصور ہوگا۔ اس کے بعد مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں صرف اتنا یاد دلانا ہے کہ مالک بن نویرہ حالت نماز میں قتل کیے گئے تو قاتل کو کیا کہا جائے گا، مسلمان یا کافر یا سیف اللہ؟۔

اہل بیت پیغمبرؐ کو بے وقعت بنانے کے لئے جو مظالم کیے گئے ان کا اعادہ طوالت سے خالی نہ ہوگا جس کی اساس صرف ایک من گھڑت حدیث پر ہے اور جس کا مقصد رسولؐ خدا کی بیٹی کو مالی طور پر کمزور بنانے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اس سلسلے میں صرف سیدہ کونین کی دربار خلافت میں آمد کا بیان کافی ہوگا۔ آپؑ کی منزلت سے کوئی مسلمان انکار نہیں کرسکتا کیونکہ آپ کے لئے ارشادات نبوی کا دوستوں اور دشمنوں سب نے اعتراف کیا ہے۔ صحابہ، رسولؐ کی زندگی میں در فاطمہ پر حاضری دینا موجب شرف سمجھتے تھے۔ جس میں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کوئی مستثنیٰ نہ تھا خود ختمی مرتبت کی نظر میں آپ کی جو قیمت تھی اس کے لئے محدث دہلوی کے الفاظ کافی ہوں گے:۔

''حضورؐ کی عادت کریمہ تھی کہ جب فاطمہؑ کو دیکھتے تو کھڑے ہوجاتے، متوجہ اور مستقبل ہوکر ان کا بوسہ لیتے اور خود اپنی جگہ پر بٹھاتے تھے''۔ (۶)

آسمان کے فرشتے، اسلام کی نگاہیں اور مدینے کے در و دیوار اس کے گواہ ہیں۔ پھر اسی مدینے نے یہ منظر بھی دیکھا کہ رسول اسلام کی عظیم المرتبت بیٹی اپنے باپ کے جانشین کے سامنے کھڑی تھی، دونوں بیٹے دہنے بائیں، پشت پر علیؑ ام ایمن اور دونوں بیٹیاں تھیں، بالاختصار اثاثہ رسالت سے کچھ زائد جس کو لے کر ہادی اسلام نصارائے نجران کے سامنے مباہلے کے لئے گئے تھے۔ آج باپ کے بجائے بیٹی کو اسلام کے نام نہاد صاحبان اقتدار سے ایمان کے نام پر مباہلہ کرنا تھا۔ باغ فدک کے لئے

پیغمبر برحق کا لکھا ہوا ہبہ نامہ اس کے ہاتھ میں تھا جس پر بعض اصحاب کرام کے دستخط بھی تھے جو بقید حیات تھے اور تصدیق کے لئے بلائے جا سکتے تھے۔

بنت رسولؐ خود رسول کے لب و لہجہ میں بول رہی تھی۔

''بابائے خیبر کے یہودیوں کی پیش کی ہوئی جائیداد مجھے دی تھی۔ تم اس پر قبضہ کیسے کر سکتے ہو؟''۔

جواب آپ کو یہ ملا ''حضورؐ نے مجھ سے فرمایا تھا کہ ہم انبیاء اپنا ترکہ نہیں چھوڑتے جو کچھ ہوتا ہے، وہ صدقہ ہوتا ہے''۔

سیدہ زہرا نے استدلال کیا کہ مجھے لکھ کر دے دینے کے بعد فدک پر اس حدیث کا اطلاق نہیں ہوتا مگر اس پر کوئی اعتنا نہیں کیا گیا۔ ان شہادتوں کو جھٹلایا گیا جن کو لے کر بنت رسولؐ آئی تھی کہ ایک شوہر، ایک رشتہ دار اور نابالغ بچوں کی گواہی تسلیم نہیں کی جا سکتی۔

اس کے بعد فاطمہ زہرا کی آواز چھوٹے سے دربار میں گونجنے لگی۔ بنی ہاشم کی فصاحت و بلاغت کے دریا ابلنے لگے۔ اہل دربار کو محسوس ہوا جیسے خود پیغمبرؐ اسلام غدیر خم میں سوتے ہوئے مسلمانوں کو جگا رہے ہوں۔

حاضرین میں سے بعض لوگ وہ بھی تھے جنہوں نے عمر ابن عبدود کی للکار پر مسلمانوں کا سناٹا دیکھا تھا لیکن وہ سکوت خوف و دہشت میں طاری ہوا تھا۔ آج کی کیفیت اس سے بالکل مختلف تھی۔ خطبے کی ابتداء میں کچھ لوگوں نے سنا کہ سیدہ کیا کہہ رہی ہیں پھر ہر سننے والا عالم خیال میں چلا گیا اور جب بنت رسول کی آواز آنا بند ہو گئی تو حضرت ابوبکرؓ کی طرح دوسرے لوگ بھی ہوش میں آنا شروع ہوئے۔

کہا جاتا ہے کہ حضرت ابوبکر لکھ کر دینے کو تیار ہو گئے تھے مگر عین اسی وقت حضرت عمر کہیں سے آ گئے۔ انہوں نے ہبہ نامہ ہاتھ سے لے کر چاک کر ڈالا یہ کہہ کر کہ پیغمبر اپنی میراث نہیں چھوڑتے۔ حالانکہ خود حضرت عمر کا کہنا تھا کہ یہ حدیث ابوبکرؓ کی زبان سے انہوں نے پہلی بار سنی تھی، اس سے قبل کسی کی زبان سے نہیں۔

اس واقعے میں دو باتیں غور طلب ہیں ایک یہ کہ ابوبکر کا لقب صدیق تھا اور ام المومنین عائشہ کا صدیقہ ان میں ایک راوی تھا دوسرا گواہ، مطالبہ ان کے مقابل رسولؐ کی بیٹی کر رہی تھی جو صدیقہ طاہرہ کہلاتی ہے اور گواہ تھے علیؑ ابن ابی طالب جن کو ایک طبقہ صدیق اکبر مانتا ہے، عام مسلمانوں کے علاوہ ان کے عدل کی شہادت تو خود حضرت عمر بھی دیتے ہیں لیکن صدیقہ طاہرہ اور صدیق اکبر کو جھوٹا ٹھہرا دیا

گیا یعنی غیر عادل مگر اس کے بعد اکثر موقعوں پر انہیں عادل بھی قرار دیا گیا حالانکہ کسی کا جانبدار بن کر آنے والا عدل پرور کیونکر ہوسکتا ہے اور ایک صدیق کو جھٹلانے والا صدیق کس طرح رہ سکتا ہے۔

فاطمہ زہرا کے لئے رسولؐ اسلام کے فرمودات میں ایک حدیث یہ بھی ہے کہ فاطمہ میرے جگر کا ٹکڑا ہے جس نے اسے ایذاء دی اس نے مجھے تکلیف پہنچائی اور جس نے مجھے تکلیف پہنچائی، اس نے خدا کو اور جس نے خدا کو تکلیف پہنچائی وہ۔۔۔

ان اقوال کو اہمیت نہیں دی گئی اور بنت رسولؐ نالاں و گریاں واپس ہوگئیں۔ فاعتبر و یا اولی الابصار! روایات مختلف میں یہ حقیقیت محتاج ثبوت نہیں کہ سیدہ طاہرہ ساڑھے تین گھنٹے جانشین رسولؐ اور ان کے حواریوں کے سامنے کھڑی رہیں، امت کی عدالت میں ایک فریادی کی طرح اور کسی کو اس کی منزلت اور حرمت کا احساس نہیں ہوا۔

اصحاب رسول واقف تھے کہ وہ اپنی قرابت اور سیرت و کردار کے باعث نگاہ رسالت میں کس قدر محترم تھی۔ اگر وہ اس حیثیت سے بارگاہ نبوت میں جاتی اور داد طلب ہوتی تو کیا اس کے ساتھ یہی سلوک روا رکھا جاتا۔ پورے وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ آج کے صاحبان اقتدار افضل المرسلین کے ساتھ خود بھی تعظیم کو کھڑے ہوجاتے۔ فیصلہ کیا ہوتا، اس کے لئے کچھ کہنا لاحاصل ہے لیکن یہ مسلم ہے کہ احترام سیدہ کو ہر ایک اپنی سعادت سمجھتا اور خوشنودی رسول کو موجب نجات۔ کیا سنت رسولؐ کے خلاف عمل کرنے والے کو جانشین رسول کہا جاسکتا ہے؟

قابل عبرت ہے نیرنگی زمانہ اور زعم اقتدار کہ سنت کے علم برداروں نے معمول پیغمبر کی طرف گھوم کر بھی نہ دیکھا کہ کل کی مکرم و محترم خاتون کے لئے ان کا آج کا برتاؤ اپنے نجات دہندہ کی سیرت سے کتنا مختلف ہے۔ شاید منصب خلافت کے زعم نے انہیں کچھ سوچنے نہیں دیا۔

اصحاب رسول کو یاد نہیں رہا کہ حاتم کی بیٹی جب گرفتار ہوکر لائی گئی تھی تو آنحضرتؐ نے اس اعزاز و تکریم کے ساتھ اس کے بھائی کے پاس واپس بھیج دیا تھا، خود ان کی بیٹی کی حیثیت کسی قیدی کی تو نہ تھی بلکہ وہ تو اپنا حق واپس لینے کے لئے آئی تھی۔ عظمت پیغمبری اس کے پس منظر میں تھی، خود اپنی کرامت و کردار پیش منظر میں، چادر تطہیر سر پر سایہ فگن موروثی لب و لہجہ میں اپنے حق کی طرف اہل دربار کی توجہ مبذول کرارہی تھی، ماضی سننے والوں کی نگاہوں میں گردش کررہا تھا مگر منصب خلافت شاید مسند رسالت سے بڑا تھا جس کو ذرا بھی حرکت نہ ہوئی اور پیغمبری کی نسائی عظمت ہوس اقتدار کا ماتم کرتی ہوئی واپس چلی گئی۔

یہ ہیں چند مناظر جن پر سیاسیات خلافت ماضی کی بنیاد رکھی گئی اور جن کی بدولت اولادِ پیغمبر اقتصادی طور پر ٹوٹتی رہی۔ نتیجے میں اسلام کا دستور افکار عقلی اور مصالح ملکی کی دفعات سے گرانبار ہوتا رہا۔ جہاد ملک گیری کے سانچے میں ڈھل گیا اور خلافت اسلامیہ انداز جلالت شاہی اختیار کر گیا۔

حضرت عمر کے دور خلافت نے بارہا حدود شرعی کی خلاف ورزی کی، ان کے عہد میں جہاد کی نوعیت نے سکندر اعظم کی فتوحات کو مات کر دیا لیکن ان کو یکسر بے محل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بلاشبہ ان کے عہد کو روح اسلام کے مجروح ہونے سے مبرا نہیں ٹھہرایا جا سکتا تاہم ان کے مزاج میں عرب کی صحرائیت کو جو دخل تھا، اس کے دھبے تہذیب اسلام پر آج بھی نظر آتے ہیں اور دین کے دامن پر ان کی بدنمائی کو چھپایا نہیں جا سکتا۔ رہ گئی بات فتوحات کی تو مسلمان جو چاہیں کہیں مگر دوسری اقوام نے ان کو کبھی جہانبانی اور فرمانروائی سے مختلف نہیں سمجھا اور ان کا شمار فاتحین عالم میں اسی لئے کیا بھی جاتا ہے۔ انبیاء و مرسلین کے ساتھ تو کوئی ان کا نام بھی نہیں لیتا۔

مسلمانوں کی تیسری خلافت پہلے دو ادوار سے مختلف تھی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ خلافت اول کا زمانہ عہد رسولؐ کے بالکل متصل تھا۔ حضرت ابوبکر کے ڈھائی سالہ عہد کے بعد حضرت عمر کا دور بہت زیادہ دور نہ تھا مگر دس سال کے بعد جب حضرت عثمان نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی تو ہر شعبہ میں کافی تبدیلیاں آ چکی تھیں اور مملکت اسلامیہ کی حدود، قیصر و کسریٰ کی سرحدوں کو چھو رہی تھیں۔ اسلام کا مزاج بھی خالص نہ رہا تھا۔ عرب کا جہاندیدہ سیاست دان ابوسفیان۔ اب تک بقید حیات تھا تاہم اس کی مداخلت نظام سلطنت میں صفحہ تاریخ پر نظر نہیں آتی مگر بیت المال پر دسترس کی کہانیاں عوام کی زبانوں پر ضرور تھیں۔

خلافت یقیناً حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کا کارنامہ ہے۔ انہوں نے اسلام اور مملکت اسلام دونوں پر اتنے گہرے نقوش مرتسم کیے تھے کہ حضرت عثمان کے عہد تک آتے آتے اسلام کے بنیادی خدوخال کہیں پر جلی اور کہیں پر خفی ہو گئے تھے۔ خانوادہ رسالت اس ڈگر سے بہت دور تھا جس کو آج مسلک اسلام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور یہ حقیقت بھی ناقابل فراموشی ہے کہ مظالم اتنے زاویوں سے ڈھائے گئے تھے کہ مظلوم اس کے عادی ہو چکے تھے پھر بھی اصحاب کبار میں عمار یاسر اور ابوذر جیسے کئی بزرگ بقید حیات تھے جو اپنی زبانوں کو حق گوئی سے نہ روک سکے۔ انجام کار نشانہ ستم بنے۔ ان میں سے ابوذر ربذہ کی جلاوطنی میں اپنا مقصد حیات پورا کر گئے۔ باقیات الصالحات نے حضرت علی کے برسر اقتدار آنے پر اسلام کی نشاۃ ثانیہ میں اپنا کردار ادا کیا۔

لیکن ان اصحاب باصفا کی ہر کوشش بے سود ثابت ہوئی کیونکہ علیؑ نے جس بساط خلافت پر قدم رکھا تھا، وہ کہنے کو تو سجادہ نبوت پر بچھائی گئی تھی مگر اس پر دہریت اور مادیت کے اتنے داغ اور دھبے پڑ چکے تھے کہ دامن اسلام کے زیر سایہ پرورش پائے ہوئے پیکروں کی پاکیزگی بھی انہیں صاف نہ کر سکی۔ ایک مورخ نے حضرت عثمان کے عہد پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:-

''شروع میں فن معماری کا کوئی شوق نہ تھا۔ مکہ میں کعبے کی مانند بہت کم ایسی عمارتیں تھیں جو اعلیٰ کاریگری کا دعویٰ کر سکتیں۔ متمول لوگوں کے گھر یا پتھروں کے بنے ہوئے ہوتے یا اینٹوں کے۔

مدینے کے گھر عموماً اینٹوں کے بنے ہوئے تھے۔ جامع مسجد بھی کچی اینٹوں کی تھی۔ اس پر گارے کی لیپائی کردی جاتی تھی۔ مکان اکثر یک منزلہ ہوتے۔ ان میں فراخ صحن اور مرکز میں کنواں ہوتا تھا مگر خلیفہ ثانی کے آخری دور میں اسلامی دارالخلافہ میں غیر ممالک کی دیکھا دیکھی لوگوں کو عمارتوں کا شوق ہو گیا تھا۔ مکہ اور مدینہ کے تمام سرداروں نے پتھروں اور سنگ مرمر کے عالی شان مکانات بنوا لئے تھے۔

حضرت عثمان نے جو محل بنوایا تھا، وہ بہت بڑا، خوبصورت اور نفیس بیان کیا جاتا ہے۔ جامع مسجد گرادی گئی۔ اس کی جگہ سنگ مرمر اور پتھروں کی عالیشان عمارت کھڑی کردی گئی۔ مسعودی بیان کرتا ہے کہ خلیفہ عثمان کے عہد میں رسول کے صحابیوں نے اپنے لئے عالیشان مکان بنوا لئے تھے۔ زبیر بن عوام نے جو مکان تعمیر کرایا تھا، وہ مسعودی کے زمانے یعنی ۳۵۲ھ میں موجود تھا اور سوداگروں اور ساہوکاروں کے کام آتا تھا۔ کوفہ، فسطاط اور سکندریہ میں بھی زبیر کے مکانات تھے۔ یہ مکانات اور ان سے متعلق باغات مسعودی کے وقت میں بالکل صحیح وسالم تھے''۔

یہ حقیقت ناقابل انکار ہے کہ انصار مدینہ کی مہمان نوازی نے نہ صرف رسولؐ بلکہ اصحاب رسول کے لئے بھی دیدہ و دل فرش راہ کر دئے تھے اور یہ ان کی کشادہ دلی اور اخوت اسلامی کا نتیجہ تھا کہ مہاجر مکہ بہت جلد بے سروسامانی کے دائرے سے نکل کر اطمینان کا سانس لینے لگے یہی مورخ آگے چل کر ان کی مدنی زندگیوں کے بارے میں لکھتا ہے:-

''مکے اور مدینے کے لوگوں کی حالت بالکل ایتھنز اور اسپارٹا جیسی تھی مکہ کے لوگ قمار بازی، شراب خوری اور عیاشی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اہل مدینہ اپنے لیڈروں کی مثال دیکھ کر جفاکش، مستعد اور پاک وصاف تھے۔ فتح مکہ کے بعد اس شہر کے لوگ بھی اسلامی پابندی پر مجبور ہو گئے۔ یہ حالت پہلے دو خلفاء تک کچھ نہ کچھ برقرار رہی لیکن حضرت عثمانؓ کے تخت خلافت پر جلوہ افروز ہوتے ہی نوجوانوں اور

خاص کر بنی امیہ کے نونہالوں نے وہی عیاشانہ زندگی اختیار کرلی۔ عثمانؓ کے بھتیجے نے ایک قمار خانہ جاری کیا تھا۔ عورتوں کا عشق ایک فیشن ہو گیا تھا۔ اس عیاشی نے بنی امیہ کے دور میں دمشق پہنچ کر بدترین صورت اختیار کرلی۔ مدینے کے لوگ سنجیدہ زندگی بسر کرتے، مدرسے شوقین طلباء سے بھرے رہتے تھے"
(ماخوذ از ہسٹری آف سیراسنز اردو ترجمہ ص ۷۲ مطبوعہ اردو اکیڈمی سندھ کراچی)۔

ان چند سطور سے وہ منظر ڈھکا چھپا نہیں رہتا جس میں پیغمبرؐ اسلام کے ازلی جانشین نے زمام خلافت ہاتھ میں لی اور اس آئین صداقت کو نافذ کیا جو نبی برحق سے انہیں ملا تھا۔ حضورؐ نے چالیس سال تک اہل مکہ کے ظرف میں وسعت و صلاحیت پیدا کر کے پاک و پاکیزہ مظروف اس میں ڈالا تھا۔ یہ ظرف اب مادی آلودگیوں سے پر ہو گیا تھا لہٰذا مظروف خالص کو اس نے قبول نہیں کیا اور معاً اس طرح چھلک اٹھا جیسے ظرف سے اس کا کبھی کوئی تعلق ہی نہیں رہا تھا۔

انجام کار مادی نظریات کے تمام لوگ خلافت کے لئے علیؑ کو ناموزوں قرار دینے لگے اور اندر ہی اندر باغیان خلافت سے ان کا رابطہ قائم ہو گیا۔

خلیفہ برحق

مسلمان بلا کسی اختلاف کے ختمی مرتبت کو افضل المرسلین مانتے ہیں اور حضرت عیسیٰ روح اللہ کو آپ کا پیشرو۔ یہ حقیقت بھی مسلم ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے بعد آپؑ کی جانشینی کے لئے کوئی تنازعہ نہیں ہوا کیونکہ اس کا معیار روحانیت تھی آپ کے حواری اپنی اپنی فہم کے مطابق پیغام عیسوی کو بڑی احتیاط کے ساتھ پھیلاتے رہے۔ یقیناً اس کا حلقہ اس وقت تک وسیع نہیں ہوا جب تک تاج وتخت سے اس کی اشاعت نہیں کی گئی۔ پیغمبر عرب بھی اگر صرف آخری نبی ہوتے تو اشاعت اسلام کے لئے نہ کسی سقیفہ بنی ساعدہ کا انعقاد ہوتا اور نہ خلافت کے لئے کسی ساز باز یا تگ ودو کی ضرورت ہوتی بلکہ اگر کسی سے کہا بھی جاتا تو وہ سوچنے لگتا کہ اس میں اتنی صلاحیت ہے بھی یا نہیں؟

لیکن اس کو عربوں کی بدنصیبی ہی کہنا چاہئے کہ آنخضرت نے اپنے بعد اسلام کے ساتھ ایک مملکت بھی چھوڑی تھی یعنی تبلیغ دین کے منصب کے ساتھ نظم حکومت سنبھالنے کی ذمہ داری بھی اور اسی ذمہ داری کا نام اقتدار تھا۔ آنخضرت کی آنکھ بند ہونے کے بعد جانشینی کے لئے جو کچھ کیا گیا، وہ صرف اقتدار کی خاطر۔ اگر بات صرف اشاعت دین کی ہوتی تو دینی اہلیت میں بڑی آسانی سے کوئی افضل ترین مسلمان منتخب کر لیا جاتا بلکہ بیک وقت کئی کئی اہل مسلمان اس سعادت کو حاصل کرتے رہتے۔ اس کے معنی صریحی طور پر یہ لئے جاسکتے ہیں کہ مسئلہ صرف نظم حکومت ہاتھ میں لینے کا یا اقتدار سنبھالنے کا تھا جس کے ساتھ دین کی تبلیغ وابستہ تھی۔

تاریخ کا فیصلہ ہے کہ حضرت ابوبکر انتخاب کے ذریعہ خلیفہ رسول بنا دئے گئے باالفاظ دیگر انہوں نے آج کی اصطلاح میں مسلمانوں کے ووٹ زیادہ حاصل کر لئے۔ یہ طریقہ انتخاب اگرچہ متنازعہ ہے مگر اس کو صحیح مان بھی لیا جائے تو مستقبل شاہد ہے کہ منتخب امیدوار کو اصول اسلام سے پوری

واقفیت نہ تھی اور نہ ان کی مجلس شوریٰ رموز دین کی ماہر تھی تب ہی تو باہر کے فقیہوں سے اسلامی رموز میں وقتاً فوقتاً مدد لی گئی اور حضرت عمرؓ کو اپنے فیصلوں کے سلسلے میں کہنا پڑا ''علی نہ ہوتے تو عمرؓ ہلاک ہو جاتا''

اس کے برخلاف علیؑ کے مختصر عہد کو دیکھا جائے تو علیؑ نے دینی مسئلوں میں کسی فقیہ سے کبھی کوئی مشورہ نہیں کیا کیونکہ انہیں پیغمبرؐ کے بعد اسلام پر خود پورا عبور حاصل تھا۔۔علیؑ کی یہ افضلیت کافی دنوں تک تسلیم کی جاتی رہی پھر آہستہ آہستہ فرمانروایان وقت سے علم وعرفان اور زہد وتقوی کی ہر روایت منسلک کر دی گئی۔ پہلے مسلمات پر اشتباہ کے پردے ڈالے گئے پھر حقائق کو یکسر چھپا دیا گیا۔

علیؑ سے قبل کے پچیس چال اس کے گواہ ہیں کہ نکات دینی سے ناواقفیت کی بنا پر قیاس وخود رائی کو عین اسلام بنایا گیا، مصالح ملکی اور مفاد ذاتی کی بنیادوں پر دین میں ترمیم وتنسیخ کی گئی اور علیؑ نے جب مملکت کی باگ ڈور ہاتھ میں لی تو اسلام اصول دین اور روایات عرب کا مرکب بن چکا تھا۔

سخن گسترانہ طور پر اگر یہ کہا جائے کہ عدلیہ کو اگر شروع ہی سے انتظامیہ سے الگ کر دیا جاتا تو حق وانصاف کا اتنا خون نہ ہوتا جیسا کہ بعد کے فرمانرواؤں نے کیا لیکن اس کو بھی شائد اس لئے روا نہیں رکھا گیا کہ علیؑ کی ذات گرامی مجموعہ صفات تھی اور عدل وشجاعت کی تمام روایتیں اس میں مرتکز تھیں یا جو بھی وجوہ ہوں۔ اسی لئے وقتی مدد تو لی گئی مگر کسی شعبے کے پورے اختیارات کبھی بھی سونپے نہیں گئے۔ شاید اس کا سبب احساس کمتری ہو یا ذاتی دشمنی کہ مجبوری کے سوا کسی حالت میں علیؑ کا احسان لینا گوارا نہیں کیا گیا۔ ایک بدیہی حقیقت یہ بھی تھی کہ اگر علیؑ کو اصطلاح فرمانروائی میں قاضی القضاۃ بنا دیا جاتا تو وہ عدالت اسلامیہ کی میزان پر خود حکومت اور ارباب حکومت کو تولتے اور اس میزان پر کون پورا اتر سکتا؟ اس کو سب جانتے تھے۔

دشمنی اور نفرت کی بات زیادہ قرین قیاس ہے کیونکہ حضرت عثمان کے قتل کے بعد ایک حلقے نے جیسے ہی علیؑ کی جانشینی کی خبر سنی وہ حواس باختہ ہو گیا۔ ایک بات توجہ کے قابل ہے کہ محمد بن ابی بکر کا نام تو اس لئے لیا جاتا ہے کہ علیؑ کو قتل میں ملوث کیا جا سکتا ورنہ اصل میں حضرت عثمانؓ کے قاتل طلحہؓ تھے جبکہ یہی طلحہ اور زبیر خلافت علیؑ کے محرک تھے اور بیعت کرنے والوں میں سرفہرست۔۔۔ حیرت تو اس حقیقت پر ہوتی ہے کہ عبدالرحمٰن ابن ملجم کا نام بھی ان لوگوں میں ہے جن سے علیؑ نے اتمام حجت کیا تھا اور اسی عبدالرحمٰن کی تلوار نے ایک دن مسجد کوفہ میں علیؑ کا سر شگافتہ کیا۔

علیؑ کی خلافت کو یوں تو ایک مخصوص گروہ نے اول دن سے ہی برداشت نہیں کیا لیکن پہلی جنگ ام المومنین سے ہوئی جس کے روح رواں طلحہ اور زبیر تھے۔ بعض لوگوں نے در پردہ عوام کو مخالفت

علیؑ پر ابھارا ان میں ایک نام ابوموسیٰ اشعری حاکم کوفہ کا بھی ہے جنہیں علیؑ نے مجاہدین بھیجنے کے لئے لکھا تھا مگر ابوموسیٰ نے کوئی خدمت انجام دینے کے بجائے لوگوں کو روکا اور ام المومنین کے لئے فضا ہموار کی۔

معاویہ بن ابی سفیان کا کردار جنگ جمل میں زیادہ واضح نہیں ہے مگر امیر المومنین حضرت علیؑ ابن ابی طالب کے مضبوط ترین مخالف کی حیثیت سے خلافت کے نسلی امیدوار کا خاموش رہنا ناممکن تھا لہٰذا عقلی طور پر یہ رائے قائم کرنا غلط نہ ہوگا کہ معاویہ نے اپنے وسیع ذرائع اور روابط سے ام المومنین کی مدد ضرور کی ہوگی کیونکہ جنگ کا ہر نتیجہ حاکم شام کے حق میں جاتا تھا۔

اگر ام المومنین کامیاب ہوتیں تو ان کو کچل دینا شام کی طاقت کے لئے معمولی کام تھا اور علیؑ کی کامیابی کی صورت میں خلافت مدینہ کا فوجی نقطہ نظر سے کچھ نہ کچھ مجروح ہونا یقینی تھا اور یہی ہوا کہ جمل میں کامیابی کے بعد علیؑ کے لشکر کی قوت کسی حد تک کمزور ہوگئی جس کو علیؑ نے محسوس کیا۔ چونکہ شام کی سازش اور فوجی تیاریوں سے وہ بے خبر نہ تھے جس پر نظر رکھنا ضروری تھا لہٰذا پیغمبرؐ اسلام کے حق پسند جرنیل نے فوری طور پر یہ فیصلہ کیا کہ مدینہ کے بجائے کوفہ کو اپنا مرکز قرار دے جہاں سے اسلام دشمن عناصر کی نقل وحرکت کا با آسانی جائزہ لیا جاسکے۔

حضرت معاویہ کے عزائم خلافت، وراثت آبائی سے کتنے مختلف تھے، کہا نہ جاسکتا لیکن ابوسفیان نے حضرت عثمان کے برسر اقتدار آنے کے بعد مدینہ کے بھرے بازار میں نام لئے بغیر علیؑ کو للکارا تھا کہ خلافت بنوامیہ کا حق تھی جو انہوں نے لے لی۔ گویا بنی امیہ نے دور عثمانی کے پہلے ہی دن سے خلافت کو اپنا حق سمجھ لیا تھا، عملی طور پر اسی یقین کا مظاہرہ حاکم شام کی روش سے سامنے آیا اور معاویہ نے علیؑ پر قتل عثمانؓ کا الزام لگا کر مسلمانوں کی خلافت چہارم کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا اور اس کی ابتداء دمشق میں بیٹھے بیٹھے ام المومنین کے ہاتھوں کرا دی۔

اس کو حالات کی ستم ظریفی کے سوا کیا کہا جائے کہ جن لوگوں نے حضرت علیؑ کو مجبور کیا تھا اور خلافت کے لئے آپ کو بے تعلقی کے دائرے سے نکال لائے تھے، وہ بھی ہوا کا رخ دیکھ کر صف مخالف میں جا کھڑے ہوئے۔

علیؑ نے پیغمبرؐ برحق کے بعد حامی و مددگار رکھتے ہوئے بھی مسلمانوں پر تلوار نہیں اٹھائی تھی کیونکہ وہ جنگ اقتدار حاصل کرنے کے لئے ہوتی اور علیؑ ختم المرسلین کے منصوص من اللہ خلیفہ تھے، انہیں ہر ہادی مطلق کی طرح تخت وتاج کی ضرورت نہ تھی۔ ان کا منصب تو مسلمانوں کو حتی الامکان غلط روی سے بچانا تھا، اس فریضہ کو اپنے طور پر وہ پورا کر رہے تھے لیکن اب بات آ گئی تھی اسلام کی آن کی، ام

المومنین کے لئے تو انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ وہ مفسدوں کے بہکانے میں آ گئی ہیں لہٰذا انہیں اپنی جگہ پہنچا کر وہ معاویہ کی طرف متوجہ ہو گئے۔

رسولؐ کے جانشین ازلی کو احساس تھا کہ معاویہ ابوسفیان کے سعادت مند وارث ہیں۔ انہوں نے قصاص عثمانؓ کا نعرہ صرف حصول خلافت کے لئے لگایا ہے اور انہیں اپنی فوجی طاقت پر اعتماد ہے۔ علیؑ دیکھ رہے تھے کہ سازش کا جال چہار جانب بچھایا جا چکا ہے۔ خود ان کے خیر خواہوں کو بھی توڑا جا چکا ہے۔ ان کی عسکری قوت کمزور پڑ چکی ہے پھر بھی وہ پورے تحمل اور اعتماد کے ساتھ حالات کے مدمقابل سینہ تان کر کھڑے ہو گئے۔

عرب کی ڈیڑھ ہزار سال پہلے کی سیاست آج کی سیاست سے زیادہ مختلف نہ تھی بلکہ ایک طرح پر اسے آج کی سیاست کا نقش اول کہا جا سکتا ہے۔ خدا کے آخری نبی نے اس کو ایک موڑ دیا تھا کہ ملک خدا کا اور حکم بادشاہ کا بشرطیکہ وہ خدا کا متعین کردہ ہو لیکن نبوت آپ کے بعد ختم ہو گئی تھی اور علیؑ کو منصوص من اللہ مانا نہیں گیا تھا۔ فیصلہ بہت پہلے کیا جا چکا تھا کہ کیا کرنا ہے؟

منصوبہ یہ تھا کہ دین کی دفعات میں اضافہ کا جواز پیدا کر کے صحرائی انداز سیاست کو مشرف بہ اسلام کر لیا جائے۔ یہ سب کچھ وہی تھا جو زائد سے زائد پرچم اسلام کے زیر سایہ ابوسفیان سوچ سکتا تھا۔ دوسرے الفاظ میں ابوسفیان کی خواہشات کی تکمیل دوسرے ہاتھوں سے ہو رہی تھی جس کا نتیجہ بالآخر یہی نکلا کہ ابوسفیان کی زبان میں اس کے بچّے خلافت سے کھیلنے لگے۔

سیاست عرب کے سلسلے میں ایک صراحت اور بھی ضروری ہے کہ قبائلی نظام میں مختلف خاندانوں کے افراد فوجی دستوں کی حیثیت رکھتے تھے اور پورا قبیلہ کسی لشکر سے تعبیر کیا جاتا ـ ـ ـ ـ ـ اسلام کے دور میں بھی یہی نظام برقرار رہا۔ ہادی مطلق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پرچم اسلام جس کے ہاتھ میں دیتے، وہ مختلف قبیلوں کی افواج کا امیر سمجھا جاتا تھا۔ اس کو قدرے تبدیلی کے ساتھ ادوار خلافت میں بھی مروج رکھا گیا اور اسی نظام پر اب بھی ہر دو جانب عمل کیا جا رہا تھا۔

ابتداً شہداء اور مجاہدین کا حق اجر ایمانی تھا جس میں مال غنیمت کا حق اولیٰ بھی شامل تھا پھر مال غنیمت کی اہمیت بڑھتی رہی جس میں کچھ دنوں بعد بیت المال کا اضافہ ہو گیا تھا۔ جذبہ اسلام بھی اس کے دوش بدوش تھا۔

وقت کی تدریجی ترقی میں فتوحات کے تسلسل نے مال غنیمت کی کشش بڑھا دی اور خلافت کے دوسرے عہد میں قیصر و کسریٰ کے لشکروں کی شکست نے تو صحرائی عربوں کو جو کچھ ملا، وہ خواب میں

بھی اس کا تصور نہ کر سکتے۔ اسی لئے حضرت عمرؓ کہا کرتے تھے کہ عرب بدووں کی جبلت سے اسلام کی ترقی میں خام مواد میسر آیا۔

حضرت علیؑ اور حاکم شام دونوں کے لشکروں میں بحالت موجودہ نظم ونسق کا انداز مشترک تھا پھر بھی فرق تھا تو عرب وشام کی زرخیزی کا اور علیؑ ومعاویہ کے نظریات کا۔ علیؑ عرب کے نجات دہندہ کے جانشین تھے اور معاویہ بنی امیہ کے فرزندار جمند جن کا آبائی تعلق زمانہ جاہلیت میں بھی شام سے رہا تھا اور ابوسفیان کے کتنے ہی جاننے والے دمشق میں پہلے سے موجود تھے۔

توازن وتقابل میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ علیؑ ومعاویہؓ میں زمین وآسمان کا فرق تھا۔ علیؑ زمین پر بوئے جانے والے تخم کا پھل آسمان پر ملنے کی بشارت دیتے تھے اور معاویہ تخم بونے کے ساتھ ہی سوگنا اجر دے دینے کے قائل تھے۔ سچ پوچھا جائے تو علیؑ دین تھے اور دین خالص اور معاویہ دنیا تھے اور دنیائے محض، کہنے کو مسلمان مگر دولت ان کا دین اور اقتدار ان کا ایمان تھا۔ اسی لئے خلافت علیؑ کی خبر پاتے ہی اطراف وجوانب میں ان کے قاصد دوڑنے لگے، خزانوں کے منہ کھل گئے اور حرص وہوس کے دیوانے جوق در جوق قتل عثمانؓ کا قصاص لینے کے لئے جمع ہونے لگے یعنی خلافت برحق کو پاش پاش کرنے کی خاطر ختم المرسلین کے بدترین دشمن کے پرچم کے نیچے متحد ہو گئے۔

حضرت عثمانؓ کے خون آلود کرتے اور نائلہ کی کٹی ہوئی انگلیوں کی نمائش گلی کوچوں میں کی جانے لگی۔ عثمانؓ کی مظلومیت کی غلط بیانی کے نتیجے میں بعض وہ لوگ بھی متاثر ہو گئے جنہوں نے بڑھ چڑھ کر علیؑ کی بیعت کی تھی۔۔۔۔۔۔ سعد بن ابی وقاص، عبداللہ ابن عمر، سعید ابن زید اور ابوموسیٰ اشعری وغیرہ کے ساتھ عمر ابن عاص کا نام بھی تاریخ میں ملتا ہے۔ جنہوں نے نمایاں لوگوں کے ساتھ بیعت علیؑ کے لئے ہاتھ بڑھائے تھے۔

مخالفت کا دھارا اتنی تیزی سے دوڑ رہا تھا کہ شام میں ہر طرف فوجیں ہی فوجیں نظر آتی تھیں۔ ایسے میں معاویہ نے خود خلافت برحق کے خلاف اپنی خلافت کا اعلان کر دیا گویا مسلمانوں کے دو چھوٹے بڑے گروہوں نے برش شمشیر کو حصول خلافت کا معیار بنا دیا مگر حقیقتاً ایک ان میں سے خلیفہ تھا اور دوسرا خلافت کو طاقت سے حاصل کرنے کی چیز قرار دے رہا تھا اور اعلان کر رہا تھا کہ خلافت کا حقدار صرف وہ ہے جس کے بازووں میں قوت اور نبرد آزمائی کا دم خم ہو۔

اس اعلان کے پس پردہ پیغمبری کو صرف فرمانروائی سمجھ لینے کا اقرار چھپا ہوا تھا۔ جس کو وفات سرور کائنات کے بعد سے آج تک الفاظ کا جامہ نہیں پہنایا گیا تھا۔۔۔ آج پہلی مرتبہ نوک شمشیر سے

اسلام کی قسمت لکھنے کا اعتراف کیا گیا تھا!

شام کا معرکہ خلافت

بلاشبہ مسلمانوں کی پہلی باہمی لڑائی جمل میں ہوئی تھی مگر درحقیقت یہ لڑائی ماں بیٹے کا آپس کا ٹکراؤ تھا۔ ماں کسی غلط فہمی کی بناء پر بیٹے کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی تھیں اور طلحہ وزبیر کا آلہ کار بن گئی تھیں جس کے لئے کسی مزید تاریخی شہادت کی ضرورت نہیں۔ دونوں بھائیوں کے درمیان سے ہٹ جانے کے بعد ام المومنین کو اپنی جذباتی جلد بازی کا احساس ہوا تو وہ شرمندہ ہو کر گھر میں بیٹھ رہیں لیکن اب شام کا اموی سیاست کار اپنے آبائی منصب کو پورا کرنے کے لئے میدان میں اتر آیا تھا اور اس سلطنت پر بنی امیہ کا پرچم لہرانا چاہتا تھا جو اس کی نظر میں عرب کے ایک مایہ ناز بیٹے نے بنائی تھی اور اس کے جانشینوں نے جس کے ڈانڈے افریقہ کی شمالی سرحدوں سے ملا دیئے تھے۔

بنی امیہ میں یقیناً بادشاہت کی صلاحیت تھی، بشرطیکہ وہ اسلام کے نام پر نہ ہوتی!

مورخین نے بالاتفاق شام کے ستر ہزار منبروں سے علیؑ پر تبرے کا اعتراف کیا ہے ایک اندازے کے مطابق وہ قتل عثمانؓ کے بعد خلافت علیؑ کے آغاز سے شروع ہوا تھا جس نے بتدریج شدت اختیار کر لی اور شام کی فوجی تیاریوں کے ساتھ آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کردار کشی بتدریج بڑھتی چلی گئی۔۔۔۔۔۔ اس طرح یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ معاویہ نے اپنے علم کے نیچے دشمنان اہل بیت کو جمع کر لیا تھا۔ اس وقت ہونے والی جنگ میں جو دو فریق تھے، ان میں سے ایک خالصتاً پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پیرو تھا، دوسرا شہنشاہ عرب کے جانشین کا جس نے اپنے مسلک سے دین کی خود ساختہ روایات وابستہ کر لی تھیں۔ کہنے دونوں اپنے کو خلیفہ تھے مگر درحقیقت ایک خلیفہ برحق تھا دوسرا خلیفہ ناحق۔

امیر المومنین شام میں فوجوں کی نقل وحرکت اور معاویہ کے عزائم سے بے خبر نہ تھے۔ ان کا لشکر جنگ جمل کا تھکا ہارا تھا لیکن رسول اللہ کے برگزیدہ صحابی جنہوں نے اول دن سے جانشین برحق کا ساتھ نہ چھوڑا تھا، سب کے سب جمل کے بعد کوفہ منتقل ہو گئے تھے اور ایک بڑی تعداد جو آج بھی آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہم نوا تھی۔ ان سب کی تقویت پر علیؑ اسلام کی آبرو بچانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ عمار یاسر، حذیفہ الیمانی، ابوایوب انصاری، خالد بن سعید، خزیمہ ذوالشہادتین، قیس بن سعد، ہاشم بن عتبہ، بریدین حصین اسلمی، عبداللہ ابن بدیل، مالک ابن تیہان، مالک اشتر وغیرہ کی فہرست گو

بہت طویل نہیں ہے مگر یہ سب ایسے دیوانہ اسلام تھے کہ اگر تعداد اتنی بھی نہ ہوتی تب بھی امیر المومنین انہیں شام کی بھیڑوں کے لئے کافی سمجھتے لیکن داعیان حق و باطل کے مقابلے کا شہرا ہوا تو مختلف گوشوں میں پڑے ہوئے دین محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سرفروش پرچم علیؑ کے نیچے سمٹ آئے جن میں اویس قرنی کے سے بزرگ بھی تھے جن کے ایمان کی شہادت خود ختمی مرتبت نے دی تھی۔ان کا وجود بھی علیؑ کے برحق ہونے کی ضمانت تھا۔ آگے چل کر اس تعداد میں بعض ایسے لوگوں کا اضافہ ہوا جو آئے تھے غلط بیانی سے متاثر ہو کر معاویہ کی طرف سے علیؑ سے لڑنے کے لئے مگر حقائق نے آنکھیں کھول دیں تو انہوں نے خود معاویہ کے خلاف تلوار بے نیام کر لی۔ ایسے افراد میں عقیل ابن مالک کا نام ایک عنوان جلی ہے۔۔۔ آنکھیں کھول کر عرب کے دینی ماحول کو دیکھا جائے تو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیٹی کے نام پر جان دینے والے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد اس سے بہت زائد تھے جو سقیفہ کے زمین و آسمان تہہ و بالا کر دیتے بشرطیکہ علیؑ کی جنبش ابرو کا اشارہ بھی پا جاتے۔

مخبر صادق نے ان حالات سے مسلمانوں کو باخبر کر دیا تھا اور اپنا فیصلہ بھی سنا دیا تھا۔

''جب تم کسی شخص پر باہم متفق ہو چکے ہو اور تمہارے پاس کوئی اور آئے جو تمہارے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کی کوشش کرے اور آپس میں پھوٹ ڈلوانا چاہے تو اس کو قتل کر دو''۔

پھر اس کی صراحت ایک دوسری حدیث میں کی ہے

''اگر دو دعویدار خلافت ہوں اور تم یکے بعد دیگرے دونوں کی بیعت کر چکے ہو تو جس کی بیعت بعد میں کی ہو اس کو قتل کر دو (کیونکہ پہلے خلیفہ کے ہوتے ہوئے دوسرے کی بیعت باطل ہے)''(۷)

فیصلہ خود اہل نظر کے ہاتھ ہے کہ گردن زدنی کون تھا مگر یہ احادیث شاید اس وقت تک منظر عام پر نہ آئی ہوں پھر بھی خواص تو واقف ضرور ہوں گے۔ کہا جا سکتا ہے کہ سنہرے سکوں کی چمک دمک نے لوگوں کی چشم بصیرت میں چکا چوند پیدا کر دی تھی لہٰذا دنیا دین پر غالب آ گئی۔ ایک بات یہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ شاطر بنی امیہ کی فراست نے ان سے قوت فیصلہ ہی چھین لی ہو اور علیؑ دشمنی پر وہ جذبہ ایمان کو قربان کرنے پر تیار ہو گئے ہوں۔

مسلمانوں کے اس گروہ میں شہرہ آفاق اموی سیاست دان کا نام حضرت عمرؓ کے بعد لیا جاتا

ہے مگر یہ فیصلہ غور طلب ہے۔ درحقیقت مسلمانوں کے پورے دور میں کوئی حضرت عمرؓ کا مدمقابل نہیں تھا اسی لئے حضرت علیؑ نے امام وقت کے منصب سے اکثر و بیشتر مفاد دینی کی خاطر ان سے تعاون کیا تھا مگر جہاں ان کی روش میں اسلام کے بجائے ذاتیات کو دخیل پایا تھا وہاں ہم نوائی نہیں کی بلکہ کھلی ہوئی مخالفت کی تھی تاہم اس حد تک نہیں کہ جمعیت مسلمین میں کوئی طوفان اٹھ کھڑا ہوتا اور یوں بھی حضرت عمرؓ کے کردار میں حدود دینی سے تجاوز کرنے کے ساتھ ساتھ مفاد اسلامی کے پہلو بھی نکلتے تھے۔ اس کے برعکس معاویہ بن ابوسفیان میں پیغمبرؐ عرب کے بجائے ابوسفیان غالب تھا لہٰذا دونوں کا کوئی توازن تقابل ممکن ہی نہیں ہے۔ حاکم شام کا ایک سرسری جائزہ لیا جائے تو۔

''وہ پہلا شخص تھا جو بیٹھ کر وعظ کرتا تھا، پہلا امیر جس نے ذاتی خدمتگاری کے لئے مخنث مقرر کیئے، پہلا رئیس جو اپنے مصاحبوں سے کھلم کھلا ہنسی ٹھٹھا کرتا، ہوشیار اور کنجوس مگر ضرورت کے وقت بڑا فیاض، بظاہر مذہبی مراسم کا پکا مگر اپنی حرص و آز کی تجاویز کی تکمیل کے وقت کسی شخص یا خدائی حکم کی پرواہ نہ کرنے والا''۔ (۸)

حضرت علی سے معاویہ کی مخالفت یوں تو نسلی تھی جو سلف سے چلی آ رہی تھی اور اب تو ایک حیلہ بھی مل گیا تھا بنی امیہ کی ایک سربرآوردہ شخصیت کے قتل کا لہٰذا ابوسفیان کے بیٹے نے اعلان جنگ کر دیا اور لڑائی کو اسلامی رنگ دینے کے لئے اپنے خلیفہ ہونے کا دعویٰ بھی کر دیا یعنی جنگ کو حصول اقتدار کے بجائے دو خلیفاؤں کے نبرد آزما ہونے کا جامہ پہنا دیا۔۔۔۔اب صورت حال یہ تھی کہ اہل مدینہ نے علیؑ کو خلیفہ بنایا تھا اور اہل شام نے معاویہ کو۔

اکابرین اسلام اس چال کو سمجھتے تھے اور شرع نے اس کے لئے جو حکم دیا تھا، اس سے بھی واقف تھے لیکن انہوں نے زبانیں بند رکھیں اور جب جذبہ ایمان پر مصلحت کے پردے پڑ جاتے ہیں تو یہی ہوتا ہے۔

شام کی فوجی تیاریاں پہلے ہی عروج پر پہنچ چکی تھیں اور جاسوسوں کا جال کوفے تک بچھایا جا چکا تھا اب فوجی نقطہ نظر سے سب سے اہم کام یہ کیا گیا کہ خلیفۃ المسلمین کے لشکر میں غدار شامل کر دئے گئے جو ابوسفیان کا بہت پرانا حربہ تھا جن کو وہ غزوات میں آزما چکا تھا۔ ممکن ہے بیٹے کو موروثی تربیت میں اس کے نکات بھی بتائے گئے ہوں۔ بہرحال بات وراثت کی ہو یا خود شام کے مبینہ امیر مسلمین کی فراست کی کہ کوفے کے لشکر میں ایک قابل ذکر تعداد ایسے مجاہدین کی داخل ہوگئی جو لڑنے آئے تھے شام کے خلاف مگر ان کا کام تھا علیؑ کے لشکر میں پھوٹ ڈلوانا اور معاویہ کی عسکری طاقت کی

ہیبت لشکریوں کے دلوں میں بٹھانا۔ان پر مستزاد اور سب سے خطرناک یہ حکمت عملی تھی کہ علیؑ کی فوج کے بعض اکابر کو کسی انجامی قیمت پر خرید لیا گیا تھا۔نظیر کے طور پر دو نام لئے جاسکتے ہیں۔ایک اشعث بن قیس کا دوسرے ابوموسیٰ الاشعریٰ کا۔

اشعث ابن قیس کا شمار حضر موت کے ان سرداران قبیلہ میں ہے جنہوں نے حضرت ابوبکر کو رقوم زکواۃ دینے سے انکار کر دیا تھا اور کہا تھا:-

''مجھے یقین ہے کہ اہل عرب ابوبکر کے خاندان یعنی تیم بن مرہ کی اطاعت اختیار نہ کریں گے اور بطحا کے سرداروں یعنی بنی ہاشم کا ساتھ نہ چھوڑیں گے کیونکہ یہی لوگ معدن رسالت اور لائق امامت ہیں''۔

تاریخ اعثم کوفی کے اس حوالے کے بعد اسلام کی انسان ساز خلافت کے لئے اشعث کے تاثرات محتاج ثبوت نہیں رہ جاتے لیکن حضرت ابوبکر نے بیٹی دے کر اشعث سے رشتہ قائم کرلیا اور اسامہ بن زید کی طرح اشعث کی مخالفت کو کم کر دیا پھر بھی اشعث آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہوا خواہ بنا رہا اور پہلی سی گرم جوشی باقی نہ رہنے کے باوجود علیؑ کی خدمت میں اس کی رسمی حاضری جاری رہی۔شاید وہ دین و دنیا کی کشمکش میں مبتلا تھا تب ہی تو اس منزل پر آکر معاویہ کا آلہ کار بن گیا تھا۔

دوسری شخصیت ابوموسیٰ الاشعری کی تھی۔رسولؐ کا نمایاں صحابی شروع ہی سے خلافت کا ہم نوا تھا مگر خانوادہ رسالت سے اس نے اپنے رسمی تعلقات باقی رکھے تھے۔۔۔حضرت ابوبکر اپنے کو خلیفہ رسولؐ کہتے تھے۔یہ ابوموسیٰ الاشعری تھے جنہوں نے پہلے پہل حضرت عمر کو امیر المومنین کہا تھا۔اس کے بعد مروان الحمار تک ہر خلیفہ امیر المومنین کہہ کر مخاطب کیا گیا۔

ابوموسیٰ جنگ جمل کے موقع پر حاکم کوفہ تھے مگر انہوں نے در پردہ ام المومنین کی مدد کے لئے لوگوں کو ابھارا تھا۔ممکن ہے معاویہ سے ان کا رابطہ قائم ہوگیا ہو جو اس موقع پر کھل کر سامنے آیا۔

اسی طرح کے اور بھی بہت سے لوگ تھے جن میں صحیح بخاری کے راوی خالد بن معمر کا نام بھی لیا جاتا ہے مگر ان میں سے کوئی معرکہ صفین سے قبل خلیفہ چہارم کے فوجیوں کو بغاوت پر آمادہ نہ کر سکا کیونکہ گئی گزری حالت میں بھی بنی ہاشم کے علاوہ مالک اشتر کے سے شجاعان روزگار موجود تھے جن کی دہشت سے دلوں میں کپکپی پیدا ہو جاتی تھی لہٰذا یہ سب وقت کا انتظار کرتے رہے اور مالک ہی پر موقوف نہیں، قیس بن سعد اور ذوالشہادتین، کتنے ہی وارثان شمشیر تھے، رزمگاہ کی تاریخ میں جن کے نام تاباں ہیں۔

سیاست کا ایک تیسرا حربہ جو شام کے فرمانروا نے استعمال کیا تھا وہ علیؑ سے زائد خود اسلام کے لئے زہر قاتل تھا۔ حضرت عثمان کے مظلومانہ قتل کی مشتہری اور علیؑ پر سب و شتم کے ساتھ ساتھ یہ پروپیگنڈہ بھی کیا گیا تھا کہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کے بعد کوئی بھی لائق خلافت نہ تھا۔ عثمانؓ اور علیؑ سے دین پیغمبر کو جو نقصان پہنچا اس کی تلافی ممکن ہی نہیں ہے۔ ذہنوں میں یہ خیال بٹھا کر بعض لوگ امیر المومنین کے لشکر میں بھی بھیجے گئے تھے۔ اسی لئے خارجی مختلف العقائد لوگوں پر مشتمل تھے۔ حضرت علی اور آپ کے خیر خواہ ان کارروائیوں سے بے خبر تھے یا کسی کو بھنک ملی بھی ہو تو اس نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی کیونکہ علیؑ کے فداکار اپنے راستے میں آنے والے پہاڑوں سے بھی ٹکرا جانے کو تیار تھے تو ایسی باتوں کو خاطر میں کیا لاتے اور ایسے لوگ کھل کر سامنے بھی نہیں آئے۔

علیؑ منصب خلافت کے ساتھ ساتھ ایک فرقے کی نظر میں منصوص من اللہ امام تھے جنہیں بہر طور بہکے ہوئے لوگوں کو صحیح راستہ دکھانا تھا۔ حالات حد سے زائد بگڑ چکے تھے پھر بھی آپ نے آداب اسلام کو ملحوظ رکھا اور فرض امامت کو پورا کیا۔ آپ نے معاویہ کو کئی خطوط لکھے مگر ان کے جوابات سخت سے سخت تر ملتے رہے۔ بمجبوری آپ کو میدان داری کا فیصلہ کرنا پڑا۔ کوفے میں آپ نے ابومسعود انصاری کو اپنا قائم مقام بنایا اور شوال ۳۶ھ میں تقریباً اسی ہزار کا لشکر شام کی طرف پیش قدمی کرنے لگا جس میں خارجیت کے علم بردار بھی تھے۔

شام کی افواج کا تخمینہ مختلف مورخین نے مختلف کیا ہے مگر اس کی تعداد امیر المومنین کے لشکر کے برابر یا کچھ زائد تھی۔ معاویہ نے خبر پاتے ہی تیزی سے صفین کی طرف بڑھ کر نہر پر قبضہ کر لیا تاکہ اسلام کی فوجوں پر پانی بند ہو جائے اور وہ تشنگی کی شدت میں لڑنے کے قابل نہ رہیں۔ قدرت کی طرف سے یہ ایک اشارہ تھا مستقبل کی کربلا کا، ایک انتباہ تھا مسلمانوں کے لئے اس نسلی کردار سے خبرداری کا! حضرت علیؑ کے سرفروشوں کا ایک دستہ طوفان کی طرح چلا اور شامیوں کو پیچھے ڈھیل کر چشمے کا محافظ بن گیا مگر امیر المومنین کی ہدایت پر پانی لے کر واپس ہو گیا۔ پانی فطرت فیاض کا عطیہ تھا۔ انسان خواہ دوست ہو یا دشمن، رسول کا جانشین اس کو پانی سے محروم تو نہ رکھ سکتا تھا۔

لڑائی ایک طرح پر شروع ہو چکی تھی پھر بھی امیر المومنین مسلمانوں کے باہم کشت و خون کو روا نہ رکھتے تھے۔ آپ نے پھر صلح کی پیش کش کی مگر جگایا اس کو جاتا ہے جو سو رہا ہو۔ حاکم شام نے جو قدم اٹھایا تھا، وہ سوچ سمجھ کر اور صرف تخت خلافت کے لئے۔ یہ صورت حال اگر علیؑ کے خلیفہ بننے سے قبل

پیش آئی ہوتی تو شاید وہ ماضی کی طرح ذوالفقار کو بے نیام نہ کرتے لیکن اب ہر دفاع فریضہ منصب بن گیا تھا پھر بھی آپ نے اتمام حجت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی مگر ہر سعی لاحاصل اور ہر گفت وشنید بے نتیجہ ثابت ہوئی اور آخر چھوٹے چھوٹے معرکوں کے بعد وہ دن آ ہی گیا کہ دونوں طرف کے لشکر آمنے سامنے صف آرا ہو گئے۔

خلیفہ برحق نے ایک بار پھر دین محمد کا واسطہ دیا اور ایک شخص کو قرآن پاک لے کر میدان میں بھیج دیا۔ گویا ثالث بنایا اللہ کے کلام کو لیکن نتیجہ وہی نکلا جو جمل میں نکلا تھا۔ قرآن بردار مجاہد تیروں کا نشانہ بن کر درجہ شہادت پر فائز ہو گیا۔ آخر علیؑ نے پورے جاہ وجلال کے ساتھ گھوڑے کو ایڑ دی اور شام کی بھیڑوں پر حملہ کر دیا۔

علی کی ذوالفقار پچیس سال بعد نیام سے نکلی تھی مگر اس کی تیزی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

آسمان کے فرشتوں کی ایک برق سی کوند کر چمکی اور سر اچھل اچھل کر گرنے لگے۔ محسوس یہ ہوتا تھا کہ بے دینوں کا خون چاٹنے میں ہوس ذوالفقار کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ شام کو جنگ بند ہونے تک شام کے لشکریوں کی اتنی بڑی تعداد کٹ گئی کہ شمار ممکن نہ رہا اور ایک ہفتے کی لڑائی میں تو یہ حال ہو گیا کہ جو بچ گئے تھے ان میں کی اکثریت زخمی تھی۔ فوجوں کی تازہ کمک اندرون شام سے جاری تھی اس اضافہ سے خستہ حال لشکر میں پھر جان پڑ گئی اور اب کی معاویہ نے فیصلہ کن جنگ کا عزم کر لیا۔

کہا جاتا ہے کہ آخری لڑائی سے قبل علیؑ نے دوبدو اور روبرو باہمی جنگ کے لئے معاویہ کو سر میدان للکارا تھا مگر جواباً خود اپنی ہی آواز کی بازگشت سنی تھی۔ اتمام حجت کے لئے آپ نے ایک بار پھر اس بات کو دہرایا لیکن جواب تیروں سے ملا آخر دونوں فوجیں ایک دوسرے سے متصادم ہو گئیں۔

علیؑ کے انفرادی مقابلے کی دعوت اگر قبول کر لی جاتی تو ہزاروں مسلمان قتل ہونے سے بچ جاتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وہ برگزیدہ صحابی جن کو تبرک اسلام کے مترادف قرار دیا جا سکتا ہے کچھ دن اور فیض رسانی کے لئے زندہ رہ جاتے، اویس قرنی، عمار یاسر ذوالشہادتین وغیرہ مگر مجبوری معاویہ کے لئے بھی تھی وہ خندق وخیبر میں علیؑ کی تلوار کو بجلی کی طرح کوندتے دیکھ چکے تھے جان بوجھ کر اور جیتے جی اس کی لپیٹ میں کیونکر آ جاتے لہٰذا انہوں نے سنی ان سنی کر دی اور کوئی دوسرا لشکر شام میں ایسا تھا نہیں جو علیؑ کی مبارزطلبی کا جواب دیتا!

تاریخ اسلام نے چند ناموں کو معیار شجاعت قرار دیا ہے، ان میں خالد بن ولید، ابوعبیدہ الجراح کے ساتھ عمر عاص کا نام بھی لیا ہے۔ اس موقع پر عمر عاص موجود تھا۔ معاویہ کی ہمت نے ساتھ

نہیں دیا تو عمر عاص خود میدان میں آجاتا، علیؑ سے نہیں لڑسکتا تھا تو کہہ دیتا کہ وہ علیؑ کے بجائے مالک اشتر یا قیس ابن سعد یا فلاں سے لڑسکتا ہے مگر دھوکے سے لڑنے والے سرمیدان کیونکر نبرد آزما ہوتے، ہونٹوں کو سیے ہوئے علیؑ کی طرف دیکھتے رہے اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا شیر مقابل نہ پاکر معاویہ کی طرف حقارت سے دیکھتا ہوا واپس ہوگیا۔

سخن گسترانہ طور پر اسی جنگ کا ایک واقعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ایک لڑائی میں عمر عاص علیؑ کے سامنے پڑ گیا تھا۔ بھاگنے کا موقع نہ پاکر لڑنے لگا مگر اپنے کو علیؑ کی تلوار کے سامنے پاکر خود کو گھوڑے سے گرادیا۔ علی کی تلوار اس پر پڑنے ہی والی تھی کہ وہ لوٹ لگا کر ننگا ہوگیا۔ علی نے لاحول ولاقوۃ کہہ کر منہ پھیر لیا اور ابن العاص دوسری لوٹ لگا کر زد سے باہر نکل گیا۔ اس پر معاویہ اکثر اس کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔

''تو نے علی کو اپنی کون دکھائی''!

بہادری کے ایسے ہی کردار مسلمانوں کی رزم گاہ کا سرمایہ ہیں اور ان کی قصیدہ خوانی کا فیصلہ کرلیا گیا ہے لہٰذا اس کا کوئی علاج نہیں تاہم ان میں بعض خصوصیات ایسی ضرور تھیں جن کی اجازت اسلام نہیں دیتا لیکن آج کی دنیاوی اور بین الاقوامی سیاسیات میں جائز اور مستعمل ہیں، جھوٹی مشتہری، غلط کردار کشی، فریب، سازش، مصلحت اور مقصد براری کے لئے قتل انسانی اور اسی طرح کی دوسری تمام باتیں جن کو بنی امیہ کے سیاست کار نے دین کے نام پر روا رکھا تھا۔ حالانکہ صحیح بخاری میں ارشاد پیغمبرؐ ہے۔

''مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اس کے ساتھ جنگ کرنا کفر ہے''

فیصلہ مسلمان خود کرلیں کہ صفین کے دو فریقوں میں مسلمان کو گالی کس نے دلوائی، مسلمان بھی کیسا؟ جنگ خندق کا مسلمہ کل ایمان۔۔۔ یہ جنگ مدینے کے خلیفہ برحق پر کس نے مسلط کی؟ شام کے نام نہاد خلیفہ نے!

معاویہ نے جنگ کے لئے جو التزامات کیے تھے اور علیؑ کے مقابلے میں کامیابی کی جو توقعات کی تھیں، ان میں مایوسی ہوئی تھی، تو ناکامی کی صورت میں ایک منصوبہ اور انہوں نے بنا رکھا تھا اس کی آزمائش ابھی باقی تھی لہٰذا لڑائی کے دوران اپنے بھائی عتبہ بن ابوسفیان کے ذریعہ اشعث بن قیس اور خالد بن معمر سے پھر رابطہ قائم کیا اور اثباتی جواب پاکر ایک اطمینان کا سانس لیا پھر اسی تقویت پر ایک آخری لڑائی کا آغاز کر دیا۔

اس دن کی لڑائی کا نتیجہ بھی سابقہ جنگوں سے مختلف نہ نکلا مگر اندھیرا ہونے پر نہ آج شامی فوجوں نے پسپائی اختیار کی اور نہ معاویہ کی طرف سے جنگ بند ہونے کا اعلان کیا گیا۔

اسلامی مورخین نے لکھا ہے کہ جنگ خندق کے دنوں رسولؐ کی کئی وقت کی نمازیں قضا ہوگئی تھیں مگر نائب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کوئی نماز قضا نہیں کی بلکہ اگلی صفوں پر جنگ کا پورا بار ڈال کر پیچھے والوں نے نماز ادا کی پھر پچھلی صفوں نے اگلی صفوں کی جگہ لے لی اس میں کئی سر برآوردہ صحابیوں نے شرف شہادت حاصل کیا۔ اس کے بعد تلواروں کی جھنکار تیز ہوگئی اور شہرہ آفاق لیلۃ الحریر نے وہ منظر دیکھا جو خندق وخیبر میں ابوسفیان کی نظروں سے بھی نہ گزرا تھا کیونکہ علیؑ کے فداکاروں میں آج کوئی بھی مرنے سے قبل پیٹھ دکھانے والا نہ تھا۔

مدینے کے خلیفۃ المسلمین کے لشکر کی اکثریت سروں سے بے نیاز ہوکر لڑ رہی تھی، جذبہ اسلام کا حق ادا کرنے کے لئے اور غازی یا شہید کے مرتبے پر فائز ہونے کی خاطر۔ اس لئے شام کے بزدلوں میں جسے زد سے ہٹ جانے کا موقع نہ ملتا، وہ ایک خوفناک چیخ کے ساتھ زمین پر گر جاتا اور مالک اشتر کے سے شجاع روزگار تو دورویہ لاشوں کی قطار بناتے بڑھتے ہی چلے جارہے تھے یہاں تک کہ وہ صبح ہوتے ہوتے معاویہ کے خیمے کے قریب پہنچ گئے جہاں شام کے آزمودہ تیغ زنوں نے راستہ روکا مگر مالک کے سرفروشوں نے تلوار کے وہ جوہر دکھائے کہ کشتوں کے انبار لگادیئے اور زمین کو خون سے لالہ زار کردیا۔

علیؑ کی ذوالفقار آج گویا خود بخود بلند ہوکر کوندرہی تھی مگر آپ مدمقابل کا نسلی شجرہ دیکھ رہے تھے کہ مستقبل میں کوئی مومن پیدا ہونے والا تو نہیں ہے؟ اس لئے ذوالفقار کی رفتار میں فرق پیدا ہورہا تھا پھر بھی علی ومالک کے مقتولین کی تعداد میں ایک آہنگ تھا لہٰذا مالک کو جنگ صفین کا ہیرو کہا جاسکتا ہے۔ یہ شرف بہر طور متابعت مرشد کی زندہ مثال تھا۔

علی کے لشکری بلاشبہ قتل ہوئے تھے اور ان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایسے برگزیدہ صحابی بھی تھے، زمانہ جن کی نظیر پھر پیش نہ کرسکا۔ اویس قرنی جنہوں نے یہ سن کر کہ آنحضرت کا ایک دانت احد میں شہید ہوگیا تھا از خود اپنے تمام دانت توڑ لئے تھے اور جنہیں حضور نے حضرت عمر کے ذریعہ سلام کہلوایا تھا۔ ہاشم بن عتبہ! سعد بن ابی وقاص کے بھتیجے۔ یزید بن حصین اسلمی جن کو دڑوں سے مار مار کر زبردستی بیعت لی گئی تھی مگر آپ نے عمر بھر آل رسول کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ مالک ابن تیہان علیؑ کے پسینے پر اپنا خون بہانے والے، خزیمہ ذوالشہادتین، آنحضرت نے جن کی گواہی دو آدمیوں کے برابر قرار

دی تھی جوان کی صداقت کی سند تھی۔ صفوان وسعید ابن خذیفہ الیمانی، عبداللہ بن بدیل خزاعی دوزرہیں پہنتے تھے اور دو تلواروں سے لڑنے والے جوشِ جہاد میں معاویہ کے خیمے تک پہنچ گئے تھے جہاں دور سے پتھر مار کر شہید کیے گئے۔ عمار یاسر نے تحفظ اسلام کے لئے اپنی جان قربان کردی، جن کے لئے آنحضرت نے فرمایا تھا کہ انہیں باغیوں کا ایک گروہ قتل کرے گا۔ حدیث محتاج ثبوت نہیں اور ایسے ہی بعض دوسرے بزرگ شہید ہوئے۔ عمار یاسر کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیش گوئی جب معاویہ کے سامنے بیان کی گئی تو انہوں نے کہا: علیؑ ان کو لڑنے کے لیے لائے تھے، وہی ان کے قاتل ہیں۔ یہ بات جب امیر المومنین کے گوش گزار ہوئی تو آپ نے فرمایا: اس دلیل سے تو آنحضرت جعفر طیار کی شہادت کے ذمہ دار ٹھہرتے ہیں کیونکہ آپ ہی نے انہیں جہاد کے لئے موتہ بھیجا تھا۔

ان ہستیوں کی شہادت علیؑ کے حق بجانب ہونے کی ضمانت رہے گی، اور شاید اسی بنیاد پر علمائے اہل السنّت بشمول مولانا مودودی جنگ صفین کا ذمہ دار معاویہ کو قرار دیتے ہیں مگر مسمائوں کا ایک طبقہ طرفداری پر تلا ہوا ہے، وہ کاتب وحی اور خطائے اجتہادی کی رٹ لگائے ہوئے ہے۔

یہ اجتہاد عجب ہے کہ ایک دشمن دیں
علی سے آ کے لڑے اور خطا کہیں اس کو
یزید کو تو نہ تھا اجتہاد کا دعویٰ
برا نہ مانیے گر ہم برا کہیں اس کو
(غالب)

اسلام کی تباہی اور ہزاروں مسلمانوں کا قتل پھر بھی قابل درگزر۔ کیا دودھ کو دودھ اور پانی کو پانی کہنے کا سبق اسلام نے نہیں دیا تھا؟

اور لیلۃ الحریر میں ان سرفروشوں کے جہاد ہی کا نتیجہ تھا کہ لشکر شام کے پاؤں رزم گاہ میں ڈگمگا رہے تھے۔ ایک آخری یلغار میں شکست ہونے ہی والی تھی کہ ایک طرف سے نیزہ داروں کی ایک جماعت آتے دکھائی دی جو نیزوں کی نوکوں پر قرآن اٹھائے ہوئے تھی۔۔۔۔ آگے آگے دمشق کا بڑا قرآن کئی نیزوں پر، اس کے پیچھے ایک ہزار قرآن ایک ہزار نیزوں پر!

گویا فیصلے کا انحصار قرآن پر کیا جا رہا تھا۔۔۔۔ حالانکہ یہی قرآن تھا جس کو علیؑ نے جنگ سے پہلے درمیان میں ڈالا تھا مگر حامل قرآن کو قتل کردیا گیا تھا۔ چاہئے تو یہ تھا کہ جواباً علیؑ بھی قرآن برداروں کو زندگیوں سے آزاد کردیتے لیکن آپ محافظ قرآن تھے، اس کا تصور بھی نہ کرسکتے پھر بھی آپ نے

فرمایا:۔

''یہ فریب ہے، یقینی شکست سے بچنے کے لئے۔۔۔''

صاحبان ایمان نے اس خیال کی تائید کی مگر اشعث بن قیس اور مستقبل کے بڑے راوی خالد بن معمر ایک بڑی جمعیت کے ساتھ بڑھ کر قریب آ گئے۔

''فیصلہ کتاب خدا پر رکھ دیا گیا ہے، جنگ روک دی جائے۔۔۔!''

حضرت علیؑ نے سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر کوئی نہیں مانا اور اشعث کے ساتھ سیکڑوں آوازیں سنائی دینے لگیں۔

''اب ہم لڑنے کو تیار نہیں ہیں''

حضرت علیؑ کے مخلص فداکار جنگ روکنے کو تیار نہیں تھے مگر خلیفہ برحق اشعث کے ضمیر کو جھانک کر دیکھ رہا تھا اس میں منافقت کی سیاہی نظر آ رہی تھی۔۔۔۔ رسولؐ کے جانشین ازلی نے ایک لحظے میں سب کچھ سمجھ لیا کہ قرآن برداروں کو معاویہ نے پہلے سے تیار کر رکھا تھا اور منافقین کو بھی ان کے لشکر میں شامل کر دیا تھا، وہ کسی طرح نہیں مانیں گے اور جنگ نہ روکی گئی تو خود ان کی فوج میں تلوار چلنے لگے گی اور اس کا نتیجہ معاویہ کے حق میں جائے گا۔

علیؑ نے بعد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسلمانوں کی باہمی جنگ کو روا نہ رکھا تھا اور اسلام دوستوں کو کھلا ہوا اسلام دشمن بن جانے کا موقع نہیں دیا تھا۔ آج بھی ویسی ہی صورت حال پیدا ہو جانے کا امکان تھا اس لئے آپ نے امام وقت کا فرض ادا کیا، نزدیک و دور پھیلے ہوئے مجاہدین پر نظر ڈالی اور دیر تک انہیں دیکھتے رہے، جس طرح بعد رسول سلمان، مقداد، ابوذر، حذیفہ الیمانی اور دوسرے اصحاب رسول کو دیکھا تھا، جب انہوں نے اپنا حق لینے کے لئے تلوار اٹھانے کا مشورہ دیا تھا۔

وقت بہت صبر آزما تھا تقریباً ویسا ہی وقت جیسا وفات پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد آیا تھا۔ اشعث بن قیس، خالد بن معمر اور شام کی تمام کالی بھیڑیں اور وہ سارے کے سارے مسلمان جوان کے بہکانے میں آ گئے تھے کتنی دیر ٹھہر سکتے، ذوالفقار حیدری اور سچے مجاہدوں کے سامنے جو سر سے کفن باندھ کر لڑ رہے تھے اور رہ گئی معاویہ کی طاقت تو اس کا جنازہ نکل چکا تھا۔ دو چار حملوں میں کٹ کر رہ جاتے اور بھگدر پڑتی تو ایک دوسرے کو کچلتا چلا جاتا لیکن انجام یہی ہوتا کہ ان سب کی اسلام سے روگردانی مسلم ہو جاتی اور اسلام کی جو صورت آج نظر آتی ہے، وہ بھی اتنی مسخ ہو جاتی کہ پہچانی نہ جاتی۔

علیؑ منصب امامت سے دیر تک سوچتے رہے پھر آپ نے کہہ دیا:۔

''جنگ روک دی جائے۔۔۔''!

علیؑ کے الفاظ فضائے بسیط میں گونجے اور چلتی ہوئی تلواریں نیاموں میں چلی گئیں۔ کتنے تابع فرمان تھے علیؑ کے جان نثار کہ تعمیل حکم میں کسی نے کوئی تامل نہیں کیا۔ مالک اشتر معاویہ کے محافظ دستوں کا صفایا کر چکے تھے اور شام کی خلافت پر آخری ضرب لگانے ہی والے تھے۔ انہوں نے سوچا کہ جنگ تو رک ہی جائے گی کیوں نہ غداروں کو کیفر کردار تک پہنچا کر روکی جائے۔ وہ بچے کھچے دستوں کو کاٹتے رہے اور شام کی شکست آخری منزل کے قریب پہنچ گئی۔

ادھر اشعث حضرت علیؑ پر دباؤ ڈال رہا تھا۔ علیؑ نے پھر مالک کو پیغام بھیجا کہ رک جاؤ۔ مالک نے تعمیل ارشاد کا وعدہ کیا مگر وہ سیاست جنگ کا تقاضا پورا کرتے رہے۔ آخر اشعث اور اس کے ساتھی کھلی ہوئی غداری پر اتر آئے اور معاویہ پر اٹھنے والی تلواروں کا رخ خود علیؑ کی طرف ہو گیا۔ ان تلواروں کی چمک علیؑ کو کیا خوفزدہ کرتی مگر انجام وہی ہوتا جس سے بچنے کے لئے علیؑ یہاں تک پہنچے تھے۔ بجبوری آپ نے اشتر سے کہلوایا:-

''تم نہ رکے تو واپسی پر مجھے شاید زندہ نہ پاؤ۔۔۔''

مورخ نے یہ الفاظ لکھنے کو تو لکھ دیئے مگر علیؑ اور موت سے ڈرنا، وہ بھی راہ اسلام میں۔ شاید لکھنے والے نے صورتحال کو اپنے اوپر منطبق کر کے دیکھا تھا!

ایک عام آدمی تو یہ کہہ سکتا ہے مگر اسداللہ الغالب ایسے الفاظ کسی طرح ادا نہ کر سکتے کیونکہ ان کا جینا بھی خدا کے لئے تھا مرنا بھی خدا کے لئے۔ بہرحال الفاظ جو بھی ہوں لیکن انہوں نے مالک کو جہاد بالنفس کی منزل میں لا کھڑا کیا اور مالک نے یقینی فتح کو اطاعت امام پر قربان کر دیا۔

میدان میں بغیر زرہ کے جانیوالا اور موت کو اپنی پشت پر لے کر لڑنے والا بڑے سکون و اطمینان کے ساتھ دوستوں اور دشمنوں میں گھرا ہوا تھا۔ مالک اشتر مایوس و دل شکستہ واپس ہوئے تو حکمین کے لئے دو نام پیش کئے جا چکے تھے۔ عمرو بن العاص معاویہ کی طرف سے اور ابوموسیٰ الاشعری علیؑ کی طرف سے۔ الاشعری کا نام اشعث نے تجویز کیا تھا۔ حضرت علی عبداللہ ابن عباس یا مالک اشتر کو اپنی طرف سے رکھنا چاہتے تھے لیکن اشعث پھر اڑ گیا اور نوبت پھر آپس کی خونریزی کی نظر آنے لگی۔

علیؑ کے لئے پھر ایک لمحہ فکریہ پیدا ہو گیا۔ دنیا کہتی ہے کہ خلافت علیؑ کا حق تھی اور مسلمان ان کے ساتھ تھے تو بعد رسول میدان میں کیوں نہیں آ گئے۔۔۔ آج علیؑ میدان میں بھی موجود تھے اور مسلمان بھی آپ کے ساتھ تھے۔ معاویہ کے بھیجے ہوئے منافقین نے ہوا خواہوں کی ایک تعداد کو بہکا دیا

تھا اور ایک تعداد کو شام نے خرید لیا تھا۔ سب مل جل کر بھی پورے لشکر کا پانچواں چھٹا حصہ ہو سکتے ۔ اصل لشکر میں اکثریت ایسے سرفروشوں کی تھی جو مارتے اور مر جاتے مگر میدان نہ چھوڑتے پھر بھی آپ نے جانتے بوجھتے ہوئے بھی غدار اشعری کو منظور کر لیا۔ یہ تھا پیغمبرانہ اتمام حجت اور ہادیانہ ادائے منصب کہ آج جو سازش کا شکار ہو کر غلط کو صحیح قرار دے رہے ہیں کل شاید غلط کو غلط سمجھنے لگیں اور وہی ہوا کہ حکمین کے فیصلے کے بعد بہت سے لوگوں کو پچھتانا پڑا اور وہ اپنی غلطی کی تلافی پر آمادہ ہو گئے مگر اب ایسا ہر خیال بعد از وقت تھا۔

نیزوں پر قرآن بلند کرانا اور خود اپنے مجوزہ حکمین مقرر کرانا ایک ایسا فریب تھا جس کو عام آدمی بھی سمجھ سکتا تھا اور انجام بھی ڈھکا چھپا نہ تھا۔ ابوموسیٰ الاشعریؔ نے فیصلہ کیا کہ وہ علیؑ اور معاویہ دونوں کو معزول کرتے ہیں، مسلمان پھر سے خلیفہ کا انتخاب کر لیں۔ ان کے بعد عمرو عاص نے اعلان کیا کہ وہ علیؑ کو معزول کرتا ہے اور معاویہ کی خلافت منظور کرتا ہے۔ مجمع میں ایک خلفشار پیدا ہو گیا اور الاشعری کی غداری کھل کر سامنے آ گئی مگر مسلمان کہتے ہیں کہ عمرو عاص نے صحابی رسولؐ کو دھوکا دیا۔ اگر یہ سچ تھا تو پھر وہ تمام زندگی شام کے خزانے سے وظیفہ کیوں وصول کرتے رہے اور اس کے بعد علی الاعلان معاویہ کی گود میں کیوں جا بیٹھے؟

کتنی ستم ظریفی ہے کہ الاشعری بھی صحابی اور عمرو بن العاص بھی صحابی دونوں کے فضائل میں ارشادات نبوی ۔۔۔ اور چھوٹے صحابی نے بڑے صحابی کو دھوکا دے دیا پھر بھی اس کی فضیلت میں کوئی کمی نہیں آئی ۔ شاید مسلمان کو دھوکا دینا ایمان میں داخل تھا، حالانکہ یہ حدیث رسولؐ کے منافی تھا۔

شام کے خلیفہ کو اپنی ناکامی کا کوئی خطرہ نہ تھا کیونکہ اس کے پاس مکر و فریب کے ہزار راستے تھے مگر علیؑ کا استحصال کلی چاہتا تھا اور اسی لئے اپنی عملداری کے حدود میں آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور علیؑ کے خلاف ہر طرح کا پروپیگنڈا کرایا تھا اور علیؑ کے لشکر میں بھی غداروں کا جال بچھا دیا تھا۔ کچھ بوڑھے لوگوں کو طوطوں کی طرح چند جملے رٹوا کر بھیج دیا تھا جو ہر موقع پر ان ہی جملوں کا اعادہ کرتے رہتے ۔ یہ جملے کچے ایمان والوں کو خود بخود یاد ہو گئے مگر وہ بعد میں اپنی فریب خوردگی پر بہت پچھتائے۔

حکمین کے فیصلے پر افواج کوفہ کے جن لوگوں نے اشعث کی ہم نوائی کی تھی وہ اب دوبارہ جنگ چھیڑنے پر مصر تھے مگر یہ اصول اسلام کے خلاف تھا لہٰذا دونوں لشکر بے نیل مرام واپس ہو گئے لیکن حقیقتاً فتح معاویہ کی ہوئی کیونکہ صفین کی جنگ کے انجام نے ایک بڑی تعداد کو خلافت سے بیزار کر دیا جن کی اکثریت خود شام کی تھی پھر کوفے نے بھی ایک تعداد انھیں فراہم کی اور صفین سے کوفہ تک پہنچتے پہنچتے

بعض لوگوں کے نظریات میں اتنی تبدیلی پیدا ہوگئی کہ وہ آپس ہی میں ٹکرانے لگے۔

معاویہ نے جو زہر اشعث بن قیس اور ابوموسیٰ الاشعریٰ کے ذریعہ پھیلایا تھا وہ ایک مرض متعدی کی شکل اختیار کرگیا، کوئی اشعری کی زبان بولنے لگا اور کوئی عمرو عاص کی اور آہستہ آہستہ یہ سب نہروان میں جمع ہوگئے۔ ان کی اکثریت حاکم شام کی وظیفہ خوار تھی جو علیؑ سے بیزاری کا اظہار کرتی۔ ایک تعداد ان لوگوں کی بھی تھی جو صرف حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کو خلیفہ مانتی تھی، بعض ان میں عثمانؓ اور معاویہ کو بھی شامل کرتے تھے لیکن ان کا عقیدہ کچھ بھی ہوتا وہ بہرطور علیؑ کے دشمن تھے۔ یہی معاویہ کا مقصد تھا کہ علیؑ کو مختلف تنازعات میں الجھا کر ان کی طاقت کو کمزور سے کمزور تر کرتا رہے۔

مسلمان کہتے ہیں کہ ابوموسی الاشعری کی معاویہ سے کوئی سازش نہیں تھی عمرو عاص نے انھیں فریب دیا تھا۔ یہ جانبداری ہے، ویسی ہی جانبداری جیسی ابوسفیان اور دوسروں کے لئے کی جاتی ہے۔

غلط اور صحیح موقف سے قطع نظر معاویہ اور علیؑ صفین کے فریق تھے معاویہ نے عمر عاص کو حکم بنایا تھا اس لئے علیؑ کو حق تھا کہ جس کو چاہتے بناتے، اشعث بن قیس کون ہوتا تھا ابوموسی کو تجویز کرنے والا اور علیؑ ایسے کو بناتے ہی کیوں جس نے جمل میں علیؑ سے غداری کی تھی۔ ماننا پڑے گا کہ اشعث اور ابوموسیٰ خزانہ شام کے ہاتھوں بک چکے تھے اور حکمین کا پورا منصوبہ اور فیصلہ معاویہ کا مجوزہ تھا جو عمل میں آیا۔ اس کے بعد یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ قرآن کو آلہ فریب کیوں بنایا گیا تھا؟ کوئی مزید صراحت لاحاصل ہے اور لاجواب ہوکر کسی کا مسکرانا سمجھ میں آتا ہے کہ علیؑ معاویہ سے چوٹ کھا گئے۔ یہ کہنا غلط بھی نہیں ہے کہ عشق اور جنگ میں سب جائز ہے لیکن صرف اس صورت میں جب عشق مجازی ہو اور جنگ دنیاوی اور اگر یہ تسلیم کرلیا گیا ہے کہ جنگ صفین دنیاوی تھی، معاویہ نے اسے دینی جنگ تصور نہیں کیا تھا تو دین میں خالص دنیادار آدمی کی جگہ کیونکر بن سکتی ہے اور معاویہ کے ساتھ خلافت اسلامیہ کو کوئی نسبت کس طرح دی جاسکتی ہے۔۔۔۔!

اس طرح پیغمبری کو بادشاہت سمجھنے والوں کو مسلمانوں کا سربراہ قرار دینا کتنا بڑا ظلم ہے؟ اس کو مستقبل کے یزید ابن معاویہ کے الفاظ میں سمجھا جاسکتا ہے۔

نہ کوئی فرشتہ آیا نہ کوئی وحی آئی، پیغمبری بنی ہاشم کا ایک کھیل تھی!

شام کا نظریہ جہاد!

مورخین اسلام، جنگ صفین کو مسلمانوں کے دو نظریوں کا تصادم قرار دیتے ہیں۔ یہ قول اس

اعتبار سے صحیح بھی ہے کہ ایک نظریہ اسلام خالص کا تھا، اور دوسرا اسلام کے نام پر فرمانروائی کا جو درحقیقت بنیاد تھا ہر اختلاف کا۔ اگر بات ہوتی صرف دینی رہنمائی کی تو مفتیان اسلام افضل ومفضول کا فیصلہ خود کر چکے تھے اور یہ فتویٰ صادر ہو چکا تھا کہ علیؑ کے ہوتے ابوبکرؓ کا انتخاب جائز تھا۔ بعد میں علم و زہد کا ہر شرف حضرت ابوبکرؓ سے منسلک کر دیا گیا۔۔۔ اور کسی کاغذ پر لکھنے کی جگہ ہوتو کچھ بھی لکھا جا سکتا ہے!

ایک گروہ معاویہ کو اسی سلسلہ خلافت کی ایک کڑی قرار دیتا ہے مگر یہ زیادتی ہے خلفائے سقیفہ کے ساتھ، انہوں نے دین کو دنیائے محض تو نہیں بنایا تھا۔ ان کے ادوار میں اسلام میں آمیزش ضرور ہوئی تھی لیکن اس کو کلیتہً، غیر اسلامی قرار تو دیا نہ جا سکتا۔ آج کا دمشق مدینۃ النبی سے بالکل مختلف تھا، نام تھا اسلام مگر خدوخال تھے غیر اسلامی، شان وشوکت قیصر وکسریٰ کی اور طور طریقے فریب کاری کے حتیٰ کہ انھیں سیرت اسلام کو مسخ کر دینے میں بھی کوئی عار نہ تھا۔ ذہنوں میں زہر بھر کر مسلمانوں کو خارجی بنا دینا ایمان کو خراب کرنا نہیں تھا تو اور کیا تھا۔۔۔ پھر یہ کہنا کتنا بڑا فریب ہے کہ اختلافات سے تنگ آ کر انہوں نے یہ راستہ اختیار کیا تھا۔

اموی مورخین سے لکھوایا گیا تھا کہ خارجی علیؑ و معاویہ دونوں کے دشمن تھے۔ ایسا ہوتا بھی تو کیا اس کا سبق ابوموسیٰ الاشعری نے نہیں پڑھایا تھا؟

اگر نہیں تو کس نے پڑھایا تھا۔ انھیں میں سے جو گروہ علیؑ کے بجائے معاویہ کو مانتا تھا تو کیا اس کی تلقین عمرو عاص کے علاوہ کسی اور نے کی تھی اور اگر کوئی عثمانؓ وعلیؑ دونوں سے بیزار تھا تو مظلومیت عثمانؓ کی غلط مشتہری کس نے کرائی تھی؟ جس کی حقیقت بعد میں کھلی اور آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کردارکشی کے لئے علیؑ پر تبرے کو کس نے مروج کیا تھا؟ کیا یہ سب کچھ شام کے امیر کا کیا دھرا نہیں تھا؟ ہے اس کا کوئی جواب کہ دمشق کے خزانے سے خارجیوں کے سربرآوردہ لوگوں کو وظائف کیوں دیئے جاتے تھے جو سیدھے سادھے مسلمانوں کو گمراہ کرتے اور سب سے بڑی دلیل تو یہ ہے کہ خارجیوں میں کوفے کے تھوڑے سے افراد کے سوا اکثریت اگر شام کی نہیں تھی تو کہاں کی تھی؟

تاریخ اس کی کوئی صفائی نہیں دے سکتی کہ خارجی شام ہی کے ساختہ پرداختہ تھے اور اس کا مقصد علیؑ کو مسلسل مسائل میں مبتلا رکھنے کے سوا کچھ نہ تھا۔ ابوسفیان نے ابوطالب کی وفات کے بعد سے پیغمبرؐ کو چین سے بیٹھنے نہ دیا تھا۔ بیٹے نے خلافت کے پہلے دن سے پیغمبرؐ کے جانشین کو اطمینان کی سانس نہ لینے دی اور خارجیوں کا ایسا فتنہ کھڑا کر دیا جو بعد میں خود بنی امیہ کے لئے بھی مستقل مصیبت بن گیا۔۔۔ علیؑ کو دیا ہوا معاویہ کا عطیہ نہ صرف ملت مسلمہ کے لئے بلکہ اسلام کے لئے بھی زہر قاتل تھا

جس کے اثرات صدیوں کے بعد آج تک زائل نہیں ہوئے اور اب تو خارجیت کے زہریلے اثرات نے اتنی بڑی خلیج پیدا کردی ہے کہ اتحاد بین المسلمین ناممکن بن گیا ہے۔

جنگ نہروان

علیؑ کی طاقت اندرونی خلفشار اور لگاتار لڑائیوں میں بلاشبہ کافی متاثر ہو چکی تھی مگر خارجیوں کو کسی طرح نظر انداز کیا نہ جاسکتا کیونکہ وہ نظریاتی اعتبار سے اسلام کو مجروح کر رہے تھے اور راسخ العقیدہ مسلمانوں کو صداقت اسلام کے جرم میں قتل کر رہے تھے اس طرح کے کئی واقعات کے بعد امیر المومنین نے وقت کی مساعدت اور نامساعدت کا لحاظ کئے بغیر ان کی سرکوبی کا فیصلہ کرلیا۔

خارجیوں کی تعداد بہت زیادہ نہ تھی مگر وہ حد درجہ کے ظالم تھے اور صحیح معنی میں اسلام دشمن۔ ایکبار انہوں نے مسلک اعتزال کے بانی واصل بن عطا کے والد کو پکڑ لیا اور جب انہوں نے کہا کہ وہ مسلمان نہیں ہیں بلکہ مشرک ہیں تب جا کر انھیں چھوڑا۔ صحابی رسول عبداللہ بن خباب کو پکڑ لیا اور انہوں نے علی پر تبرا نہیں کیا تو قتل کر ڈالا کیا اس کے بعد بھی انھیں شام کا نمائندہ نہیں کہا جاسکتا؟

امیر المومنین کا لشکر جب ان کے مقابل جا کر ٹھہرا تو انھیں پیغام دیا کہ حریث اور عبداللہ کے قاتلوں کو ان کے حوالے کر دیا جائے اور آئندہ ایسا جرم نہ کرنے کا وعدہ کیا جائے تو درگزر سے کام لیا جائے گا۔ اس کا جواب انہوں نے یہ دیا کہ وہ سب ان کے قاتل ہیں۔ اس پر جانشین رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود آگے بڑھ کر انھیں سمجھایا مگر نامناسب جواب پایا پھر بھی ان سے کہا گیا کہ وہ اپنا ایک نمائندہ بات چیت کے لئے بھیج دیں۔

یہ اتمام حجت اور فرض کی ادائیگی تھی منصب امامت کی۔ اس پر عبداللہ بن الکوابات چیت کے لئے آیا اور طویل گفتگو کے بعد لاجواب ہو کر چلا گیا۔ امید تھی کہ اس کی واپسی پر خارجی راہ راست اختیار کرلیں گے لیکن وہ ذہنی طور پر اتنے مسموم ہو چکے تھے کہ روشن دلائل اور الفاظ کی شیرینی سے بھی ان کا علاج نہ ہوسکا۔ اگلے دن لشکر اسلام نے ان کے خلاف صف آرائی کی مگر حضرت علیؑ نے جنگ چھیڑنے میں پہل نہیں کی بلکہ ایک مختصر سی تقریر کے بعد اعلان کیا کہ جو مسلمانوں کے قاتل نہیں ہیں وہ الگ ہو کر جہاں چاہیں چلے جائیں انھیں معاف کر دیا جائے گا۔ اس پر فردہ بن نوفل پانچ سو سواروں کے ساتھ علیحدہ ہو گیا اور سو آدمی لشکر امیر المومنین سے آملے جو بالکلیہ اہالیان کوفہ میں سے تھے۔

اس اثناء میں ایک خارجی نے بڑھ کر مسلمانوں کے تین آدمی شہید کر دئے اور حضرت علیؑ کو

برے لفظوں سے یاد کر کے للکارا۔ امیر المومنین نے بڑھ کر ایک ہی وار میں اس کا کام تمام کر دیا۔ یہ دیکھ کر کچھ آدمی اور اپنے ساتھیوں کو لے کر اسلامی لشکر سے آملے باقی لوگوں نے ایک زبردست حملہ کر دیا۔۔۔ خارجی یقیناً موت اور زندگی کی لڑائی لڑے اور انھوں نے مسلمانوں کی ایک تعداد کو زخمی کر دیا مگر قتل کر سکے صرف آٹھ آدمیوں کو، خود ان میں سے صرف نو آدمی جان بچا کر نکلنے میں کامیاب ہو سکے باقی ہزاروں کی تعداد میں لقمۂ اجل بن گئے۔ ان سب کا خون اس کے سر جاتا ہے جس نے انھیں گمراہ کر کے دین کے راستے سے بھٹکا دیا تھا۔

کاش یہ سلسلہ اس جنگ کے بعد بند ہو گیا ہوتا مگر ایسا نہیں ہوا۔ دمشق میں خارجی بنانے کی ٹکسال بند نہیں ہوئی وہ اسی طرح کام کرتی رہی اور مسجد کوفہ میں امیر المومنین کی شہادت کے بعد خود خارجیت ساز کے لئے اس کی روشنی طبع بلا بن گئی۔

نہروان کی طرف جاتے ہوئے ایک نصرانی منجم نے امیر المومنین کو روکا تھا کہ مسلمانوں کا ستارہ گردش میں ہے، لڑنے کے لئے نہ جائیں۔ آپ نے جواب دیا تھا کہ تیرا حساب غلط ہے ہمارے دس سے کم آدمی مارے جائیں گے، دشمن کے دس سے کم بچ سکیں گے۔ یہ دس کا حساب صادق و امین کے جانشین کو اس وقت بھی معلوم تھا۔ کاش کسی نے پوچھ لیا ہوتا تو دنیا کو اعشاری نظام کے لئے ہزار بارہ سو سال انتظار نہ کرنا پڑتا۔

کمیں گاہ کا تیرانداز!

جنگ صفین اور نہروان سے فارغ ہو کر امیر المومنین اطمینان کی سانس بھی لینے نہ پائے تھے کہ معاویہ کی ریشہ دوانیاں گوش گزار ہوئیں۔ آپ جانتے تھے کہ عرب و عراق کے لوگ صرف مال غنیمت کے لئے لڑتے ہیں اور مسلسل جنگوں سے تھک بھی چکے ہیں پھر بھی معاویہ کو کھلا چھوڑ دینے کا مطلب اسلام دشمنی سے چشم پوشی کے مترادف تھا۔ یہ حقیقت بھی آپ کے سامنے تھی کہ بڑے بڑے سرفروش حق اسلام ادا کر کے موت کی نیند سو چکے ہیں! اویس قرنی، ہاشم مرقال، عتبہ بن ہاشم، برید اسلمی، مالک بن تیہان، صفوان و سعید پسران حذیفہ الیمانی عبداللہ بن بدیل خزاعی دو زرہین پہن کر دو تلواروں سے لڑنے والے عبدالرحمٰن ابن بدیل، حارث بن مرہ، خزیمہ ذوالشہادتین اور عمار یاسر وغیرہ امیر المومنین نے ان سب کو یاد کر کے کلمات خیر سے یاد کیا اور باقیات الصالحات پر نظر ڈالی تو مومنین خالص کی کمی نہ تھی لیکن مقابلہ تھا وقت کے اس شاطر کا جس کی ٹکسال میں مکر و فریب کا ہر حربہ تیار رہتا تھا لہٰذا آپ نے تھوڑا سا

توقف مصلحت وقت قرار دیا۔

ادھر کوفے کی صورت حال یہ تھی کہ دمشق کے جاسوس گھروں کے اندر پھوٹ ڈلوا رہے تھے۔ شام کا خزانہ کوفے کے بازار میں لٹایا جا رہا تھا۔ جانشین پیغمبر کی عدل پروری سے اکتائے ہوئے لوگ گھر بیٹھے مالا مال ہو رہے تھے تو ایمان کی فکر کون کرتا۔ نظیریں اس کی بھی تھیں کہ کوفے کے شہری خلیفہ کو خطبے کے دوران ٹوک دیتے اور خلافت کا وقار مجروح کرتے مگر نہایت نرمی سے جواب بالصواب پا کر خاموش ہو جاتے بالفاظ دیگر علیؑ کے دربار خلافت میں معاویہ خلافت شام کا کلمہ پڑھوا رہے تھے۔

باہر کی صورت حال یہ تھی کہ خارجی سازی جتنی تیزی سے ہو رہی تھی، اتنی ہی سرعت سے وہ حدود خلافت علیؑ میں پھیل رہی تھی اور دولت کی اتنی بہتات تھی کہ خارجیوں کے پاس نہروان میں بری طرح برباد ہو جانے کے بعد بھی نہ آدمی کم ہوئے تھے اور نہ مال۔ مختلف مقامات پر اپنے مرکز بنا کر وہ خلافت مدینہ کو تاراج کر رہے تھے۔

سکرہ میں اشرف بن عوف شیبانی نے علم بغاوت بلند کیا جو اسرس بن احسان کے ہاتھوں قتل ہوا، ہلال بن علفہ کو معقل بن قیس نے مارا، اشہب بن بشر کو جاریہ بن قدامہ نے ٹھکانے لگایا۔ سعید تیمی مدائن کے قریب مارا گیا جس کو سعد بن مسعود نے قید زندگی سے چھٹکارا دیا۔ ابو مریم سعدی بھی اسی طرح جنگ کر کے کیفر کردار کو پہنچا۔ خریث بن راشد کوفے میں خود امیر المومنین سے گستاخی کر کے فرار ہو گیا تھا۔ اس کو اور اس کے ساتھیوں کو زیاد بن حفصہ نے گھیر کر قتل کیا۔

یہ نام سرداروں کے ہیں جو اپنے اپنے ساتھ جمعیت لے کر منظر عام پر آئے تھے اور انجام کو پہنچے تھے مگر وہ جس قدر موت کے گھاٹ اتارے جاتے تھے کم وبیش اسی قدر پھر پیدا ہو جاتے تھے۔ کسی مورخ نے اس کی صراحت نہیں کی کہ اس صنعت میں کتنے لوگ اور کون کون حضرات کام کر رہے تھے۔ بظاہر یہ کام جہاندیدہ بزرگوں کا معلوم ہوتا ہے جو اتنی تندہی سے دین کی خدمت انجام دے رہے تھے۔

حضرت معاویہ نے امیر المومنین کی بے چینی کے اسباب فراہم کرنے میں صرف اتنے ہی پر اکتفا نہیں کی بلکہ مقبوضات خلافت کی تاراجی بھی شروع کر دی جن کا دفاع مقامی عمال کرتے رہے۔ آخر معاویہ نے مصر پر حملہ کرنے کا عزم کر لیا اور عمر بن العاص کو ایک بڑے لشکر کے ساتھ روانہ کر دیا۔

اس جرات کے پس منظر میں مصر کے حالات بھی ہیں جہاں کے عامل رئیس قبیلہ انصار سعد بن عبادہ کے بیٹے قیس تھے۔ وہ ایک صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مخلصان آل فاطمہ میں تھے اور موروثی طور پر حضرت علیؑ کے فداکار تھے مگر دور اندیشی اور سیاست میں معاویہ سے پیچھے نہ تھے۔

معاویہ نے ان کو خریدنے کی بہت کوشش کی مگر قیس اپنے والد سعد بن عبادہ کی طرح ایمان بیچنے والے نہ تھے۔ اس پر معاویہ نے اپنے جاسوس بھیج کر مصر سے ایک وفد بھجوادیا جس نے کوفہ پہنچ کر امیر المومنین سے قیس کی جھوٹی شکایت کی، حضرت علیؑ کو قیس پر اعتماد تھا۔ آپ نے ان کے خلاف کوئی کارروائی تو نہیں کی مگر وفد کی تالیف قلب کے لئے محمد بن ابی بکر کو قیس کا نائب بنا کر بھیج دیا۔ قیس کو یہ بات ناگوار گزری۔ وہ استعفیٰ دے کر مدینہ چلے گئے۔

مصر کوفے سے دور اور شام سے قریب تھا مگر معاویہ مصر کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھ سکتے وہ علیؑ سے زیادہ قیس سے ڈرتے تھے۔ جیسے ہی قیس کے جانے کی اطلاع ملی، انہوں نے مصر پر حملے کا منصوبہ بنالیا پھر عمرو عاص کے مصر پہنچتے پہنچتے سازش کا جال بچھادیا پھر مصر کے بعض عمائدین کو خرید لیا گیا۔

یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ شام و مصر میں آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا صحیح تعارف بھی نہ ہوا تھا اور خصوصیت کے ساتھ مصر میں تو علیؑ پر تبرے کی آواز بازگشت بھی گونجتی تھی۔ شام کی طرح مصر کے لوگ بھی بنی امیہ ہی کو پیغمبر عرب کا قریبی رشتہ دار سمجھتے تھے۔ معاویہ ان حالات سے فائدہ ضرور اٹھاتے مگر قیس بن سعد کا جبروت حوصلہ کو پست کر دیتا تھا۔ اب محمد بن ابی بکر کو مصر کا والی بنایا گیا تھا تو انہیں وہ خاطر میں بھی نہیں لائے اور عمرو عاص کے لئے زمین ہموار کرنے کی خاطر وہاں محمد بن ابی بکر کے خلاف بغاوت کرادی۔

وفادار اور باصفا محمد بن ابی بکر اگرچہ قیس کے سے تجربہ کار نہیں تھے پھر بھی انہوں نے اپنی طرف سے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ بغاوت کے کچلنے کے لئے یزید بن حارث اور محمد بن جیہان کو متعین کیا مگر دونوں مارے گئے کیونکہ باغیوں کو شام کی طرف سے اتنا طاقتور بنادیا گیا تھا کہ معمولی فوجی دستے ان کا مقابلہ نہ کر سکتے۔ اس کے بعد بنی کلب کا ایک سردار بھیجا گیا وہ بھی لڑتا ہوا شہید ہو گیا اس اثناء میں بغاوت زیادہ زور پکڑ گئی اور محمد بن ابی بکر کو کوفے سے مدد مانگنا پڑی۔

حضرت علیؑ کا آخری سرمایہ مالک اشتر تھے۔ قیس کو مدینہ سے بلانے کا وقت نہ تھا۔ محمد بن ابی بکر نے مصر کے جو حالات لکھے تھے ان کے تحت تعجیل کی ضرورت تھی۔ محمد بن ابی بکر علی کو محمد حنفیہ سے کم عزیز نہ تھے۔ انہیں وہ ابوبکر کے صلب سے اپنا بیٹا سمجھتے تھے۔ کوفے میں بھی امیر المومنین کو مالک کی ضرورت تھی مگر آپ نے محمد کی حفاظت کو مقدم کیا اور مالک کو مصر روانہ کر دیا۔

مالک اشتر

مالک کا قبیلہ کوفے کی آبادی سے قبل اس کے نواح میں آباد تھا جو نخ کا علاقہ کہلاتا تھا۔ آپ کے برادر بزرگ کا نام عبداللہ تھا، شجاع، جنگ آزما، متدین، بلند کردار، قول کے دھنی اور فرزند شمشیر، مالک اشتر نے سرداری ورثے میں پائی تھی۔ ایک آنکھ پر زخم تھا اس لئے اشتر کہے جاتے تھے جنگ قادسیہ کے بعد سے اس قبیلے کا مدینے سے رابطہ ہوا پھر ذاتی رجحان کے سبب آل محمدؐ کا حلقہ بگوش بن گیا۔

دارالخلافہ جب مدینے سے کوفہ منتقل ہوا تو بارگاہ امامت میں مالک کا تقرب قابل رشک ہو گیا اور رزم گاہ میں تو وہ اتنے ممتاز و منفرد تھے کہ بڑے بڑے سورما زد سے بچ کر نکل نہ پاتے۔ اسداللہ الغالب کے خطاب پر تاریخ اسلام نے ایک نام کو سیف اللہ بنا دیا ہے لیکن غزوات نبی میں ان کا کوئی کارنامہ نظر نہیں آتا۔ برعکس اس کے مالک کا نام علیؑ کے دور خلافت میں فتح کی ضمانت تھا اور دشمن علیؑ کے بعد اگر کسی سے ڈرتا تھا تو مالک سے۔ یہی سبب تھا کہ جب مالک کے عازم مصر ہونے کی خبر گرم ہوئی تو خلیفہ شام کو بڑی گھبراہٹ ہوگئی اور انھیں مصر پر قبضے کی آرزو ناکام ہوتے دکھائی دینے لگی۔

مسلمانوں نے حلم کو معاویہ کی اوصاف میں شامل کیا ہے لیکن یہ لفظ زیب نہیں دیتا بلکہ استقامت و فتانت موزوں معلوم ہوتے ہیں۔ یہ بات مسلمہ تھی کہ مالک اگر مصر پہنچ جاتے تو عمرو بن العاص مصر کی حکومت کیا پاتے، میدان سے فرار یا بزدلی کی موت ان کے نصیب میں آتی اس لئے عافیت اسی میں تھی کہ مالک کو وہاں تک پہنچنے نہ دیا جاتا۔ ایک صورت تو یہ تھی کہ کوئی لشکر بھیج کر مالک کو جنگ میں الجھا دیا جاتا لیکن اس میں اندیشہ تھا پورے لشکر کے کٹ جانے کا اس کے بعد وہی خطرات پیش آتے عمرو عاص کو، جن کا نتیجہ یہ بھی نکل سکتا تھا کہ عمرو عاص اور اس کا کوئی لشکری زندہ واپس نہ ہوتا۔ کمین گاہ کا تیرانداز اس نشانے کو ڈھونڈھ رہا تھا جس پر تیر خطا نہ کرتا۔ آخر مسلسل غور و فکر کے بعد ایک نکتہ اس کو مل ہی گیا اور اس نے بڑی سرعت کے ساتھ مصر کی شاہراہ کی طرف ایک تیر چھوڑ دیا۔

مالک کے مصر پہنچنے کا راستہ قلزم ہو کر جاتا تھا۔ حاکم قلزم علیؑ کا ماتحت تھا لیکن معاویہ نے مصر کے لئے اس کو پہلے ہی سے اپنے دام تزویر میں پھنسا رکھا تھا۔ اس موقع پر بڑی فراست اور تیزی کے ساتھ اس سے رابطہ قائم کیا گیا اور ایک منصوبہ بنا کر روم سے منگوائے ہوئے زہر کا مقطر اس کو بھیج دیا گیا جو معاویہ نے خود تیار کر کے اپنے اسلحہ خانے میں محفوظ کر رکھا تھا۔

حاکم قلزم کے لئے یہ کام بہت خطرناک تھا اور راز افشا ہو جانے کی صورت میں خود اس کے مصیبت میں پھنس جانے کا اندیشہ تھا لیکن معاویہ نے جو سبز باغ اس کو دکھائے تھے اس سے محرومی بھی

برداشت کرنا آسان نہ تھی۔ پھر معاویہ سے اس کا چولی دامن کا ساتھ بھی تھا۔ بات ضمیر فروشی میں ہم آہنگی کی بھی تھی لہٰذا حاکم قلزم ایک دوست کی خدمت کے لئے تیار ہو گیا اور مالک کا لشکر جب قلزم کے قریب پہنچا تو وہ کسی چاکر کمترین کی طرح ان کے استقبال کے لئے موجود تھا۔

مالک اشترؒ کو اس کی طرف سے ذرا بھی غداری کا اندیشہ ہوتا تو وہ آسانی سے فریب میں آنے والے نہ تھے لیکن امیر المومنین کے اکثر ہوا خواہوں کا انداز مالک نے دیکھا تھا۔ اس کو انہوں نے حاکم قلزم کی سعادت پر محمول کیا اور بڑے انکسار سے اس کا مہمان بننا قبول کر لیا۔

مالک کا ایمان ان کے ماتھے پر چمکتا تھا۔ آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تقرب میں انھیں سلمان کا درجہ تو نہ دیا جا سکتا لیکن شجاعت کے وصف کے ساتھ یہ منزلت کچھ کم نہ تھی کہ ان کے لئے امیر المومنین باستثنائے امامت فرمایا تھا کہ مالک کی حیثیت میرے لئے وہی ہے جو میری حیثیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے تھی۔

کاش مالک کو حاکم قلزم کی نیت پر ذرا بھی شبہ ہو جاتا تو دنیا اس کا حشر دیکھ لیتی لیکن صاحب ایمان مالک علیؑ کے ایک حلقہ بگوش کو مومن سمجھتے رہے اور اس نے کھانے میں دمشق سے آیا ہوا زہر ملوا دیا۔ دعوت بڑی پر تکلف تھی شہد کے دو چمچے ہی مالک کے حلق سے اترے تھے کہ طبیعت خراب ہونے لگی۔ مالک نے اٹھنے کی کوشش کی مگر اٹھا نہ گیا اور لمحات کے اندر وہ خالق حقیقی سے جا ملے۔

اسلام کا جاں نثار اور شجاع روزگار اپنا حق ادا کر گیا۔ شجاعت وفا اور جذبہ ایمان کی ایک داستان اس کے نام سے وابستہ رہے گی۔ موت کا انداز قیامت تک اس کی شہادت دے گا کہ حسب و نسب کی عظمت اور سیرت و کردار میں آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نسبت اس کا طرہ امتیاز تھا۔ مالک کے اعتبار ایمان کے لئے اتنا کہنا کافی ہوگا کہ دشمنان دین انھیں اپنا حریف قرار دیتے اور انھیں راستے سے ہٹا کر اپنی دانست میں انہوں نے علیؑ کی طاقت توڑ دی تھی۔

دمشق میں مالک کی موت کی خوشی کس طرح منائی گئی اس کو تاریخ نے لکھا نہیں مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانشین کو جب اس کی خبر ملی تو وہ ایک سکتے میں رہ گئے اور ان کے چہرے سے ایسا معلوم ہونے لگا جیسے وہ خود آدھے مر چکے ہوں۔۔۔اور حقیقتاً مالک اپنی ذات سے کوفے کا عسکری نظام تھے جو ان کے بعد باقی نہ رہا۔ ان کی شخصیت خود علیؑ سے بڑی نہ تھی لیکن بحالت موجودہ علیؑ خود محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانشین تھے اور مالک علی کی جگہ۔ علیؑ کی جگہ اب خالی ہو گئی تھی اور اس جگہ کو پر کرنے کے لائق کوئی نہ رہا تھا۔

محمد بن ابی بکر

مصر کی سیاست پر مالک اشتر کی شہادت کا بہت گہرا اثر پڑا۔ حضرت معاویہ نے بڑی چابکدستی سے اپنی چالیں چلنا شروع کردیں۔ عمرو عاص کی سازش سے وہاں معاویہ بن خدیج اور معاویہ بن مسلم نے ایک بڑی جمعیت کے ساتھ علم بغاوت بلند کرادیا تھا۔ امیر المومنین انتہائی پریشانی میں محمد بن ابی بکر کو کمک بھیجنے کی کوشش کررہے تھے مگر سو دو سو آدمیوں سے زائد تیار نہ ہورہے تھے۔ بڑی کدوکاوش کے بعد مالک بن کعب ارجعی کی سرکردگی میں دو ہزار آدمی روانہ کیے گئے مگر ان کے پہنچنے سے قبل عمرو بن العاص مصر میں وارد ہوگیا اور جنگ شروع ہوگئی۔

مصر میں علیؑ کا دائرہ خلافت بہت محدود تھا۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام بانی اسلام کی حیثیت سے لیا ضرور جاتا تھا اور کلمے میں بھی شامل تھا مگر جو لوگ فاتح کی حیثیت سے مصر پہنچے تھے متعارف وہی تھے پھر شام میں شروع ہی سے بنی امیہ کی حکومت رہی تھی لہٰذا وہی وارثان رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سمجھے جاتے تھے۔ علیؑ کی خلافت کے بعد ایک حلقے کو حقیقت کا علم ہوسکا تھا اگر قیس بن سعد کے سے جرنیل حاکم مصر بنائے نہ گئے ہوتے تو مصر بہت پہلے اطاعت کا جوا کاندھے سے اتار پھینکتا۔ نتیجے میں قیس کے جاتے ہی حکومت کی گرفت کمزور پڑگئی اور وقار جاتا رہا۔ اس کے ساتھ ہی شام کے فرستادہ لوگوں نے ذہنوں کو مسموم کرنا شروع کردیا اور عمرو عاص کے پہنچنے تک محمد بن ابی بکر ایک لاچار حکمراں بن کر رہ گئے۔ پھر بھی محمد بن ابی بکر علی کے پروردہ تھے انہوں نے اپنی عمر کے لحاظ سے بہت زائد پامردی دکھائی۔ بے لگام ہوجانے والوں کو قابو میں کیا مگر جب عمرو عاص جنگجو اور تجربہ کار لشکر لیکر پہنچا تو بہت سے اپنے بھی غیر بن گئے لیکن علی کا منہ بولا بیٹا ہمت ہارنے والا نہ تھا اس نے اپنی درس گاہ کو بدنام نہیں کیا۔ کہا جاتا ہے کہ:-

''محمد بن ابی بکر چار ہزار فوج لے کر مقابلے کے لئے نکلے۔ مقدمۃ الجیش کی کمان کنانہ بن بشر کے ہاتھوں میں تھی جو نہایت شجاع اور بہادر تھے۔ بڑی استقامت اور پامردی کے ساتھ شامیوں کا مقابلہ کیا۔ جو دستہ آگے بڑھتا اسے پسپا کردیتے یہ رنگ دیکھ کر عمرو بن العاص نے معاویہ بن خدیج کو اشارہ کیا اس نے کنانہ کو گھیر لیا اور ہر طرف سے شامی ان پر ٹوٹ پڑے۔ کنانہ نے گھوڑے سے اتر کر لڑنا شروع کردیا لیکن تنہا ایک شخص کا جم غفیر سے مقابلہ کرنا مشکل تھا۔ بالآخر وہ لڑتے لڑتے مارے گئے۔ کنانہ مصری فوج کے قوت بازو تھے ان کے قتل ہوتے ہی مصریوں نے میدان چھوڑ دیا۔ محمد بن ابی بکر روپوش ہوگئے لیکن معاویہ بن خدیج نے ڈھونڈ نکالا اور عمرو بن العاص نے نہایت بیدردی کے ساتھ قتل

کرادیا''۔(۹)

ایک معتبر روایت یہ بھی ہے عمرو بن العاص نے محمد کو زخمی حالت میں گدھے کی کھال میں سلوادیا تھا۔ پھر اس کو جلوایا۔ کہا جاتا ہے کہ محمد بن ابی بکر کا غلام سالم جب آپ کا پیرہن لے کر مدینہ پہنچا تو معاویہ کی بہن ام حبیبہؓ نے ایک بھنا ہوا مینڈھا تحفے کے طور پر ام المومنین عائشہؓ کے پاس بھیجا تھا کہ'' محمد بن ابی بکر اسی طرح بھون ڈالے گئے تھے۔''

ام المومنین عائشہ کو اس سے اتنا صدمہ ہوا تھا کہ آپ نے پھر کبھی بھنا ہوا گوشت نہیں کھایا۔ اس دن کے بعد سے آپ ہر نماز میں معاویہ، عمرو عاص اور معاویہ بن خدیج کے لئے بددعا کیا کرتی تھیں۔

حضرت عائشہ بنت ابی بکر اور حضرت ام حبیبہ بنت ابی سفیان دونوں ام المومنین تھیں ایک مقتول کی بہن دوسری قاتل کی بہن، دونوں رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیویاں جو اسلام میں قیامت تک محترم لیکن دونوں میں سے کسی نے یہ نہیں سوچا کہ حق پر کون تھا بلکہ سوچا تو اپنے بھائی کی طرفداری کا پہلو۔ یہ نتیجہ بھی قابل غور ہے کہ ام المومنین عائشہؓ نے کل علیؑ کی خلافت کے خلاف خروج کیا تھا آج وہی علیؑ کے نمائندے کی شہادت پر ماتم کناں تھیں، کل معاویہ کے اشارے پر جمل میں صف آرا ہوئی تھیں آج معاویہ ان کی نظر میں اتنے قابل نفرت بن گئے تھے کہ تمام زندگی انھیں معاف نہیں کیا۔۔۔حامیان اسلام کی یہ منطق سمجھ سے بالاتر ہے کہ جارح اور مجروح دونوں قابل تقلید، دونوں ایمان کے ستون اور دونوں ہی رضی اللہ تعالیٰ عنہما۔ حضرت عمر کے پیرو انھیں فاروق کہتے ہیں مگر خود حق و ناحق میں تمیز نہیں کرتے حالانکہ اسلام میں راست گوئی کی بڑی فضیلت ہے مگر مسلمان غلط کو غلط اور صحیح کو صحیح کہنے کو خلاف مسلک قرار دیتے ہیں!

مالک اشتر کے بعد جوان بیٹے کی شہادت کی خبر سننا بڑے دل گردے کا کام تھا مگر علیؑ بیٹے تھے ابوطالب کے، باب خیبر ایک ہاتھ میں اٹھالیا تھا، آج غم کے دونوں پہاڑ دونوں ہاتھوں پر اٹھانے پڑے تو بشریت کے تقاضے سے دونوں پاؤں ڈگمگا رہے تھے پھر بھی علیؑ نے پوری قوت ارادی سے اپنے آپ کو سنبھالا، ہونٹوں کو حرکت دی۔ شاید زبان سے یا رسول اللہ نکلا ہو۔ سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا اور ایک پیغمبرانہ شان سے گردن جھکالی پھر اتنا کہا۔

''محمد مجھے حسنین سے کم پیارا نہ تھا۔۔۔حق ادا کردیا میری تربیت کا!''

علیؑ کا علم و عرفان، زہد و تقویٰ اور شجاعت رہتی دنیا تک ضرب المثل رہے گی لیکن صبر و تحمل پر

کسی کی نظر نہیں گئی۔ مادی دنیا کی طرف دوڑنے والے صرف یہ کہہ کر رہ جاتے ہیں کہ انھیں مسلمانوں میں قبول عام نہیں تھا لیکن کوئی یہ نہیں دیکھتا کہ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔ اقتدار کے دیوانے جھوٹ، فریب، مکر، منافقت اور ساز باز کے جو حربے علیؑ کے خلاف استعمال کرتے رہے ان کی کاٹ کے لئے ویسے ہی حربوں کی ضرورت تھی اور ان کا استعمال بساط پیغمبری سے کبھی کسی پیغمبرؑ نے نہیں کیا۔ اگر وہ سقیفہ کے انتخاب کے بعد تلوار کو بے نیام کر لیتے تو کون ان کا مقابلہ کرنے والا تھا۔ مدینے میں صرف مہاجرین کی تعداد کم یا زیادہ حضرت ابوبکر کی ہمنوا ہوتی۔۔۔۔

سعد بن عبادہ کا قبیلہ اور ابوایوب انصاری آج تک علیؑ کے ساتھ تھے تو کیا اس وقت روگردان ہو جاتے، خود بنی امیہ کے افراد جنگ صفین میں معاویہ کے خلاف لڑے تو کیا اس وقت منہ پھیر لیتے، موقر اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور تہامہ کے قبائل اور ان افراد کے اہل خاندان جن سے بجبر بیعت لی گئی تھی وہ ساتھ چھوڑنے والے تو نہ تھے لیکن علیؑ پیغمبر اسلام کے ازلی نائب تھے ان کا حصول مملکت سے کیا تعلق تھا لہٰذا انہوں نے اقتدار کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ آج مسلمانوں نے نظم و نسق بھی ان کے ہاتھوں میں دے دیا تھا مگر ان کا منصوص من اللہ منصب تو بدستور موجود تھا لہٰذا وہ اصول اسلام اور صداقت ایمان کو کیونکر ترک کر دیتے اس لئے انہوں نے ہر فریب کاری کا جواب پیغمبرانہ انداز میں دیا جس سے وہ مطمئن تھے اور صبر کے موقف میں دینی تقاضوں کو پیش کر رہے تھے۔ یہی انداز ہادیٔ برحق نے انھیں، فاطمہ زہرا کو اور دونوں نواسوں کو گھٹی میں پلایا تھا۔

علیؑ کا مقصد حیات بعد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دین کی حفاظت اور اس کی اشاعت تھا۔ کسی نے دین کی شکل بگاڑ کر اس کو جائز و ناجائز ملک گیری کے قالب میں ڈھال لیا تھا تو علیؑ کا فرض تھا کہ دنیا کو بتائیں کہ دین ایسے حالات میں کس طرز عمل کی تلقین کرتا ہے۔ بالفاظ دیگر بیک وقت اسلام کی دو تصویریں پیش کی جا رہی تھیں ایک کوفے سے اور ایک شام سے! جن لوگوں نے اس تصویر کو دیکھا تھا جو پیغمبرؑ برحق نے دکھائی تھی، وہ علیؑ کے ساتھ تھے اور باقی دوسری طرف اور آج تک وہی صورتحال چلی آ رہی ہے۔

معاویہ کی ملک گیر مہمات

علیؑ کی امامت اب نبوت کی جگہ پر تھی اور نبوت ہمیشہ سے نوع بشر کی اصطلاح میں شدائد جھیلتی نظر آئی تھی لہٰذا علیؑ پر جو کچھ گزرا وہ انہوں نے برداشت کیا اور آج بھی اس کے لئے تیار تھے۔۔۔

ادھر معاویہ کے حوصلے تسخیر مصر سے بہت بڑھ گئے تھے۔انہوں نے خلافت مدینہ کی تاراجی کا پورا منصوبہ بنالیااوراپنے جرنیلوں کو چہار جانب روانہ کردیا۔

۳۹ھ میں انہوں نے نعمان بن بشر کو دو ہزار سپاہ کے ساتھ عین التمر روانہ کیا جو مالک بن کعب سے شکست یاب ہوااس کے ساتھ ہی انہوں نے سفیان بن عوف کو چھ ہزار آدمی دے کرانبار و مدائن بھیجا۔سعید بن قیس اس کے مقابلے پر آئے تو وہ لوٹ مار کر کے بھاگ کھڑا ہوا۔

اس کے بعد معاویہ نے عبداللہ بن مسعدہ فرازی کو تہامہ روانہ کیا مسیّب بن نجبہ نے اس کو شکست دی تو وہ قلعہ بند ہو گیا مسیّب نے قلعہ میں آگ لگادی تو بحال پریشانی معافی مانگنے لگا،مسیّب نے چھوڑ دیا۔

ضحاک بن قیس تین ہزار آدمی لے کرواقوصہ کے نشیبی علاقوں پرحملہ آور ہوا حجر بن عدی نے بڑھ کراس کا سبتھراؤ کردیا۔آخر باقی ماندہ آدمیوں کے ساتھ فرار ہو کراس نے جان بچائی۔

اس سال حج میں بھی معاویہ نے خلفشار پیدا کرنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے۔
عبدالرحمٰن بن شباث جزیرہ پر حملہ آور ہوا کمیل بن زیاد نے اس کے لشکر کا بڑا حصہ کاٹ ڈالا۔صدقات وصول کرنے کی سلسلے میں ایک مقابلہ شام کے سالار زہیر بن مکحول اور علی کے جرنیل عبداللہ اشجعی کا ہوا۔ اس میں زہیر مارا گیااوراس کالشکر فرار ہو گیا۔

ذومتہ الجندل میں مسلم بن عقبہ سے مالک بن کعب کا مقابلہ ہوا جس میں مسلم کو بری طرح شکست ہوئی۔

۴۰ھ میں بسر بنی ابی ارطاہ مدینے پہنچا اور وہاں کے کئی گھر مسمار کردیئے پھر مکے آیا وہاں سے یمن پہنچا۔یمن میں عبدالمنان ان کے بیٹے اور عبداللہ ابن عباس کے دو کمسن بچوں کو اس نے قتل کردیا۔جاریہ بن قدامہ اور وہب بن مسعود تعاقب کرتے ہوئے پہنچے تو بسر فرار ہو گیا۔

معاویہ کا مقصد علاقوں کی تاراجی اور بدامنی پیدا کرنا تھا حالانکہ علی کے سرداروں کے ہاتھوں مسلسل ان کی فوج کٹ رہی تھی مگر وہ باز نہیں آئے۔ان کی نظر میں انسانی جانوں کی کوئی قیمت نہ تھی وہ تو صرف اقتدار چاہتے تھے،خواہ اس کے لئے پوری نسل آدم کی لاشوں پر سے گزرنا پڑتا۔۔۔۔۔برخلاف اس کے علیؑ کے سرفروش قوت ایمانی کے بل پر لڑتے اور میدان جنگ کی موت کو حاصل حیات قرار دیتے لہٰذا شام کے غارت گران کے سامنے ٹھہر نہ پاتے اور جانیں بچانے کا موقع نہ ملتا تو بزدلی کی موت مر جاتے۔

کہا جاتا ہے کہ اصول اسلام میں علیؑ کی شدت پسندی نے لوگوں کو ان سے بیزار کر دیا تھا اس لئے مسلمان ان سے کٹ کر معاویہ کے طرفدار بنتے جا رہے تھے۔ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اسلام تو وہی تھا جو عرب کے نجات دہندہ نے پیش کیا تھا لیکن وقت کی درمیانی فصل نے اتنی تبدیلی پیدا کر دی تھی کہ اس میں دین سے زائد کشش دنیا شامل ہوگئی تھی۔ عوام اس کے اتنے عادی ہو گئے تھے اس کو چھوڑنا نہ چاہتے۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ شام کے سیاست کار نے کشش دنیا میں اتنا اضافہ کر دیا تھا کہ اسلام برائے نام اسلام رہ گیا تھا اس میں خزانہ شاہی کی فیاضی خون بن کر دوڑنے لگی تھی۔ ایسے میں عام آدمی تو درکنار بڑے بڑے صحابہ کے قدم بھی ڈگمگا گئے تھے پھر بھی انھیں مسلسل تصادم کا دکھ تھا اس لئے بعض معتقدین نے حق و ناحق کا امتیاز کئے بغیر آپس میں ایک سمجھوتہ کرانے کی کوشش کی۔

معاویہ نے خلافت علیؑ کے کئی مضبوط ستون مسمار کروائے تھے مگر جنگ صفین کو وہ نہ بھولے تھے۔ ان میں ہمت نہ تھی کہ کھلے میدان میں علیؑ کے مقابلے پر آ سکیں۔ صفین میں اشعث بن قیس اور ابو موسیٰ الاشعری کو مکر و فریب کی سپر بنا کر بچ گئے تھے لیکن اب کوئی ایسی نبرد آزمائی ہوتی تو دمشق میں بھی پناہ نہ ملتی پھر صلح کی شرائط میں انہوں نے درمیانی لوگوں سے یہ لکھوایا تھا کہ بحالت موجودہ جو جس کی حدود ہیں ان میں ایک دوسرے سے کوئی تعرض نہ کرے گا۔ دونوں فریقوں نے اس کو مان لیا مگر علیؑ نے معاویہ کو خلیفہ تسلیم نہیں کیا۔

بعض ثقہ محققین اس صلح کو صرف اموی مورخین کی تاریخی کہانی قرار دیتے ہیں جو علیؑ کی وقعت گرانے کے لئے تصنیف کی گئی ان کا کہنا ہے کہ معاویہ کی ہمت تو مسلسل ناکام حملوں کے نتیجے میں پست ہوگئی تھی لہٰذا انہوں نے کسی بڑے حملے کی تیاری کے لئے خاموشی اختیار کر لی اور بیک وقت تلوار اور زہر دونوں کے محاذ کھولنے پر عملدرآمد شروع کر دیا۔ سامنے کی بات یہ ہے کہ علیؑ اپنے معزول کردہ کا قبضہ تسلیم کر لیتے؟

بہرحال حضرت علیؑ کے لئے بھی وقتی سکون بہت ضروری تھا۔ انہوں نے اس خاموشی کو غنیمت سمجھا۔ مالک اشتر کے بعد وہ اپنی فوجی طاقت میں کمزوری محسوس کر رہے تھے اور ان کے ہوا خواہ بھی مسلسل جنگوں سے دل برداشتہ ہو چکے تھے۔ علیؑ جانتے تھے کہ ان کے ایمان میں کوئی خامی نہیں ہے مگر بشریت کے تقاضے سے وہ لیت و لعل کر رہے ہیں۔ یہ غلط ہے کہ علیؑ کے پاس سچے مسلمانوں اور فداکاروں کا فقدان ہو گیا تھا۔ اب بھی بہت سے ایسے لوگ تھے جن پر پورا اعتماد کیا جا سکتا لیکن وہ مختلف علاقوں میں حفاظتی حصار کا درجہ رکھتے۔ انھیں وہاں سے ہٹایا نہ جا سکتا۔ معاویہ کو صفین کے فریب کا

جواب بھی دینا تھا اس لئے بعض مورخین کے بقول علیؑ نے ۴۰ھ میں وقتی معاہدہ کر لیا جس میں کسی باغی کو سزا نہ دینے کی کوئی دفعہ نہیں تھی اور نہ اس کی شرط تھی کہ اسلام میں تحریف یا ترمیم کرنے والا قابل معافی ہوگا لیکن اسلام کے نام پر غیر اسلامی افعال کا مرتکب بہر طور مستوجب سزا تھا لہٰذا یہ بیان ایک تاریخی کہانی معلوم ہوتا ہے۔

تاریخ عالم نے اسلام سے قبل بڑے بڑے سورما پیدا کئے ہیں جن میں مذہبی داستانی اور تاریخی کردار، ارجن ہرکولیز، رستم وسہراب اونٹونیو اور دارا و سکندر سب آتے ہیں لیکن ان میں سے کسی کے بارے میں نہیں کہا جاسکتا کہ اس نے کبھی میدان میں پیٹھ نہیں دکھائی۔ یہ شرف صرف اور صرف علی ابن ابی طالب کو حاصل ہے کہ نہ کبھی جنگ سے بھاگے اور نہ شکست کھائی۔ صفین پہلی رزم گاہ تھی جس میں علیؑ قرآن کے سیاسی فریب کے طور پر استعمال ہونے کے باعث ناکام ہوئے۔ اس کو شکست سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا پھر بھی علیؑ کو اس کا دکھ تھا اور وہ معاویہ کو ایک سبق دینا چاہتے تھے لیکن زہر کا غیر شرعی استعمال کر کے ان کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا گیا پھر پے در پے بزدلانہ حملے کر کے ذہن کو الجھا دیا گیا۔ علیؑ کے لشکری اس مکاری پر بہت مشتعل تھے مگر علیؑ نے بڑے تحمل سے کام لیا اور تھکے ماندے مسلمانوں میں ایک روح تازہ پھونکنے کی کوشش کی۔

منصوبے کے مطابق چند روز کے وقفے سے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانشین نے ایک بڑے اجتماع کا التزام کیا اور مسلمانوں کو اس طرح مخاطب کیا جیسے وہ کوئی بہت اہم پیغام دینے والے ہوں۔

وقت کی ناسازگاری اور زمانے کی بیوفائی کا حوالہ دیتے ہوئے آپ نے فرمایا۔

''کہاں ہیں میرے بھائی جو صراط مستقیم پر چلتے رہے اور حق پر گزر گئے!

کہاں ہیں عمار، کہاں ہیں ابن تیہام، کہاں ہیں ذوالشہادتین، کہاں ہیں وہ بھائی جنہوں نے مرنے کے عہد و پیمان کئے تھے اور جن کے سروں کو کاٹ کر فاسقوں کے پاس بھیجا گیا تھا!''

پھر آپ نے ریش مبارک پر ہاتھ پھیرا۔ آنسو دونوں رخساروں پر بہہ رہے تھے اور آپ اس لب ولہجے میں مخاطب تھے گویا راہ حق میں جہاد کرنے والوں کو خراج تحسین پیش کر رہے ہوں۔

بولتے بولتے آپ نے سنبھل کر بلند آواز میں فرمایا۔

''جہاد، جہاد ــــــ بندگان خدا جہاد ــــــ!''

''میں لشکر تیار کرنے جا رہا ہوں ـــــ جو خدا کی طرف بڑھنا چاہے وہ بڑھے!''

قدرے توقف سے آپ نے ایک گہری سانس لی پھر بڑے تحمل سے کہا۔
''میری خلافت قبول کرنے کے بعد شورش پسندوں نے ہنگامہ کیا۔۔۔ خیر خدا نے ان کی پریشانیوں سے نجات دی، انھیں ذلیل کیا، ان کی کوششوں کو ناکام بنایا اور ان کا انجام برا کیا۔
ایک جماعت اسلام میں فتنے پھیلا رہی ہے ہوا و ہوس پر عمل پیرا ہے۔ اسلام میں غلط فیصلے کرتی ہے مگر وہ جس چیز کی مدعی ہے ہرگز اس کی اہل نہیں۔۔۔
میں تمہیں آگاہ کرتے کرتے اور سمجھاتے سمجھاتے تھک گیا ہوں، صاف صاف کہہ ڈالو کہ چاہتے کیا ہو؟
دشمن کی طرف کوچ کرنے پر آمادہ ہو تو بہتر ہے، نہیں چلنا چاہتے تو واضح طور پر بتا دو تاکہ میں کوئی فیصلہ کر سکوں۔ خدا کی قسم ! اگر تم جنگ کے لئے نہ چلو گے اور اس وقت تک نہ لڑو گے جب تک احکم الحاکمین ہمارے مابین فیصلہ نہ کر دے۔۔۔
نہیں چلتے تو میں تمہارے لئے بددعا کروں گا اور خود روانہ ہو جاؤں گا، خواہ میرے ساتھ دس آدمی ہی کیوں نہ ہوں!
شام کے اوباش اور فریب خوردہ لوگ گمراہی کی مدد کرنے اور باطل پر متحد ہونے میں تم سے زیادہ ثابت قدم ہیں حالانکہ تم جادہ ہدایت اور راہ حق پر ہو اور وہ مسلک باطل پر۔۔۔
شام والے بھی تمہارے ہی جیسے انسان ہیں، ایک مرتبہ مرنے کے بعد قیامت تک زندہ نہ ہوں گے!''

سرداران فوج اس خطبے پر بہت شرمندہ ہوئے۔ انھیں یقین ہو گیا کہ امیر المومنین جو کہتے ہیں وہ کر گزریں گے اور یہ ان سب کے لئے بڑی ذلت کی بات ہو گی۔۔۔ پھر آپس میں مشورہ کر کے انھوں نے امیر المومنین کو اپنی وفاداری کا یقین دلایا اور اپنے اپنے قبیلوں کو جمع کرنے میں لگ گئے۔
معقل ابن قیس بصرے روانہ ہو گئے۔ وہاں اپنے لوگوں کو یکجا کیا اور ان سب کو لے کر کوفے آ گئے۔ اسی طرح اور لوگوں نے بھی کیا اور نواح کوفہ میں فوجوں کا اجتماع شروع ہو گیا۔

شہادت امیر المومنین

چند روز کی دوطرفہ خاموشی بظاہر دو فریقوں کے آرام کا وقفہ تھا لیکن اس میں دونوں اپنی تدابیر کے لئے بھی غافل نہیں ہوئے پھر بھی علیؑ کے تصور سے معاویہ کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے اور جنگ

صفین کا منظر نگاہوں میں پھرنے لگتا اور دوسری بار میدان داری کے خیال سے انھیں پسینہ آنے لگتا۔۔۔ لیکن اس جنگ میں شکست کا رخ انہوں نے جس طرح پھیرا تھا۔ اس پر انھیں آج بھی اعتماد تھا لہٰذا جنگ کا ارادہ ترک کر کے مالک اشتر کی طرح وہ علیؑ کو بھی راستے سے ہٹا دینے کی سوچنے لگے۔

شام کے خلیفہ نے علیؑ کے لئے ابھی کسی منصوبے کو عملی شکل نہیں دی تھی کہ کوفے میں فوجیں جمع ہونے کی خبر سنی اور انھیں ایک گھبراہٹ ہونے لگی۔ اب انہوں نے تیزی کے ساتھ علیؑ کے لئے غور شروع کر دیا۔ ایک فیصلہ کر کے اشعث بن قیس سے رابطہ قائم کیا اور اشعث بن قیس اب خارجیوں کا سرگروہ تھا جس کے بعد خارجیوں سے معاویہ کے تعلق پر کوئی بحث لاحاصل ہوگی کیونکہ محمد بن اشعث کو آگے چل کر کوفے کا کوتوال بنایا گیا تھا اور جعدہ بنت اشعث سے امام حسنؑ کو زہر دلایا گیا تھا۔

کام بہت مشکل تھا مگر اشعث نے کسی ایسے آدمی کی تلاش شروع کر دی جو علیؑ کا سخت ترین دشمن ہوتا۔ اتفاق سے اس کی ملاقات ابن ملجم سے ہوگئی۔ دونوں کبھی علیؑ کے ہواخواہوں میں تھے۔ اب اشعث علی دشمن تھا اور عبدالرحمٰن ابن ملجم غیر جانبدار مگر مقدرات نے اس کو علیؑ کے دشمنوں کی صف میں لا کھڑا کیا۔۔۔ کیونکہ وہ ایک عورت قطامہ کے عشق میں مبتلا تھا اور قطامہ علیؑ کے خون کی پیاسی تھی۔ جنگ نہروان میں اس کے باپ بھائی مارے گئے تھے اور اس نے عہد کیا تھا کہ جب تک علیؑ سے اس کا بدلہ نہ لے لے گی چین سے نہ بیٹھے گی۔ ابن ملجم سے اس نے کہا تھا کہ میرا مہر تین ہزار درہم، ایک غلام، ایک مطربہ لونڈی اور علیؑ کا سر دے سکے تو وہ اس سے شادی کر لے گی۔ یہ بات اشعث کو کسی خارجی سے یا خود قطامہ سے معلوم ہوئی تھی۔ ایک قیاس یہ بھی کیا جاتا ہے کہ اس کی اطلاع خلیفہ شام کو ہوگئی ہو اور انہوں نے اشعث کو ابن ملجم کا حوالہ دیدیا ہو، حقیقت جو کچھ بھی ہو لیکن اشعث نے ابن ملجم کو مطلوبہ مہر سے زائد رقم اور سامان فراہم کر دینے کا وعدہ کر لیا اور وہ اس کام پر تیار ہوگیا جس کو وہ کرنا نہ چاہتا تھا۔۔۔ لیکن جنون عشق کی دیوانگی نے اس کو اندھا کر دیا اور وہ قطامہ کے ایک آدمی وردان اور اشعث کے ایک ملازم شبیب بن بجیرہ کو ساتھ لے کر اپنی مہم پر روانہ ہوگیا۔

اشعث نے مسجد سے تھوڑے فاصلے پر ایک خیمہ نصب کرا دیا تھا۔ بعض روایات کے مطابق اشعث کا ایک آدمی دن کو اس خیمے میں دیکھا گیا تھا۔ ابن ملجم مرادی دونوں رفیقوں کے ساتھ اسی خیمے میں جا کر ٹھہر گیا اب وہ واقعی امیر المومنین کا سخت دشمن ہو رہا تھا اور بار بار مسجد کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شاید اشعث یا قطامہ نے اس کو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سرمایہ ایمان کے خلاف اتنا بھر دیا تھا کہ اس کا عقیدہ بیعت دین سے عناد میں بدل گیا تھا۔

بعض تذکروں میں ایک واقعہ ملتا ہے کہ محمد بن اشعث بھی مسجد کے باہر موجود تھا اور حجر بن عدی نے اس کی آواز سنی تھی۔ وہ ابن ملجم سے کہہ رہا تھا کہ جلدی کرو ورنہ وقت نکل جائے گا۔ حجر فوراً علیؑ کے گھر کی طرف دوڑ پڑے تھے مگر آپ دوسرے راستے سے چلے تھے حجر ان کو نہ پا سکے اور علیؑ مسجد میں پہنچ گئے۔ ایک روایت کے مطابق ابن ملجم اور اس کے ساتھی نصف شب کے بعد مسجد میں جا کر سو رہے تھے۔ خود امیر المومنین نماز صبح کے لئے مسجد میں آئے تو سب کو جگایا۔۔۔ بہر حال جب امیر المومنین مصلے پر پہنچے تو ابن ملجم اور اس کے دونوں رفیق پشت پر بالکل عقب میں موجود تھے جیسے ہی آپ پہلا سجدہ کر کے اٹھے، شبیب نے تیزی کے ساتھ کھڑے ہو کر وار کیا جو خالی گیا دوسرا وار ابن ملجم نے کیا جو سر اقدس پر پورا بیٹھا اور سر میں دماغ تک شگاف پیدا ہو گیا۔

تلوار اسی قسم کے زہر میں بجھی ہوئی تھی جو مالک اشتر کو دیا گیا تھا۔۔۔ یہ تلوار اشعث نے ابن ملجم کو دی تھی، جس کی ضرب ٹھیک اسی جگہ پر لگی جہاں جنگ خندق میں عمرو ابن عبدود کی تلوار پڑی تھی لہٰذا تلوار کی دھار آسانی سے سر میں در آئی اور اپنا کام کر گئی۔

ابن ملجم تلوار ہلاتا ہوا سرعت کے ساتھ بھاگا۔ شبیب اس سے قبل بھاگ چکا تھا وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا لیکن نمازیوں میں سے مغیرہ بن نوفل نے اپنی چادر ابن ملجم پر پھینک دی جس میں وہ الجھ گیا اور پکڑ لیا گیا۔

مسجد کوفہ میں نماز سے قبل علیؑ کی آواز آخری بار اذان میں گونجی تھی دوسری آواز قد قتل امیر المومنین کی بلند ہوئی جو کوفے کے ہر گھر میں سنائی دی اور لوگ بے اختیار مسجد کی طرف دوڑ پڑے۔

قاتل نے ایک عورت کے جمالیاتی سحر میں مبتلا ہو کر بعد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پہلا ستون اسلام گرا دیا تھا مگر اس کو نہ دنیا ملی اور نہ دین۔ دنیاوی زندگی بھی جنت نہ بن سکی اور آخرت میں بھی دوزخ ہی ملا ہوگا البتہ دمشق میں چراغاں کیا گیا اس چراغاں کو خلافت شام کے پہلے جشن سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

قاتل کی تلوار اچانک امیر المومنین کے سر پر پڑی تھی تو آپ کے منہ سے نکل گیا تھا۔ ''برب کعبہ میں کامیاب ہوا۔۔۔!''

اس طرف خلیفہ شام نے بھی اس کو اپنی کامیابی قرار دیا کیونکہ جس خلافت کو وہ میدان جنگ میں حاصل نہ کر سکتے تھے، اس کو انہوں نے زہر میں بجھی ہوئی تلوار کی ایک ضرب، سنہرے سکوں کی چمک دمک اور غیر اسلامی سازش سے حاصل کر لیا۔

لیکن درحقیقت کامیاب کون ہوا؟ اس کو دین و دنیا میں تقسیم کردیا جائے تو دونوں کامیاب ہوئے ایک حصول دین میں دوسرا حصول دنیا میں، ایک بساط اسلام پر دوسرا تخت شاہی پر۔

علیؑ حیات و موت دونوں میں کامیاب تھے آپ کی خلقت اسلام اور بانی اسلام کے سرپرست ابوطالب کے صلب سے ہوئی تھی، خالق کی طرف سے بیت اللہ میں وارد ہوئے، تربیت ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زیر سایہ آغوش خدیجۃ الکبریٰ میں پائی۔ پوری زندگی خدمت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حفاظت اسلام میں گزاری، بعد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ کے دین کی اشاعت کرتے رہے اور مسجد کوفہ سے خدا کی طرف واپس چلے گئے۔

معاویہ کو اس میزان پر تولا جائے تو حلقہ عقیدت کے لئے قابل برداشت نہ ہوگا آپ کی والدہ ہندہ بنت عتبہ بن ربیعہ بن عبد الشمس کے لئے ابن ابی الحدید اور ابن عبدالبرہ کے اقوال کے حوالے کافی ہوں گے دوسری کتب تواریخ نے بھی بدکرداری پر روشنی ڈالی ہے۔ جنگ احد میں حضرت حمزہ کے سلسلے میں اسلام دشمنی محتاج بیان نہیں۔ آپ کے والد ابوسفیان تاریخ اسلام کے ہر موڑ پر ابوطالب اور پیغمبرؐ عرب کے شہرہ آفاق حریف تھے۔ حسان بن ثابت کی ہجو ان کی سیرت کا علامیہ کہی جاسکتی ہے۔

حضرت معاویہ کی ولادت بعثت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سات آٹھ سال قبل ہوئی تھی یعنی اس وقت جب ابوسفیان اصنام کعبہ کے سرپرست اعلیٰ تھے بالفاظ دیگر معاویہ کفر کے بطن سے متولد ہوئے اور کفر کے دامن میں پرورش پاتے رہے۔ فتح مکہ تک آپ اپنے پدر بزرگ کے ساتھ ساتھ تھے اور اسلام کی بیشتر مہمات میں دشمنی کا چھوٹا بڑا کردار ادا کرتے رہے تھے۔

رمضان ۸ھ میں آپ ابوسفیان کے ساتھ حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ ۱۸ ذی الحج ۱۰ھ کو غدیر خم میں دین کی تکمیل ہوگئی یعنی آپ کے اسلام لانے کے دو سال ڈھائی ماہ بعد۔ اس کو دو سال سے بھی کم سمجھنا چاہئے اس مدت میں خود ابوسفیان کا بارگاہ رسالت میں تقرب ثابت نہیں ہوتا تو معاویہ تو دوسرے بزرگوں کے سامنے قابل ذکر ہی نہیں تھے۔

پدر او در دندان پیمبر بہ شہید
مادر او جگر عم پیمبر بہ چکید
اور بہ ناحق، حق داماد پیمبر بگرفت
پسر او سر فرزند پیمبر بہ برید

خواجہ معین الدین چشتی

معاویہ نے کتنی بار کتابت کا شرف حاصل کیا ہوگا کیونکہ وحی کے متعلق ایک حدیث صحیح بخاری میں ملتی ہے۔ ''مجھے عائشہ کے سلسلے میں تکلیف نہ دیا کرو، اس کے لحاف میں مجھے وحی آتی ہے، کسی اور بیوی کے لحاف میں نہیں''۔ ان حالات میں معاویہ کا وحی کو قلم بند کرلینا ناممکن تو نہیں لیکن مشکل ضرور معلوم ہوتا ہے۔ سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ ان کی موجودگی میں کتنی مرتبہ وحی آئی ہوگی جس کو انہوں نے اپنی جگہ پہنچ کر نقل کیا ہوگا۔ خون لگا کر شہیدوں میں داخل ہونے کی بات سمجھ میں آتی ہے لیکن کاتب وحی ہونے کا اعزاز دیدینا آنکھوں میں خاک ڈالنے کے سوا کچھ نہیں ہے اور علیؑ کے مقابلے میں جنھیں پورا قرآن حفظ تھا اور جنہوں نے تن تنہا قرآن کو بلحاظ تنزیل یکجا کیا تھا لیکن حضرت ابوبکر نے اس کو قبول نہیں کیا اور خود اپنے طور پر قرآن جمع کرانا شروع کردیا جو حضرت عثمان کے عہد میں مکمل ہو سکا۔ تکمیل کے سلسلے میں کہیں حضرت معاویہ کا نام ہی نہیں آتا بس یہ فضیلت سننے میں آتی ہے کہ کاتب وحی تھے۔

اس کو راویوں کی کرشمہ سازی کے سوا کیا کہا جائے، جیسے کہ شہادت علی کے لئے کہانی گڑھ لی گئی کہ تین خارجیوں نے تین آدمیوں کے قتل کا منصوبہ بنایا تھا علیؑ، معاویہ اور عمرو عاص جن کے لئے آدمی بھی روانہ ہوگئے تھے مگر علیؑ زد پر آگئے اور باقی دو بچ گئے۔ اشعث بن قیس معاویہ کا خریدا ہوا جس نے جنگ صفین کا پانسہ پلٹ دیا تھا اور اسی طرح کے دوسرے وظیفہ خوار جو خارجیوں کے نمایاں افراد تھے اور خارجیوں کی پوری تنظیم، جس کے لئے دمشق کے خزانے کا منہ کھلا ہوا تھا، سب کچھ شام کے خلیفہ کا کیا دھرا، خارجیوں کی اکثریت انھیں خلیفہ ماننے والی اور وہ معاویہ اور عمرو عاص کے قتل کا منصوبہ بنالیتے؟ بڑی ستم ظریفی ہے مگر اس کی اتنی مشتہری کرائی گئی کہ مستقبل میں اکثر لوگوں نے اسی کو حقیقت سمجھ لیا۔

یہ ہے خلافت برحق کے پہلے باب کا اختتامیہ جس میں حقائق تاریخ کو جھوٹی روایتوں سے اس طرح چھپادیا گیا کہ آج انھیں کرید کر سامنے لایا جائے تو کہا جاتا ہے کہ لکھنے والے کی تصنیف ہیں! داد دینا پڑتی ہے فطانت ذہن اور ذکاوت فکر کی جس نے ظالم کو حق بجانب اور گنہگار کو بے گناہ بنادیا!

بنگاہ غائر دیکھا جائے تو دنیا کو حقیقتاً علیؑ کی ذات سے کوئی مخالفت نہ تھی۔ شروع میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جائز وارث کی حیثیت سے مظالم کے پہاڑ ڈھائے گئے اور اقتصادیات کی اتنی مار دی گئی کہ کسی میں حصول خلافت کا حوصلہ باقی نہ رہے لیکن جب ہر ایک کو معلوم ہوگیا کہ علیؑ کو اقتدار یا حکومت کی کوئی خواہش نہیں ہے تو سب مطمئن ہوگئے اور علیؑ نے اسلام کی بگڑتی ہوئی صورت کو سنوارنے کے سوا کسی بات سے کوئی سروکار نہ رکھا۔ آپ کا ازلی منصب ختم المرسلین کی نیابت تھا، اس کو چھیننے کی کسی

میں اہلیت نہ تھی لہٰذا علیؑ کے معمولات میں کوئی مداخلت نہیں کی گئی بلکہ ناگزیر ضرورت کے موقع پر تعاون کی درخواست بھی کی گئی جس میں علیؑ نے کوئی کوتاہی نہیں کی۔

اب بھی آپ کو خلافت کی کوئی طلب نہیں تھی لیکن نظم و نسق مملکت بھی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کا ایک ذیلی پہلو تھا اور مسلمان اس کو سنبھالنے کے لئے بضد تھے تو علیؑ کا انکار فرض کو پورا نہ کرنے کے مترادف ہوتا لہٰذا آپ نے قبول کرلیا اور اس کو ان خطوط پر چلانا شروع کر دیا جس پر آنحضرت کے وقت میں چلتا تھا لہٰذا دنیاداروں کے مفاد پر ضرب پڑی اور تمام مدعیان خلافت علیؑ کے دشمن ہو گئے جن میں معاویہ ایک مضبوط حریف تھے۔ انہوں نے شاہی کے مکر و فریب سے ہادیانہ خلافت کو پارہ پارہ کر دیا اور علیؑ کو موت کے گھاٹ اتار دیا حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ''حضرت علیؑ کی موت ایک ایسے شخص کی موت تھی، جو ان تمام افراد میں، جن کی یاد تاریخ اسلام نے محفوظ رکھی ہے، سب سے صادق القلب اور افضل ترین مسلمان تھے اگر حضرت علیؑ سات سو سال پہلے دنیا میں آئے ہوتے تو انھیں عیسوی کلیسا کی طرف سے ولایت کا درجہ عطا ہوتا اور اگر تیرہ صدی بعد آتے تو ان کی ذہانت، قابلیت، نیک سیرتی اور شجاعت مہذب دنیا سے خراج تحسین حاصل کرتی۔

ایک حکمراں کی حیثیت سے وہ بہت پہلے پیدا ہو گئے ان میں صداقت پسندی، حلم و تواضع اور رحم دلی کی جو صفات تھیں ان کے ہوتے ہوئے، بنی امیہ کے غداریوں اور دروغ بافیوں سے نپٹنا ان کے بس کا کام نہ تھا۔''

اسپرٹ آف اسلام مولفہ جسٹس امیر علی میں حضرت علیؑ کی شہادت پر میجر براؤن کے تبصرے کا یہ مختصر سا اقتباس علیؑ کی زندگی کے بعض گوشوں کا خلاصہ ہے۔ اس میں خلافت کے اضافی پہلو کی کچھ صراحت شامل کی جائے تو ماننا پڑے گا کہ ریگزار عرب کے ہادی نے حکومت الٰہیہ کے لئے جو زمین تیار کی تھی اور اپنے نائب برحق کو جو مزاج حکمرانی عطا کیا تھا، وہ اپنے مرشد سے مسلسل رہتا، درمیان میں کوئی فصل واقع نہ ہوتا، مسلک نظم و نسق میں مصلحتوں اور مفاد پرستی کی دیواریں کھڑی نہ کر دی جاتیں تو صداقت رفتاری میں کوئی فرق واقع نہ ہوتا، لیکن اس کو اسلام کی بدنصیبی ہی کہنا چاہئے کہ علیؑ کو موقع اس وقت ملا جب دو ابتدائی فرمانرواؤں کے بعد تیسرے کی خودغرضانہ اقربا پروری پوری بساط حکومت پر اپنے پنجے گاڑ چکی تھی اور دلوں کے ایمان خالص پر حرص دنیا کی مہریں ثبت ہو چکی تھیں۔

ایسے میں شاگرد تو شاگرد، اگر خود استاد مطلق بھی آتا تو اس کو انھیں حالات سے گزرنا پڑتا جن سے ابوطالب کا بیٹا دوچار ہوا۔ علیؑ کی شہادت کے انداز میں لفظ خلافت کو استعمال کرنا اسلام کی توہین

کے مترادف ہے۔ کھلے لفظوں میں ایک بادشاہ نے دوسرے کو بادشاہ سمجھ کر راستے سے ہٹایا تھا اور حصول تخت وتاج کے لئے زہر آلود تلوار کا استعمال کیا تھا۔ یہی دو حربے دمشق کے اسلحہ خانے کا طرہ امتیاز تھے۔ علیؑ کی میت کوفے میں کسی بادشاہ کی طرح اٹھائی نہیں گئی بلکہ جنازے کی شان دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ پیغمبرؐ اسلام کا مسلک سر برہنہ اپنے مستقبل کا ماتم کر رہا ہے۔ مدینے کی فضا میں رحلت رسول پر جو سوگواری اور اداسی چشم فلک نے دیکھی تھی۔ آج کوفے میں اس کا ایک منظر دکھائی دے رہا تھا جس میں مستقبل کے روز عاشور کی جھلک پائی جاتی تھی! مسلمان علیؑ کو چوتھے خلیفہ راشد کی حیثیت دیتے ہیں جو دنیاوی تاریخ کی بات ہے لیکن سچ یہ ہے کہ آپ پیغمبرؐ اسلام کے بعد کائنات کے ہادی برحق تھے اور بنی نوع انسان کے لئے حصول اکل حلال کی ایک نظیر تھے۔ آپ نے یہودی کے باغ میں مزدور کی حیثیت سے کام کیا، مٹی ڈھوئی، کنویں سے پانی کھینچا، پودوں کو سینچا اور دنیا کو بتایا کہ کسب معاش جائز طریقے سے حاصل کیا جائے تو کوئی کام چھوٹا نہیں ہے۔ اجرت میں آپ بالعموم جو لیا کرتے تھے۔ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیٹی یعنی آپ کی رفیقہ حیات فاطمہ زہراؑ جو خود چکی پیس کر آٹا تیار کرتیں۔ روٹی پک کر تیار ہوتی اور کوئی مانگنے والا آ جاتا تو اس کو دیدی جاتی اور اہل بیت اطہار کو اکثر بغیر کچھ کھائے سو جانا پڑتا تھا۔

عملی زندگی کا یہی مزدور علم وعرفان، شجاعت وایمان حکمت وذہانت اور جود وسخا کا پیکر تھا، سب سے پہلا جامعہ قرآن، خطیب، شاعر۔ مرنے سے کچھ دن پہلے مسجد کوفہ میں سر منبر فرمایا تھا کہ ''پوچھ لو جو کچھ پوچھنا ہے قبل اس کے کہ میں تمہارے درمیان نہ رہوں'' مگر دنیا نے اس سے فائدہ نہ اٹھایا اور آخر رمضان ۴۰ھ میں باسٹھ سال کی عمر میں عارف کنز مخفیہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔

کاش دنیا اس کا نام کسی فریب کار بادشاہ کے ساتھ نہ لیتی۔۔۔ جو بقول مولانا روم فخر انبیاء اور مرشد اولیا تھا!

پانچواں خلیفہ راشد
دوسرا امام

خلیفہ شام نے اپنی دانست میں علی کو راستے سے ہٹا کر دنیائے اسلام کی بادشاہت حاصل کر لی تھی اور اس حصار کو توڑ دیا تھا جس سے صبح صادق کے اجالوں کی چھوٹ نکل کر شام کے اندھیروں کو باطل کر سکتی لیکن نتیجہ خلاف توقع نکلا۔ اسلام کی چاشنی کے علم بردار اس بزدلانہ حرکت پر غم اور غصے میں اتنے مشتعل ہوئے کہ بس چلتا تو بجلیوں کی طرح کوند کر دمشق پر ٹوٹ پڑتے لیکن جنگی دور اندیشی نے انھیں روک لیا پھر بھی انھوں نے پہلا کام یہ کیا کہ امام حسن ابن علیؑ کو بانی اسلام کی مسند پر بٹھا دیا اور علی کے ادھورے کام کو مکمل کرنے میں لگ گئے۔

کہا جاتا ہے کہ امام حسن آنحضرت کی شکل وصورت سے بہت مشابہ تھے۔ اصحاب انھیں دیکھتے تو ان کی آنکھوں میں عہد رسالت گردش کرنے لگتا اور جذبہ صداقت وشہادت ان کی رگوں میں انگڑائیاں لینے لگتا۔ معاویہ کے خبر رساں لمحے لمحے کی خبریں دمشق پہنچا رہے تھے۔ خلیفہ شام نے اس کو دودھ کا ابال تصور کیا، تفرقہ پردازی کی رفتار زیادہ تیز کر دی پھر وقت کو سازگار دیکھ کر ایک طوفان لے کر خود بھی شام سے چل پڑا۔

امام حسنؑ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یادگار بھی تھے اور جانشین بھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؑ کی طرح حسنؑ کو بھی اپنی زبان چسائی تھی۔ اس کے بعد آپ سیدہ عالمیان کے دودھ سے پرورش پانے لگے۔۔۔ آپ کی تربیت کے لئے صرف حضرت فاطمہ زہرا صلواۃ اللہ علیہا کا نام کافی ہوگا۔ اس پر مستزاد یہ کہ مدینۃ العلم اور باب مدینۃ العلم دونوں سے فیض حاصل کیا پھر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کا پر آشوب دور بھی دیکھا۔ حضرت علیؑ کی خلافت ظاہری میں آپ پوری طرح جوان تھے۔ جنگ صفین میں جو ہر شجاعت دکھائے۔ بعد کے زمانے میں معاویہ کی سازشیں بھی آپ کے

علم میں تھیں اور وہ دور بھی یاد تھا جب امیر المومنین معاویہ پر حملہ کرنا چاہتے تھے لیکن لوگوں نے تعاون نہیں کیا۔

حضرت علیؑ کی شہادت کے بعد جب آپ کو باتفاق منصب خلافت پر بٹھایا گیا تو حالات روز روشن کی طرح آپ کے سامنے تھے۔کوفہ شامی جاسوسوں اور خلافت کے غداروں سے بھرا ہوا تھا۔ اشعث ابن قیس، عمرو بن حریث۔شیث ابن ربعی، عمار بن ولید، حجر بن عمر، عمر ابن سعد، ابو بردہ بن ابوموسیٰ اشعری، اسمٰعیل بن طلحہ اور اسحاق بن طلحہ کتنے ہی لوگ تھے جن کا دمشق سے رابطہ تھا۔خارجیوں کے نام ان سے الگ لئے جاتے ہیں مگر یہ تاریخی خیانت ہے۔عبداللہ بن وہب، عبداللہ بن الکواء اشعث بن قیس اور شمر ذی الجوشن وغیرہ بھی انہی میں شامل تھے۔یہ معاویہؓ کی سیاست تھی کہ وہ علیحدہ علیحدہ دو گروہوں کو ایک ہی ہدایت دیتے تا کہ ایک کی خبر دوسرے سے ملتی رہے۔

ان بگڑے ہوئے حالات میں بھی جوہر خالص ابن علیؑ کے پاس موجود تھا۔قیس بن سعد، عدی بن حاتم، معقل ابن قیس ریاحی اور زیاد بن صعصعہ وغیرہ وہ افراد تھے۔جنہوں نے ایسے ہی حالات میں علیؑ ابن ابی طالب کا ساتھ دیا تھا اور علیؑ کی شخصیت کا سہارا لے کر بے غیرتوں کو غیرت دار بنا کر لڑنے پر تیار کر لیا تھا لیکن فی الوقت شام کے اسلحہ خانے سے زر و جواہر کی ایسی بارش ہو رہی تھی کہ ساری قوم لوٹنے میں لگ گئی آخر جس طرح مسلمانوں نے اُحد میں رسول کو تنہا چھوڑ دیا تھا اسی طرح آپ کے نواسے کے گرد بھی صرف چند ہوا خواہ باقی رہ گئے۔ایسے میں بنی ہاشم بھی متحد نہ رہ سکے۔

عبداللہ ابن عباس نے علیؑ سے روگردانی ضرور کی تھی مگر شام کی پناہ میں نہیں گئے اور چند روز بعد سنبھل بھی گئے مگر ان کے چھوٹے بھائی عبیداللہ ابن عباس نے یہ بھی کر دکھایا اور امام حسنؑ کے لشکر سے نکل کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ معاویہ کی طرف روانہ ہو گئے۔اسی طرح شب کی تاریکی میں روز کچھ نہ کچھ آدمی جاتے رہے اور اس کا اثر عام سپاہیوں پر برابر پڑتا رہا۔پھر بھی قیس بن سعد اور عدی بن حاتم طائی بزدلی کو دور کرنے کی کوششیں کرتے رہے۔

علیؑ نے حصول خلافت کے لئے تلوار نہیں اٹھائی تھی لیکن تحفظ اسلام کے لئے ذوالفقار کو بے نیام کر لیا تھا وہی ذمہ داری اب امام حسنؑ پر آپڑی تھی مگر گرد و پیش کے غداروں کو نظر انداز نہ کیا جا سکتا آپ کا مقصد حیات میدان جنگ کی شہادت بھی ہو سکتا تھا مگر اس کے بعد تحفظ اسلام کی رہی سہی امید بھی ختم ہو جاتی اس لئے آپ نے پدر عظیم کی طرح تحمل و بردباری سے کام لیا۔

معاویہ کا جو طریقہ کار حضرت علیؑ کے عہد میں رہا تھا۔اس پر اس دور میں زیادہ شدت سے عمل

ہورہا تھا لہٰذا ایک طرف تو انہوں نے صلح کی سلسلہ جنبانی کی اور دوسری طرف ساٹھ ہزار کا لشکر لے کر شام سے چل پڑے۔

جن کے مقابلے پر امام حسن علیہ السلام نے بارہ ہزار فوج بطور ہراول روانہ کی اور باقی لشکر کے ساتھ خود عقب میں بڑھنے لگے۔ صفین کا کھلاڑی مکروفریب کا ہر داؤں پہلے ہی عمل میں لا چکا تھا اور اپنے آدمی اس نے امام حسنؑ کے لشکر میں پھیلا دیئے تھے۔ اس موقع پر ایک طرف تو اس نے قیس کے لشکر میں یہ خبر اڑائی کہ امام حسنؑ نے معاویہ سے صلح کر لی ہے لیکن جہاندیدہ قیس خود اسی میدان کے شہسوار تھے، معاویہ ان سے بازی کیا لے جاتے مگر دوسری طرف امام حسنؑ کے ساتھیوں میں جب یہ خبر پھیلی کہ قیس نے صلح کر لی تو وہ بددل ہو گئے۔ ایسے میں معاویہ کے آدمی ٹوٹ پڑے اور انہوں نے اعلان کر دیا۔

''حسنؑ اپنے باپ کی طرح کافر ہو گئے ہیں۔۔۔! ظاہر ہے کہ یہ الفاظ امویوں ہی کے ہو سکتے تھے۔ کوئی پیروِ علیؑ تو یہ گستاخی کر ہی نہ سکتا اس کے بعد یہ لوگ امام حسنؑ کے خیمے میں در آئے۔ سامان لوٹ لیا۔ مصلّٰی نیچے سے کھینچ لے گئے یہاں تک کہ دوش مبارک سے ردا تک اتار لی، منصوبہ یہ تھا کہ امام حسن علیہ السلام کو گرفتار کر کے معاویہ تک پہنچا دیں لیکن ان کا زور نہ چلا۔ امامؑ کے فداکار آپ کو بچا لے گئے اور مدائن کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں معاویہ کے آدمیوں نے آپ پر حملہ کیا اور ایسا خنجر مارا کہ ران کی ہڈی ٹوٹ گئی۔

مدائن پہنچ کر آپ نے علاج کرایا اس اثنا میں شام کا جرنیل عبداللہ ابن عامر بیس ہزار فوج لے کر مقابلے کے لئے آ پہنچا اور اس نے یہ بھی مشہور کر دیا کہ خود معاویہ ایک بڑا لشکر لے کر آ رہے ہیں۔ اس سے امام حسنؑ کے لشکریوں میں سراسیمگی پیدا ہو گئی۔ امام حسنؑ خیبر شکن کے بیٹے تھے۔ طبعاً امن پسند ضرور تھے اور زہد و تقویٰ آپ کے خمیر میں تھا مگر جنگ میں پیٹھ دکھانا شرافت نسل سے بعید تھا پھر بھی غور طلب یہ امر تھا کہ چھوٹی سی فوج اور اس کی بھی ہمتیں پست، ایک لشکر قہار کا مقابلہ کیونکر کر سکتی پھر بھی آپ مایوس نہیں ہوئے۔

صلح حدیبیہ امام حسن علیہ السلام کی آنکھوں دیکھی بات نہ تھی لیکن امام کو علم لدنی ہوتا ہے اور بزرگوں سے بھی اس کی تفاصیل سن رکھی تھیں۔

سقیفہ کے انتخاب کے بعد عظیم المرتبت باپ کی خاموشی کو آپ نے بچشم خود دیکھا تھا اور یہ آپ ہی تھے جنہوں نے چھوٹے بھائی کی ہمراہی میں بھری مجلس میں حضرت ابوبکر کو ٹوک دیا تھا۔

''اتر میرے نانا کے منبر سے۔۔۔!

کچھ دنوں پہلے کی بے چارگی کو بھی انہوں نے محسوس کیا تھا۔آج آپ انھیں حالات میں تھے جن سے امیر المومنین دو چار رہے تھے۔مسلمانوں کا رنگ طبیعت نانا کی موت پر معلوم ہو چکا تھا۔ایک امام کی سیرت دوسرے امام کے لئے سنت کا درجہ رکھتی ہے لہٰذا آپ نے اقتدار کے لئے مسلمانوں کا خون نہ بہانے کا فیصلہ کیا۔مورخ اس کو آپ کی کمزوری پر محمول کرتا ہے مگر ان سے پہلے یہ الزام حضرت علیؑ ابن ابی طالب پر لگانا پڑے گا، جنہوں نے سقیفہ کے بعد نیام میں مچلتی ہوئی ذوالفقار کو تھپک تھپک کر سلا دیا تھا اور اپنے صحابیوں کے کھولتے ہوئے خون کو نرم گفتاری سے ٹھنڈا کر دیا تھا لہٰذا آپ کے بیٹے نے بھی طے کیا کہ وہ تو منصوص من اللہ ہے خلافت ظاہری یا اقتدار اگر مسلمان ان کے پاس رکھنا نہیں چاہتے تو خونریزی کیوں کی جائے؟

علیؑ نے خلافت خود تو حاصل نہیں کی تھی۔مسلمانوں نے دروازے پر حاضر ہو کر پیش کی تھی تو آپ نے قبول کر لیا تھا۔اب تھوڑے سے لوگوں کو چھوڑ کر باقی سب واپس لینا چاہتے تھے تو بروز شمشیر روکنے کی سعی کیوں کی جاتی۔آپ نے فیصلہ کر لیا کہ آپ سب فرائض امامت ادا کرتے رہیں گے۔ معاویہ کئی بار صلح کی پیش کش کر چکے تھے۔آپ نے حامی بھر لی جو مفاد اسلام، احساس فرض اور نفس کشی کی آخری منزل تھی جس کے بعد شرائط صلح مرتب ہو گئے:-

۱۔ معاویہ نظم حکومت میں کتاب خدا اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر عمل کریں گے۔

۲۔ معاویہ کو اپنے بعد کسی کو خلیفہ نامزد کرنے کا حق نہ ہوگا۔

۳۔ شام و عراق حجاز و یمن ہر جگہ کے لوگ محفوظ و مامون ہوں گے۔

۴۔ شیعان علیؑ اور اصحاب علیؑ جہاں بھی ہیں یا ہوں گے، ان کے جان و مال عزت و ناموس ہر طرح محفوظ رہیں گے۔

۵۔ معاویہ کی طرف سے حسن ابن علی یا حسین ابن علیؑ یا خاندان رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کسی فرد کو خفیہ یا علانیہ ڈرایا دھمکایا نہ جائے گا اور نہ ان کو نقصان پہنچانے یا ہلاک کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

۶۔ امیر المومنین علیؑ ابن ابی طالب کی شان کے خلاف جامع مسجد اور قنوت میں جو الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں وہ بند کر دیئے جائیں گے وغیرہ وغیرہ۔

۷۔ وظیفہ ادا کرنے والی اور دیگر شرائط۔

۲۵ ربیع الاول ۴۱ھ میں کوفے کے قریب انبار میں فریقین کا اجتماع ہوا اور دونوں نے دستخط

کر دیئے۔

معاویہ کی عہد شکنی

امام حسنؑ نے بڑے ضبط وتحمل اور صبر و استقلال کے ساتھ یہ سب برداشت کیا کہ اس طرح پرسکون حالات میں انہیں تبلیغ کا موقع میسر آجائے گا مگر معاویہ نے سیاسی اقتدار کو مضبوط ہوتے ہی نخلیہ میں جمعہ کا خطبہ دیتے ہوئے کہا۔

''جنگ سے میرا مقصد یہ ہرگز نہ تھا کہ تم لوگ نماز پڑھنے لگو، روزہ دار بن جاؤ یا حج وزکواۃ کی پابندی کرو۔۔۔ یہ سب تو تم کرتے ہی ہو میرا مقصد تو حکومت پر مکمل تسلط حاصل کرنا تھا وہ میں نے کرلیا۔ رہ گئے شرائط جو میں نے حسنؑ کے ساتھ کئے ہیں وہ میری ٹھوکر پر ہیں۔ چاہوں تو پورا کروں، چاہوں نہ کروں''۔

اس تقریر پر مجمع ساکت رہ گیا مگر اب کس میں دم تھا کہ زبان کھول سکتا۔

اور صحیح کہا تھا معاویہ نے، انہوں نے واقعی ایک شرط بھی پوری نہیں کی آخر امام حسنؑ کوفے کی سکونت ترک کر کے مدینے آ گئے۔

آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اب اقتدار سے کوئی تعلق نہ رہ گیا تھا مگر ظالم خواب میں بھی اپنے خدشات سے ڈرتا رہتا ہے۔ اس لئے معاویہ اب بھی امام حسن کو اپنی راہ کا کانٹا سمجھتے تھے، انہوں نے ایک لحظہ کے لئے بھی امام حسن کو فراموش نہیں کیا، تلوار اور زہر دو کاری حربے ان کے پاس تھے۔ تلوار کو حضرت معاویہ نے آزمایا تھا مگر امام حسن بچ گئے تھے پھر وہ تلوار کی زد ہی سے ہٹ گئے۔ انہیں یہ بھی احساس تھا کہ معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اب کھلم کھلا تلوار کا استعمال کیا گیا تو ہوسکتا ہے کہ بغاوت ہو جائے اس لئے زہر کا استعمال مصلحت وقت کے مطابق ٹھہرا اور معاویہ نے اس کے استعمال کے لئے مہرے تلاش کرنا شروع کر دیئے۔

موصل کا ایک آدمی محبّ اہلؑ بیت تھا۔ وہ طمع دنیا میں پھنس گیا اس نے بصرے کے سفر کے دوران موصل کے قیام میں تین مرتبہ امام علیہ السلام کو زہر دیا مگر اس نے اثر نہ کیا وہ پکڑا گیا اور ہلاک ہوا۔

آخر مدینے میں بھی معاویہ نے امام حسنؑ کی ایک بیوی جعدہ بنت اشعث کو توڑ لیا اور ایک ہزار دینار سرخ، پچاس مصری خلعت اور یزید سے شادی ہو جانے کے لالچ میں بدنصیب عورت نے کئی

بار کھانے میں زہر ملایا مگر اس کا خاطر خواہ اثر نہ ہوا۔ آخر جعدہ نے اس پانی میں زہر ملایا جو امام سوتے سوتے اٹھ کر پیتے تھے۔ ایک صبح جب آپ نماز کے لئے بیدار ہوئے تو وہ پانی اٹھا کر پی لیا اور پیتے ہی حالت غیر ہوگئی۔ آپ نے بچا ہوا پانی مع برتن زمین پر پٹکا تو زمین ابلنے لگی۔ امامؑ کا کلیجہ زہر کے اثر سے ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ امام حسینؑ بھائی سے لپٹ کر رونے لگے امام حسنؑ نے سنبھل کر سب لوگوں کو صبر کی تلقین کی، امام حسینؑ کو وصیتیں کر کے ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کر لیں اور ۲۸ صفر ۵۰ھ میں بعمر ۴۷ سال سپرد خاک کر دیئے گئے۔

''جنازے میں اتنا ہجوم تھا کہ مدینے میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ ایک شریک جنازہ کا بیان ہے کہ اگر سوئی پھینکی جاتی تو کثرت اژدھام سے زمین پر نہ گر سکتی تھی'' (۱۰)

یہ خبر جب دمشق پہنچی تو معاویہ نے جشن منایا اس کے بعد جعدہ بنت اشعث اپنا انعام پانے کے لئے وارد ہوئی۔ معاویہ نے کہا تو جب امام حسنؑ کی نہ ہوئی تو کسی اور کی کیا ہوگی؟ کہا جاتا ہے کہ معاویہ نے ہاتھ پاؤں بندھوا کر جعدہ کو دریائے نیل میں ڈلوا دیا تھا۔ یہ کام بہت احتیاط سے کیا گیا تھا کیونکہ وہ شام کے وفادار اشعث کی بیٹی تھی۔

اہل بیت رسولؐ کے لئے یہ سانحہ عظیم تھا لیکن مصائب ان کا مقدر بن چکے تھے انہوں نے بڑے ضبط سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بڑے نواسے کا جنازہ اٹھایا اور روضہ رسولؐ کی طرف لے کر چلے۔ قریب پہنچے تو ایک مجمع سد راہ تھا۔ مورخین نے اس موقع پر بددیانتی کا ثبوت دیا ہے کہ ام المومنین عائشہؓ نے اجازت دے دی تھی مگر مروان نہیں مانا۔۔۔۔ مروان کی کیا ہمت تھی کہ عائشہؓ اجازت دے دیتیں اور وہ راستہ روک لیتا اور اس کو مان بھی لیا جائے تو حضرت عائشہؓ خچر پر سوار وہاں کیا کر رہی تھیں جس کی بعض مورخین نے تصدیق کی ہے۔

واقعات پر مسلسل تاریخی ملمع سازی کے باوجود بعض مورخوں نے واضح الفاظ میں حضرت عائشہؓ کا جواب لکھ دیا ہے۔

انہوں نے فرمایا ''یہ میری جگہ ہے میں اس میں دفن کرنے کی اجازت نہیں دیتی'' (۱۱) جگہ ان کی تھی یا نہیں؟ یہ ایک علیحدہ موضوع ہے فی الوقت تو زیر بحث یہ بات ہے کہ پیغمبرؐ کے نواسے کو نانا کے پہلو میں دفن نہیں ہونے دیا گیا اور ام المومنین خود اپنے نواسے کی میت روکنے کے لئے سد راہ ہوگئیں۔

امام حسینؑ، محمد حنفیہؒ، عبداللہ ابن جعفرؓ ابن علی، قاسم بن محمدؒ اور بنی ہاشم کی بڑی تعداد اور ہزاروں محبان اہل بیت کی موجودگی میں امام کا جنازہ کون روک سکتا تھا۔ تلواریں بے نیام ہوگئیں مگر امام

حسنؑ نے پہلے ہی چھوٹے بھائی کو وصیت کر دی تھی کہ جھگڑا نہ کرنا۔ آپ نے بڑی بے چارگی سے بھائیوں کو سمجھایا اور جنازہ لے کر جنت البقیع کی طرف چل پڑے لیکن پیچھے سے تیروں کی باڑھ پڑی اور کئی درجن تیر جنازے میں پیوست ہو گئے۔ ایک بار پھر صورت حال قابو سے باہر ہو گئی لیکن امام حسینؑ نے پھر سنبھال لیا اور بڑے بھائی کو جنت البقیع میں لے جا کر دفن کر دیا یعنی مدینے میں وقوع کربلا ہونے نہ دیا۔

آپ کی صورت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بہت مشابہ تھی۔ مفسر قرآن، عابد و زاہد، عالم ہمہ دان، تہجد گزار، رحمدل، وسیع النظر، سخی اور پاپیادہ حج کرنے کے بہت شوقین تھے۔ توکل، اخلاق اور حسن عمل آپ کا طرہ امتیاز تھا۔ مہمان نوازی خمیر میں داخل، ان باتوں کے باوصف شجاعت میں علی ابن ابی طالب کے وارث اور اتنے شجاع تھے کہ امیر المومنین نے جمل وصفین میں آپ کو علمدار لشکر بنایا تھا۔ اہل بیت سے متعلق ہر حدیث اور ہر آیت میں شامل تھے سید شباب اہل جنت تھے اور خدا کی طرف سے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دوسرے جانشین۔

مخالف مورخین نے آپ کو کثرت ازواج کے الزام میں مطعون کیا ہے یہ سوچے بغیر کہ وہ سنت پیغمبری کے مطابق ہے یا نہیں؟ اس بہتان کو اگر تسلیم بھی کر لیا جائے تو شرعاً اس کا جواز خود فقہاء کی سمجھ میں آ جائے گا۔ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس سنت کا مقصد تناکحو وتناسلو (نکاح کرو اور نسل بڑھاؤ) ہوتا ہے۔ ہمارا کوئی امام عام انسانوں جیسا تو نہیں تھا۔ اس کا ہر کام با مقصد تھا۔

کسی نے کسی امام سے پوچھا تھا کہ بیوی کے پاس کب جانا چاہیے؟ جواب ملا کہ جب ضرورت ہو۔ یہ ضرورت وسیع المعنی ہے اور امام کے سامنے تو ضرورت تھی۔ مستقبل میں نسل رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قتل عام پیش نظر تھا۔ ایسے میں اولاد کثرت سے نہ ہوتی تو کوئی نام لیوا بھی باقی نہ رہتا۔

عقیدے کے مسلمات میں امام منصوص من اللہ اور حامل علم لدنی ہوتا ہے، امام حسنؑ مستقبل کے افق پر ۶۱ھ کا یوم عاشورہ دیکھ رہے تھے مشیت الٰہی آپ کے پیش نظر تھی، چاہتے تھے کہ اپنے بعد اتنی اولاد چھوڑ جائیں کہ کربلا کے قتل عام کے باوجود آپ کے صلب سے کوئی نہ کوئی باقی رہ جائے۔ دنیا اپنی نفس پروری کی میزان پر سبط رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تولتی ہے اور کثرت ازواج کا الزام لگاتی ہے لیکن حقیقتاً جس طرح پیغمبر اسلام نے مختلف قبیلوں کی عورتیں داخل حرم فرمائیں تھیں اسی طرح آپ کا نواسہ بھی مصلحت خداوندی کا پابند تھا۔ امام حسنؑ نے آٹھ بیٹے اور سات بیٹیاں یادگار چھوڑیں جن میں سے جناب زید اور جناب حسن مثنیٰ سے آپ کی نسل چلی۔

شاطرانہ دورِ حکومت

حضرت علی ابن ابی طالب اور حضرت امام حسنؑ سے جو جنگیں ہوئیں ان میں معاویہ نے جو تدبیریں کیں اور زہر و تلوار کے جو حربے استعمال کئے وہ مادی نظریے سے بھی بمشکل روا رکھے جاسکتے ہیں لیکن مسلمانوں کی خلافت حاصل کرنے کا امیدوار اگر ان کا مرتکب ہو تو سر شرم سے جھک جاتا ہے یہ اور بات ہے کہ جانبدار قلم ایسے ہر عیب کی تاویل ڈھونڈ لے اور کفر کو اسلام ثابت کرنے کا تہیہ کر لے۔

حضرت معاویہ کا کردار اگر آج کے دور میں بھی بروئے کار آتا تب بھی انسانی زاویہ نگاہ سے دنیا چیخ اٹھتی آج بھی کوئی قوم جنگ میں زہریلے بم استعمال کر لیتی ہے تو خلق اللہ میں مطعون ہوتی ہے نہ کہ چودہ سو سال پہلے والی شام نے روم سے درآمد کئے ہوئے قاتل زہر سے دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔۔۔دشمن بھی ایسے جو حق و صداقت کے علم بردار تھے اور جن کے کرداروں پر انگلی نہ اٹھائی جاسکتی۔

شجاعت کا جہاں تک تعلق ہے وہ معاویہ میں عام سطح سے زائد نہ تھی وہ کسی طرح اولادِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقابلہ نہ کر سکتے لیکن مکاری میں اولادِ رسول کیا بڑے بڑے آدمی نہ ٹھہر سکتے۔ ہاں ان ہی جیسا کوئی ہوتا تو دانت کھٹے کر دیتا جیسے امام حسنؑ کے سپہ سالار قیس تھے جو رئیس انصار سعد بن عبادہ کے بیٹے تھے۔ قیس بن سعد کو امام حسنؑ کی صلح ایک نظر نہ بھائی تھی مگر کرتے کیا، باپ نے مسلمانوں کے خلاف تلوار نہیں اٹھائی تھی، اس وقت بھی سعد بن عبادہ نے ابوبکر کی بیعت نہیں کی تھی، بیٹے نے تلوار رکھ دی تو سعد کے جانشین قیس نے بھی بیعت نہیں کی اور وہ بیعت کیوں کرتے معاویہ سے وہ کسی طرح کم تو نہیں تھے بلکہ شجاعت میں زیادہ تھے۔

اور ہوا بھی ویسا ہی کہ معاویہ نے ہزار جتن کر ڈالے۔ کتنے ہی قاصد بھیجے صلح کی آسان سے آسان شرائط پیش کیں مگر قیس ان کے جھانسے میں کہاں آنے والے تھے انہوں نے ہر پیش کش کو ٹھکرا دیا۔ قیس کے پاس بیس ہزار سپاہ تھی اور معاویہ ان کے مقابلے میں لاکھوں کا لشکر لاسکتے تھے لیکن مرد میدان قیس قطعاً ہراساں نہ تھے ان کو اپنے قوت بازو پر یقین تھا کہ مقابلہ ہوگا تو چھکے چھڑا دیں گے۔ ادھر معاویہ کی سوچ یہ تھی کہ اگر قیس سے ٹکر ہوئی اور انہیں شکست ہوگئی تو دوسروں کی ہمت بڑھ جائے گی اور خلافت ہاتھ سے نکل جانے کا اندیشہ پیدا ہو جائے گا اس لئے معاویہ نے قیس کو ان کے حال پر چھوڑ دیا اور وہ مدائن پہنچ کر چہار جانب سے چوکنا بیٹھ گئے۔

ایک مدت کے بعد انہوں نے معاویہ سے اپنی شرائط پر صلح کر لی پھر بھی بیعت نہیں کی۔

سچ تو یہ ہے کہ معاویہ صرف اللہ کے حق پرست سفیروں کے مقابلے پر شیر تھے۔ انھیں پر ان کے تمام عیارانہ حربے کامیاب ہوتے رہے، ایک کو پشت سے تلوار کا وار کر کے دوسرے کو زہر دلوا کر ٹھکانے لگا دیا، سامنے آکر ضرب لگانا ان کے بس کا نہ تھا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانشین بالمقابل طریقہ جنگ کے قائل تھے۔ عرصہ صفین میں آج بھی امیر المومنین کی آواز گونج رہی ہے۔ تاریخ نے جس کو محفوظ کر لیا ہے:۔

''معاویہ کیوں خلق اللہ کٹوا رہا ہے۔ میدان میں آ جا۔ میرے اور تیرے درمیان فیصلہ ہو جائے!''

معاویہ نے کوئی جواب نہ دیا تو عمر عاص نے کہا

''سچ تو کہتے ہیں علیؑ جھگڑا تو تمہارا اور ان کا ہے تم دونوں ہی فیصلہ کر لو''۔

''شیر کے منہ میں جھونک دینا چاہتا ہے مجھے'' معاویہ نے جواب دیا اور کہا:۔

''تاکہ میرے بعد تو خلافت پر قبضہ کر لے''۔

عمر عاص اس کا جواب کیا دیتا۔ سر جھکا کر رہ گیا مگر کن انکھیوں سے معاویہ کو دیکھتا رہا۔ معاویہ کے چہرے کا رنگ پراگندہ تھا۔ چہرے پر برستی ہوئی شرمندگی کو منہ دوسری طرف کر کے چھپا لیا گیا۔

علیؑ کی للکار پر معاویہ یا عمر عاص کوئی میدان میں نہیں آیا۔ ان کی جگہ باران تیر نے علیؑ کا استقبال کیا پھر دونوں فوجیں متصادم ہو گئیں۔

یہی انداز شام کے ابتدائی دور حکومت سے چلا آ رہا تھا۔ حصول خلافت کے لئے شروع ہی سے جس کسی نے گروہ بندی کی، غلط روایتیں گڑھوائیں یا آل محمدؐ کی مفلوک الحالی کے اسباب فراہم کئے وہ سب کے سب اس مسلک کے خطوط اولین قرار دیئے جاسکتے ہیں تاہم ان میں کبھی کبھی اولاد رسول کی قدردانی کے مناظر بھی مل جاتے ہیں جب سے معاویہ تخت خلافت کو مدینہ اور کوفہ سے دمشق اٹھا لائے تھے اس وقت سے تو بنی ہاشم پر زمین سخت اور آسمان دور ہو گیا تھا۔ گویا ان کا بانی اسلام سے کوئی تعلق ہی نہ تھا۔ حق تھا تو بنی امیہ کا، وراثت تھی تو بنی امیہ کی، اہلیت تھی تو بنی امیہ میں۔۔۔ گویا اہل بیت کچھ تھے ہی نہیں۔۔۔ کوئی ان کے ساتھ کچھ سلوک کرتا تو رحم کھا کر۔

ہندوستان کی عورتوں میں ایک محاورہ ضرب المثل ہے ''نوچو، اس کی ڈاڑھی جس نے پہلی راہ بگاڑی''۔ اس محاورے کی صداقت سے انکار نہیں۔ دیوار کی بنیادی اینٹ ہی ٹیڑھی نہ ہوتی تو عمارت میں اتنی کجی پیدا نہ ہو سکتی لیکن دمشق میں اسلام کا جو محل تعمیر کیا گیا تھا اس میں بنیادی کجی سے بہت زائدہ کجی پیدا

حیدرآباد لطیف آباد یونٹ نمبر ۸

کردی گئی تھی۔ اس محل کی آرائش میں قیصر وکسریٰ کا رنگ غالب تھا اور اس کو مدینہ کی سادگی سے کوئی رابطہ ہی نہ رہ گیا تھا۔

محل کے رہنے والوں کی معاشرت بھی ان اسلاف سے بالکل مختلف تھی جن کا خون ان کی رگوں میں موجزن تھا جن کی زبان ان کا طرہ امتیاز تھی اور جن کی بدولت انہوں نے بوریے سے تخت شاہی تک کا فاصلہ طے کیا تھا۔ کہنے کو تو سبط رسول کو ہٹا کر رسولؐ کی جگہ حاصل کی گئی تھی لیکن خاندان رسالت کے بجائے جو لوگ اس پر فروکش تھے، کسی زاویے سے بھی دیکھنے پر وہ فاطمہؑ زہرا یا علیؑ سے مطابقت نہ رکھتے۔ ان حقائق کے باوجود وہ صحابی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کاتب وحی اور پیغمبرؐ عرب کے قرابت دار کہے جاتے اور آج بھی رضی اللہ تعالیٰ عنھم۔ اس کو عقیدے کی بوالعجبی کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے۔

مدینے کی خلافت مل جانے کے بعد معاویہ کے انداز حکومت کا ایک سطحی جائزہ لیا جائے تو بادی النظر میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے بنی ہاشم کو بھی اسی نگاہ سے دیکھنا شروع کر دیا تھا جس سے وہ دوسروں کو دیکھتے آئے تھے مگر اس کے پس پردہ ایک بہت گہری سیاست چھپی ہوئی تھی۔ اس کا اندازہ مدینے میں سبط پیغمبر کے وقار کو دیکھ کر کیا جا سکتا ہے۔

امام حسنؑ کی معاویہ سے صلح بنی ہاشم اور آپ کے فدائیوں کو قطعاً گوارا نہیں تھی لیکن انہوں نے کبھی اطاعت سے سرتابی نہیں کی۔ معاویہ کے ہاتھوں بکے ہوئے لوگ انھیں مذلل المومنین کہہ کر ان کے خاندانی جبروت اور ہادیانہ کردار کو مجروح کرنا چاہتے تھے لیکن صاحبان ایمان پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا بلکہ وہ اصحاب امیر المومنین علی ابن ابی طالب کا کردار ادا کرتے رہے جس کی اطلاعات معاویہ کو دمشق میں پہنچتی رہیں لہٰذا شام کے دوراندیش خلیفہ نے یہ روش اختیار کی کہ داد و دہش اور حسن اخلاق سے بنی ہاشم کے افراد کو اپنی جانب ملتفت کرتا رہے۔ یہ پالیسی امام حسنؑ کی شہادت تک جاری رہی اور عام اہل مدینہ کے ساتھ بنی ہاشم اور خاندان رسالت کے لوگ بھی شام سے ہونے والی زر و جواہر کی بارش سے فائدہ اٹھاتے رہے۔

وہ لوگ جو کھلے بندوں شام کے حکمراں کو سخت وست کہتے اور امام حسنؑ کو اپنے حق کے لئے جہاد کرنے پر اکساتے، معاویہ کی طلبی پر شام جاتے تو بیت المال کے عطیات سے نواز کر عزت و آبرو کے ساتھ مدینے واپس آتے۔ اس سے جہاد پھر سے شروع کرنے کا جذبہ کچھ سرد ضرور پڑا مگر مدینے کے در و دیوار میں اس کا آوازہ گونجا یکسر بند نہیں ہوا البتہ سن ۵۰ھ میں جب امامؑ بدنصیب جعدہ بنت اشعث

کے زہر سے رشتہ حیات توڑ گئے تو معاویہ کو خلافت کی طرف سے کوئی اندیشہ باقی نہیں رہا۔ اس کے بعد ہی وہ یزید کو لے کر حج کے لئے چلے تو پہلے مدینے آئے۔

اتفاق سے قیس بن سعد بن عبادہ مدینے میں موجود تھے مگر وہ دیگر انصار مدینہ کی اکثریت کی طرح استقبال کے لئے نہیں گئے جو خلیفہ شام کی توقعات کے بالکل برعکس تھا۔ وہ سوچ بھی نہ سکتے کہ اس قدر شاہانہ نوازشوں اور مربیانہ سلوک کے بعد اتنی سرد مہری برتی جائے گی، سارے کا سارا شہر نہیں گیا تھا تو آبادی کی اکثریت کو تو آبادی سے کئی فرسخ پہلے خیر مقدم کے لئے موجود ہونا چاہئے تھا لیکن گئے کتنے لوگ، صرف بنی امیہ کی اکثریت اور حکومت سے متعلق لوگ۔ کہنے کو تو انصار میں سے چند آدمی بھی تھے شاید اتنے ہی جو سقیفہ بنی ساعدہ میں اہل سقیفہ کے ساتھ تھے۔ معاویہ نے بڑی حیرت سے مختصر سے آنے والوں کو دیکھا لیکن کسی غصے کا اظہار نہیں کیا۔

مورخ اسلام اس سیاسی قوت برداشت کو حلم سے تعبیر کرتا ہے مصلحت وقت نہیں کہتا، نام اس کا کوئی بھی ہو لیکن تھی ایک غیر معمولی صفت۔ بہر حال مملکت اسلامیہ کا فرمانروا چہرے سے کسی ناگواری کا اظہار کئے بغیر آگے بڑھتا رہا البتہ جب آبادی کی حدود کے اندر عمائدین شہر میں اس کو قیس بن سعد اور عبداللہ ابن عباس وغیرہ نظر آئے تو اس نے اس طرح کہا کہ قیس بھی سن لیں۔

''انصار کو کیا ہو گیا ہے جو وہ نہیں آئے؟''

حاشیہ نشینوں نے اس کے مافی الضمیر کو سمجھ کر جواب دیا۔

''وہ فقیر و مسکین ہو گئے ہیں۔ سواری کے جانور بھی نہیں رہے ان کے پاس!''

''اور پانی کی مشکیں اٹھانے والے اونٹ۔۔۔؟'' معاویہ نے تحقیر آمیز لہجے میں کہا جس میں یہ مفہوم چھپا ہوا تھا کہ وہ تو مزدور لوگ ہیں، اونٹ تو ان کے پاس ہونا ہی چاہئے تھے۔

اس وقفے میں خلیفہ شام سعد کے قریب پہنچ چکا تھا کوئی اس کی بات کا جواب دینے ہی والا تھا کہ سعد بول اٹھے۔

''اونٹ بدر و احد اور دوسری جنگوں میں ہلاک ہو گئے۔۔۔''

قیس کو غصہ آ گیا تھا انہوں نے ایک سانس لی اور کہا۔

''تم کو تو معلوم ہو گا کیونکہ انصار تم سے اور تمہارے باپ سے لڑتے رہے تھے۔۔۔ جب تک اسلام تم پر غالب نہیں آیا، اس وقت تک؟''

معاویہ کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا اور قیس اہل مدینہ کے سامنے اس کو نسلی طور پر اسلام

دشمن بتا رہے تھے قیس نے اسی تسلسل میں کہا۔۔۔

''رسول نے خبر دی تھی کہ ظالم ہم پر غالب ہوں گے۔۔۔!''

اب معاویہ طیش میں آ گئے انہوں نے کہا۔

''تمہیں کوئی حکم تو دیا ہوگا کہ تم کو کیا کرنا ہے؟''

''ہاں کہا تھا کہ صبر کرنا اور اس وقت تک صبر کرنا جب تک ہم سے کوثر پر آ کر نہ ملنا!''

معاویہ نے استہزاء کرنے کے انداز پر جواب دیا۔

''پھر صبر کرو کوثر پر ملاقات ہونے تک۔۔۔!''

قیس اس تمسخر پر آگ بگولا ہو گئے تھے وہ معاویہ پر نظریں جما کر بولے۔

''تم ہمیں آب کش اونٹوں کا طعنہ دیتے ہو حالانکہ ہم نے دیکھا تھا، تم پانی بھرنے والے اونٹوں سے جنگ کر رہے تھے پھر تم نے بادل نخواستہ ہماری تلواروں کے خوف سے اسلام قبول کر لیا۔۔۔''

قیس کے چہرے پر ایک جلال برس رہا تھا انہوں نے اچانک امیر المومنین کے محاسن اور فضائل بیان کرنا شروع کر دیئے۔۔۔ اور اسی سلسلے میں کہا ''انصار چاہتے تھے کہ انہوں نے قریش کی بیعت نہیں کی، تو میرے باپ کی بیعت کر لیں مگر علیؑ کے ہوتے انھوں نے اس کو قبول نہیں کیا۔ قریش نے تو رسولؐ کی قرابت کو بھی ملحوظ نہیں رکھا اور میرے باپ کے لئے بھی جھگڑا کیا۔ میں اپنی جان کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ علیؑ اور اولادِ علیؑ سے زائد خلافت کا حقدار کوئی نہیں تھا۔ تم نے آلِ محمدؐ اور انصار دونوں کے ساتھ ظلم کیا ہے!''

معاویہ کا چہرہ غیظ و غضب میں سرخ ہو رہا تھا لیکن وہ کوئی بڑا لشکر لے کر نہیں آئے تھے اور لاتے بھی تو قیس بن سعد کو اپنے اہل سیف پر اعتماد تھا۔ وہ جنگی چالوں میں بھی معاویہ کو مات دیدیتے اور اسی تقویت پر انہوں نے آج تک شام کا لوہا نہیں مانا تھا۔۔۔ معاویہ کی قوت برداشت بھی ساتھ چھوڑ چکی تھی وہ بے قابو ہو کر بولے۔۔۔

''یہ باتیں شاید تیرے باپ نے تجھے بتائی ہیں؟

''میرے باپ نے نہیں بتائی ہیں بلکہ میں نے اس سے سنی ہیں جو میرے باپ سے بہتر تھا''

قیس نے برجستہ جواب دیا اور معاویہ نے پوچھا۔

''وہ کون۔۔۔؟''

''علی ابن ابی طالب، قرآن کا عالم، امت کا صدیق'' قیس نے بلا جھجک کہا اور معاویہ نے تردید کی۔

''صدیق امت تو ابوبکرؓ ہیں فاروق امت عمرؓ اور عبداللہ بن سلام تو وہ ہیں جن کے پاس کتاب کا علم ہے!''

قیس نے جواباً حوالوں کے ساتھ وہ آیات پڑھنا شروع کر دیں جو امیر المومنین کی شان میں نازل ہوئی تھیں۔

معاویہ لاجواب ہو کر آگے بڑھ گئے اور اپنی جگہ پر پہنچ کر ایک فرمان جاری کیا جو مدح علیؑ میں زبان کھولے فضائل علی بیان کرے اور علیؑ سے بیزاری کا اظہار نہ کرے، اس کا خون اور مال رائگاں جائے گا مگر مدینے پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ نامساعد حالات میں بھی مدینہ رسولؐ کا شہر تھا جہاں بنی ہاشم اور انصار کی تلواریں کند نہیں ہوئی تھیں مگر عراق و شام اس کے حکم سے بچ نہ سکے وہاں پہلے سے اس کا رواج تھا، اب اس رواج نے شدت اختیار کر لی۔

یہ واقعات بعض وقائع نگاروں نے لکھ دیے ہیں جن کو مسلمان معتبر قرار نہیں دیتے ورنہ اکثریت نے تو وہی لکھا ہے جو شمشیر کے سائے میں لکھوایا گیا اور جن سے تاریخ اسلام مرتب ہوئی۔

ایسا ہی ایک واقعہ عبداللہ ابن عباس کا بھی ہے۔

مدینے کے قیام میں ایک دن معاویہ کا گزر قریش کے ایک مجمع کے قریب سے ہوا۔ شام کے فرمانروا کو دیکھ کر، بجز ایک شخص کے جو ان کے بیچ میں تھا، سب کے سب کھڑے ہو گئے۔ معاویہ نے نظر جما کر دیکھا تو وہ عبداللہ ابن عباس تھے۔ معاویہ نے اس کو بے ادبی تصور کیا اور عبداللہ سے کہنے لگے۔

''عبداللہ! تم نے اپنے دل سے صفین کا بغض و کینہ اب تک نہیں نکالا، ہماری جنگ تو خون عثمان کا قصاص لینے کے لئے تھی جو بڑی بیدردی سے مارے گئے تھے''

''عمر بھی تو مارے ہی گئے تھے ان کے خون کا مطالبہ کیوں نہیں کیا گیا؟'' عبداللہ نے اس طرح جواب دیا جیسے وہ اس کے لئے تیار تھے مگر معاویہ کی ذہانت کسی ثبوت کی محتاج نہیں۔ انہوں نے ایک لحظہ تامل کیے بغیر اس کی تردید کر دی۔

''انھیں تو ایک کافر نے قتل کیا تھا''۔

~~ابن عباس نے پوچھا~~

''اور عثمانؓ کو کس نے قتل کیا تھا؟''

''مسلمانوں نے۔۔۔۔'' معاویہ نے بڑے اطمینان سے بتایا۔ابن عباس معاویہ سے یہی کہلوانا چاہتے تھے۔وہ بڑے تحمل سے بولے

''تم نے خود ہی اپنی دلیل کو رد کر دیا۔۔۔اگر مسلمانوں نے اتفاق اور اجماع سے قتل کیا تھا تو اس کا مواخذہ کیسا؟'' اس پر معاویہ تلملا گیا اور شاہانہ انداز میں کہنے لگا۔

''میں نے ایک گشتی فرمان جاری کر دیا ہے کہ لوگ مناقب علیؑ سے زبانوں کو بند رکھیں تم بھی منہ کو سی لو!''

''تم مجھے قرآن پڑھنے سے روکتے ہو؟'' ابن عباس نے ایک زیرلب مگر تلخ تبسم کے ساتھ ان کی گرفت کی اور معاویہ نے انکار کیا۔

''نہیں تو۔۔۔۔''

ابن عباس نے استدلال کیا۔

''پھر کیا تاویل قرآن سے منع کرتے ہو؟''

''ہاں۔۔۔قرآن کی تلاوت تو کرلو مگر اس کے معنی بیان نہ کرو''۔ معاویہ کے جواب پر عبداللہ ابن عباس نے سوال کیا۔

''قرآن پڑھنا ضروری ہے یا اس پر عمل کرنا؟''

''عمل کرنا۔۔۔'' اس کے علاوہ کوئی جواب تھا ہی نہیں۔ معاویہ کے اقبال پر ابن عباس نے دریافت کیا۔

''کسی کو معنی قرآن سے واقفیت نہ ہوتی تو اس پر عمل کس طرح کرے گا؟''

''قرآن کے معنی ہی پوچھنا ہیں تو اس سے پوچھے جائیں جو اہل بیت کی طرح تاویل نہیں کرتا'' معاویہ نے ایک قطعی لہجہ میں کہہ دیا اور ابن عباس عالمانہ انداز میں بولے۔

''یعنی قرآن، جس پر نازل ہوا، اس کے گھر والوں سے بطن قرآن نہ سمجھا جائے بلکہ باہر کے لوگوں سے، آل ابی سفیان، آل ابی معیط اور یہود و نصاریٰ سے پوچھا جائے کہ کس کس مقام پر کس کی طرف اشارہ ہے''۔

ابن عباس کا منشاء تھا کہ جو پیش منظر اور پس منظر سے واقف ہی نہیں ہے وہ کسی آیت کے بارے میں کیا بتا سکتا ہے۔یہ معاویہ پر کھلا ہوا حملہ تھا جس کو وہ برداشت نہ کر سکے اور منغض ہو کر بولے۔

''تم نے مجھے ایسے گروہوں سے ملا دیا ہے۔۔۔؟''

ابن عباس نے اس کی تردید نہیں کی اور اسی تسلسل میں کہتے رہے۔

''تمہارا مطلب یہ ہے کہ قرآن حکیم پر اس طرح عمل نہ کریں جس طرح سے اس کی تلقین کی گئی ہے بالفاظ دیگر حلال وحرام کو دوسروں کی عقل وفہم اور مصلحت کا تابع کر لیں۔امت اگر قرآن کا صحیح مفہوم نہ سمجھے گی تو ہلاک ہو جائے گی۔۔۔خدا قرآن میں فرماتا ہے کہ لوگ نور خدا کو پھونکوں سے بجھا دینا چاہتے ہیں لیکن وہ ایسا نہ کر سکیں گے۔خدا خود اپنے نور کو بکمال وتمام روشن رکھے گا۔کافر اس کو برا سمجھیں یا اچھا۔۔۔''

''ابن عباس! اپنی حد میں رہو زبان کو قابو میں رکھو، کہنا ہی ہے تو اس طرح کہو کہ واضح نہ ہو اور لوگ کچھ سمجھ نہ سکیں۔'' معاویہ نے ابن عباس کو فیصلہ کن لہجے میں ٹوکا اور بات ختم کر دی۔

ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ عبداللہ ابن عباس بقید حیات نہ رہتے اور اس وقت یا اس کے بعد ان کا سر اتروا لیا جاتا لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ اس کے برعکس معاویہ نے مدینے سے مکے کی طرف جاتے وقت منادی کرائی۔

''وہ شخص عہد وامان سے خارج ہوگا جو علیؑ اور اہل بیت کے مناقب میں کوئی حدیث بیان کرے گا۔ ہر خطیب برسر منبر علیؑ اور اہل بیت پر لعنت کرے گا''۔

لیکن کس میں ہمت تھی کہ مدینے میں اس پر عمل کرتا۔ابن عباس کے لئے معاویہ نے ایک لاکھ پچاس ہزار درہم بھجوا دیئے مگر اس کی کوئی تصدیق نہ ہو سکی کہ ابن عباس نے یہ رقم قبول کی تھی یا واپس کر دی تھی۔

اموی مورخ اسی کو معاویہ کا حلم قرار دیتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ معاویہ عبداللہ ابن عباس کا کچھ بگاڑ نہ سکتا تھا۔بنی ہاشم کے ساتھ قریش وانصار سب ان کا احترام کرتے تھے، زہر یا سازش سے ہر بات ممکن تھی۔اس کی ضرورت معاویہ نے محسوس نہیں کی، شاید راز افشا ہو جانے کے ڈر سے۔

ان حالات میں یہ رائے قائم کرنا کچھ غلط نہ ہوگا کہ بنی امیہ کے علاوہ مدینے کی اکثریت میں معاویہ کو قبول عام حاصل نہ تھا اور ام المومنین عائشہؓ تو ان کی سخت مخالف تھیں۔معاویہ اپنی راہ کے اس کانٹے کو صاف کر دینا چاہتے تھے مگر ان پر آزمودہ حربوں میں سے کوئی حربہ استعمال کرتے تو بات کھل جاتی لہٰذا ان کے لئے انہوں نے ایک نیا نسخہ استعمال کیا۔اگلی بار جب وہ لاؤ لشکر کے ساتھ مدینے آئے تو ام المومنین کے لئے ایک کنواں کھدوا کر اور اس کو خس وخاشاک سے ڈھک دیا۔ام المومنین جب معاویہ سے ملنے کے لئے ان کے خیمے کی طرف چلیں تو اس میں گر گئیں اور پھر ان کا کوئی سراغ کبھی نہیں

ملا۔

عینی شاہدوں کے منہ زرو جواہر سے بھر دیئے گئے اور جن سے خطرہ تھا ان کو تلواروں کی چھاؤں میں لے لیا گیا۔ معاویہ کے جانے کے بعد عقدہ کھلا بھی ہوتا تو اس کو ڈرا دھمکا کر خاموش کر دیا گیا ہو گا پھر ان کی موت کی فرضی کہانیاں گڑھ لی گئیں جو آج تاریخ کا حصہ ہیں۔

اموی سیاست کی یہ شاطرانہ چالیں تدبر کا حصہ کہی جاتی ہیں اور حق گوئی کو سن کر مخالفین کے منہ بھر دینے کو حلم سے تعبیر کیا جاتا ہے!

پیغمبرؐ برحق نے عربوں کے ذہن وفکر کی تطہیر کر کے انھیں صحرائیت سے نکال کر انسانیت کی سطح پر لا بٹھایا تھا۔ آپ کی وفات کے بعد نصف صدی بھی مل جاتی تو بلاشبہ ان کے علماء انبیائے بنی اسرائیل کے مثل بن جاتے۔ یقیناً کچھ علماء اس کی تعریف میں آتے رہے لیکن عوام کی اکثریت ماضی کی طرف چلی گئی کیونکہ ان کا ماحول آہستہ آہستہ بدلتا رہا اور جب مدینے کی خلافت کوفے سے دمشق منتقل ہوگئی تو عربوں کی بڑی تعداد کہنے کو تو مسلمان رہی مگر ان کا حال ماضی سے جا ملا۔ اس کے ساتھ ہی صبح اسلام پر بھی شام کے سایے چھا گئے اور صداقت سیاست کاری میں اتنی آلودہ ہوگئی کہ اس کی آب و تاب تاریکیوں کی منزل تک پہنچنے لگی۔ ایک انگریز مورخ نے حرف آخر کی طرح لکھا ہے:۔

''بنی امیہ کا پہلا خلیفہ نہایت دانا، ہوشیار اور سفاک تھا اپنا مطلب نکالنے کے لئے کسی بات کے ارتکاب سے نہ ڈرتا زبردست غنیم کو تلوار کے گھاٹ اتروا دینا اس کا شیوہ تھا۔

پیغمبر اسلام کے نواسے کو زہر دلوایا۔ علیؑ کے بہادر سپہ سالار مالک اشتر کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا۔ اپنے بیٹے یزید کو تخت نشین کرنے کے لئے اس نے ہر عہد و پیمان کو طاق پر رکھ دیا جو علیؑ کے زندہ بیٹے حسینؑ کے لئے کیے تھے۔ ان تمام باتوں کے باوجود یہ بے مہر اور چالاک عرب اسلامی ممالک پر حکومت کرتا رہا اور خلافت نوے سال تک اس کے خاندان میں باقی رہی۔''

(ماخوذ از ہسٹری آف سیراسنز اردو ترجمہ ۹۷۷ مطبوعہ اردو اکیڈمی سندھ کراچی)

قتل گاہ شام

امام حسن علیہ السلام نے شرائط صلح میں ہر بات کا تحفظ کرلیا تھا۔ آپ کا خیال تھا کہ خلافت سے دستبرداری کے بعد معاویہ کی دشمنی ختم ہوجائے گی اور کسی کو ان کی ذات کی طرف سے کوئی خطرہ نہ رہے گا مگر محسوس ہوتا ہے کہ بات صرف خلافت کی نہ تھی بلکہ دشمنی کی تھی اس صداقت سے جو رسولؐ سے ان کی اولاد میں منتقل ہوئی تھی اور عداوت تھی اس نسلی خون سے جو رسولؐ کے بعد ان کی اولاد کی رگوں میں دوڑ رہا تھا۔ اس لئے معاویہ نے خلافت پاتے ہی ہر علاقے میں جابر اور ظالم عمال کو متعین کیا، انہوں نے جاتے ہی محبان اہلؑ بیت کو تلاش کرنا شروع کردیا اور امام حسنؑ کی رحلت کے بعد اپنی رفتار تیز کردی۔

مغیرہ بن شعبہ کو کوفہ، زیاد بن سمیہ کو بصرہ اور ابو ہریرہ کو مدینہ کا گورنر بنایا گیا اور زیاد کی مدد کے لئے سمرہ بن جندب کو مقرر کیا گیا۔ اسی طرح دوسرے مقامات پر بھی عموماً ایسے ہی لوگ بھیجے گئے جو دشمن آل رسولؐ تھے۔

حضرت ابو ہریرہ تاریخ کی مسلمہ شخصیت ہیں آپ ابتداً ایک فلاکت زدہ یہودی تھے۔ ۷ھ میں اسلام لائے۔ ساڑھے تین سال حضورؐ کا زمانہ دیکھا۔ اتنی مختصر سی مدت میں بے گنتی اور بے شمار حدیثیں آپ سے مروی ہیں۔ ۲۱ھ میں حضرت عمرؓ نے آپ کی کارگزاری پر بحرین کا حاکم بنادیا تھا مگر خیانت مجرمانہ کے باعث معزول ہوئے پھر معاویہ نے آپ کے جوہر قابل کی قدردانی کے صلے میں مدینے کی امارت سونپ دی۔ آپ کے ہاتھ سادات کے خون میں تو نہیں رنگے لیکن دروغ بیانی سے حق وصداقت کا اتنا خون ہوا کہ تاریخ اسلام آج بھی آپ کے نام پر گمراہ رہی ہے۔

زیاد ایک پیشہ ور کنیز سمیہ کا بیٹا تھا جس کو ابوسفیان نے گھر ڈال لیا تھا مگر زیاد کو اپنا بیٹا تسلیم نہیں کیا تھا لہٰذا عام طور پر خیال کیا جاتا تھا کہ وہ بنی امیہ کا دشمن ہے اور ان کے ہاتھوں بک نہیں سکتا۔

امیر المومنین نے بے خطر سمجھ کر اس کو امارت کے عہدے پر فائز کر دیا تھا۔۔۔۔حضرت معاویہ نے سیاسی مصلحت کے تحت اپنا بھائی تسلیم کر لیا اور کوفہ اس کے سپرد کر دیا۔

شروع میں مغیرہ بن شعبہ بصرے کا گورنر تھا۔ اس نے سیکڑوں علیؑ والوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور ان کے وظائف بند کر دیئے۔۔۔۔۔۔وہ علیؑ اور ان کی اولاد پر تبرا ہی نہیں کرتا تھا بلکہ گالیاں بھی دیتا تھا۔ معاویہ کسی بات پر اس سے ناراض ہو گیا تو اس کو بصرہ کے بجائے کوفے کا گورنر بنا دیا اور بصرے میں سمرہ بن جندب با اختیار ہو گیا۔۔۔ظاہر ہے کہ آل رسول کو گالی دینے والا مسلمان ہی ہو سکتا ہے کسی غیر مسلم کو کیا پڑی تھی جو انہیں اس طرح نوازتا!

زیاد کوفے کے ہر شیعہ کو جانتا تھا۔ اس نے پہنچتے ہی ان پر عرصہ حیات تنگ کر دیا۔ محبان علیؑ کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر گرفتار کیا۔ کسی کے ہاتھ پاؤں کاٹے، کسی کی آنکھوں میں سلائیاں پھروا کر اندھا کر دیا، کسی کو زندہ دفن کر دیا، کسی کو گھر میں آگ لگا کر جلا ڈالا، ظلم کی کوئی حد اس نے اٹھا نہ رکھی۔ قید خانے شیعوں سے بھر دیئے اور جو بچ گئے انہیں شہر بدر کر دیا۔ کوفہ و بصرہ میں مجموعی طور پر ایک لاکھ پچاس ہزار شیعہ اس کے ہاتھوں مارے گئے۔ یہ بدلہ دیا زیاد بن ابوسفیان نے علیؑ کے حسن اخلاق کا۔

بصرے میں سمرہ بن جندب زیاد کا ماتحت تھا وہ زیاد سے کم ظالم نہ تھا اس نے آٹھ ہزار آدمی قتل کیے۔ بسر بن ارطاہ نے تیس ہزار شیعوں کو قتل کر کے معاویہ کی خوشنودی حاصل کی اور دیکھتے ہی دیکھتے عراق و شام و عرب میں ہر جگہ محب علی گردن زدنی قرار پایا گیا۔ یہی وہ حالات تھے جہاں سے تقیہ کی ضرورت پیدا ہونے لگی۔

شیعوں کے قتل اور گرفتاری کے لئے معاویہؓ نے اپنے عمال کو سخت تاکید کی تھی لہٰذا کسی جگہ کوئی کوتاہی نہیں کی گئی۔ زیاد کے حکم سے عبداللہ بن ہاشم مرقال کو گرفتار کر کے دمشق بھیجا گیا۔ جمیل بن کعب تغلبی رئیس قبیلہ پکڑ کر لائے گئے۔ جاریہ بن قدامہ تمیمی کو پابہ زنجیر کر کے بصرہ سے دمشق پہنچایا گیا۔

معاویہ نے ایک ایک کو بھرے دربار میں بلایا۔ سخت کلامی کی نوبت آئی۔ تشدد کا ہر حربہ استعمال کیا گیا مگر ان میں سے کسی نے محبت علی سے منہ موڑنے کی حامی نہیں بھری۔ آخر میں تنگ آ کر معاویہ نے وقفے وقفے سے انہیں قتل کروا دیا۔ انہیں میں صعصعہ بن صوحان عبدی بھی تھے آپ جلاوطن کر دیئے گئے۔ عالم غربت میں موت کو لبیک کہہ گئے۔۔۔۔ایک طویل فہرست ہے علیؑ کے ان سرفروشوں کی جنہوں نے ننگی تلواروں کی چھاؤں میں بھی حب علی کے نعرے بلند کیے۔ حجر بن عدی ان میں سے ایک درخشاں نام ہے۔

کوفہ میں زیاد کا قتل عام جاری تھا مگر وہ اس قدر چالاک تھا کہ کمزوروں کو چھانٹ چھانٹ کر قتل کر رہا تھا حجر کی طرف اس نے مصلحتاً دست ستم دراز نہیں کیا۔ ایک دن حجر کی موجودگی میں حضرت علیؑ کے لئے گستاخانہ الفاظ استعمال کئے۔ حجر سے ضبط نہ ہو سکا، آپ نے بھرے مجمع میں اس کو ملامت کی۔ زیاد نے معاویہ کو لکھ بھیجا اور معاویہ نے حجر اور اس کے ساتھیوں کی گرفتاری کا حکم صادر کر دیا مگر حجر کوئی تر نوالہ نہ تھے جن کو زیاد چٹ کر جاتا۔ مقابلے کی نوبت آ گئی حجر کے ساتھیوں نے محمد بن اشعث کوتوال کے چھکے چھڑا دیئے۔ آخر امان دینے کا فریب کر کے انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ گیارہ آدمی آپ کے ساتھ پکڑے گئے۔

ارقم بن عبداللہ کندی، شریک بن شداد حضرمی، صیفی بن شبل، قبیصہ بن صبیعہ عبسی، کریم بن عفیف خشعمی، عاصم بن عوف بجلی، ورقا سمی بجلی، کدام بن حیان، عبدالرحمان بن حسان عنزی، محرز بن شہاب عبداللہ بن حریہ سعدی۔

زیاد نے وعدہ خلافی کر کے ان کو دمشق بھیج دیا۔ پھر دو آدمی اور گرفتار کئے عتبہ بن اخنس اور سعید بن غزان ہمدانی، ان دونوں کو بھی ان کے بعد روانہ کر دیا معاویہ نے ان سب کے لئے ہدایت کی کہ جو حضرت علیؑ اور اولادِ علیؑ پر لعنت کرے اس کو چھوڑ دیا جائے باقی لوگوں کو قتل کر دیا جائے۔

حجر بن عدی صحابی رسولؐ تھے اور صحابی امیر المومنین بھی۔ وہ محبت علیؑ کو کیا چھوڑ تے، انہوں نے سخت جوابات دیئے اور واجب القتل قرار پائے مگر ارقم بن عبداللہ کندی، کریم بن عفیف خشعمی، ورق بن سمی بجلی، عبداللہ بن حریہ سعدی، عتبہ بن اخنس، سعید بن غزان ہمدانی اور عبدالرحمان بن حسان عنزی کو اہل دربار کی سفارش پر معاویہ نے واپس بلا لیا۔ ان میں عبدالرحمان کو زیاد کے پاس واپس بھیج دیا گیا اس نے انہیں زندہ گڑ وا دیا۔ باقی لوگوں کو معاویہ نے رہا کر دیا کیوں کہ ان کے لئے سفارش کرنے والوں نے کہا تھا کہ وہ علیؑ کی مدح نہ کریں گے۔ حجر اور ان کے چھ ساتھیوں نے رات بھر نمازیں پڑھیں اور صبح کو ایک ایک کر کے قتل کر دیئے گئے۔۔۔۔۔۔ خدا رحمت کرے ان عاشقان پاک باطن پر!

''حضرت حسنؒ بصری فرماتے ہیں'۔ حضرت معاویہؓ کے چار افعال ایسے ہیں کہ اگر کوئی ان میں سے ایک کا ارتکاب بھی کرے تو وہ اس کے حق میں مہلک ہو۔ ایک ان کا امت پر تلوار سونت لینا اور مشورے کے بغیر حکومت پر قبضہ کر لینا، درآنحالیکہ امت میں بقایائے صحابہ موجود تھے۔ دوسرے، ان کا اپنے بیٹے کو جانشین بنایا حالانکہ وہ شرابی اور نشہ باز تھا، ریشم پہنتا اور طنبورے بجاتا۔ تیسرے ان کا زیاد کو اپنے خاندان میں شامل کرنا، حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا صاف حکم موجود تھا کہ اولاد اس کی ہے

جس کے بستر پر وہ پیدا ہوا اور زانی کے لئے کنکر پتھر ہیں۔ چوتھے ان کا حجر اور ان کے ساتھیوں کو قتل کر دینا‘‘۔۔۔(۱۲)

حجر کی وصیت کے مطابق ان کی ہتھکڑیاں، بیڑیاں اتاری نہیں گئیں اور نہ غسل و کفن دیا گیا بلکہ اسی حالت میں دفن کر دیا گیا۔

جناب عمرو بن حمق خزاعی بھی اسی دور کے شہیدوں میں ہیں۔ کہا جاتا ہے حضرت سلمانؓ کا جو درجہ دربار رسالت میں تھا وہی درجہ حضرت عمرؓ کا بارگاہ امیرؑ المومنین میں۔ مرزع نامی بزرگ بھی شہیدوں کی طویل فہرست میں شامل ہیں جنہوں نے علیؑ کی محبت میں جان دینے کی ریت قائم کی۔ اوفی بن حصین کو زیاد نے بے دردی سے قتل کیا۔ عبداللہ بن یحیی حضرمی گوشہ نشین ہو گئے تھے مگر معاویہ نے گرفتار کر کے قتل کرا دیا۔ محمد بن حذیفہ دمشق کے قید خانے میں ڈال دیئے گئے اور وہیں انتقال فرمایا۔

سب سے زیادہ محیر العقول یہ واقعہ ہے کہ دربار شام کی مغنیہ نے قتل علیؑ کے جشن میں گانے سے انکار کر دیا تھا جب اس کو درے لگائے گئے تو اس نے فی البدیہہ گانا شروع کر دیا۔

’’حرب کے بیٹے معاویہ کو بتا دو کہ ہمیں مطعون کرنے والوں کی آنکھوں کو ٹھنڈک نہ پہنچے گی۔ اس نے ایسے شخص کو قتل کیا ہے جو بہترین خلق تھا ماہ رمضان میں ہمیں دردمند کیا۔‘‘

ایک مغنیہ کا یہ عمل اتنا گستاخانہ تھا کہ اس کے سر پر ایک لکڑی کی شدید ضرب لگائی گئی جس نے بھیجے کو پاش پاش کر دیا اور مدح علیؑ کے جرم میں وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملی۔

کسی کو معلوم بھی نہ تھا کہ مغنیہ کے کس گوشہ قلب میں عقیدت علیؑ کی شمع روشن تھی جس کی تجلیاں اچانک پھوٹ پڑیں اور اس مومنہ کے چراغ حیات کو گل کر گئیں۔ ایسے ہی کتنے لوگ تھے جو دلوں میں محبت اہلؑ بیت کے خزانے چھپائے ہوئے تھے اور دشمنان دین کو اس کا علم نہ تھا۔

بات صرف مردوں کی ہی نہیں ہے۔ عورتیں بھی اس مشق ستم سے مستثنیٰ نہ تھیں۔ انھیں بھی خبر ملنے پر پکڑ کر لایا جاتا، سرزنش کی جاتی اور سزائیں دی جاتیں لیکن اس آزمائش میں بڑی لذت تھی۔ خواتین بھی ہنستی مسکراتی اس کو جھیل جاتیں۔۔۔ زرقا بنت عدی، ام ابراء بنت رضوان، دارمیہ حجونیہ کے نام تاریخ نے محفوظ کر لئے ہیں۔ انہوں نے موت سے بے نیاز ہو کر امیر شام کو دندان شکن جواب دیئے کہ حمیت نام کی کوئی چیز اس میں ہوتی تو پھر کسی عورت کو کبھی نہ بلاتا لیکن ایسا ہی ہوتا تو معاویہؓ رسول کی قدسی صفت بیٹی کے خلاف زہر کیوں اگلتا۔

صلح حسنؑ کے بعد شیعوں کے خون کی اچانک ارزانی توقع کے بالکل خلاف تھی کیوں کہ عہد

نامے کی بنیادی شرط یہی تھی مگر معاویہؓ نے کوئی وعدہ پورا کرنے کے لئے تو نہیں کیا تھا۔ یہی صورت حضرت علیؑ پر سب وشتم کی بھی ہوئی۔ امیر شام نے اس کو بند کرنے کے بجائے کھلے عام برا کہنے کے احکام جاری کردیئے۔ اب عراق وشام کی ہر مسجد اور ہر منبر پر حمد باری کے بعد علیؑ کی منقصت کی جاتی اور ایک اندازے کے مطابق ستر ہزار منبروں سے خطبات میں علیؑ پر سب وشتم کو داخل عبادت کرلیا گیا تھا۔ زیاد بن ابیہ اور مغیرہ بن شعبہ کے سے گرگ باراں دیدہ تو اس سے بھی آگے بڑھ کر گالیوں پر اتر آتے تھے۔

ایک طرف یہ عمل ثواب میں شمار ہوتا دوسری طرف اگر کسی کی زبان سے مدح علیؑ میں ایک لفظ بھی نکل جاتا تو وہ مستوجب عذاب ٹھہرایا جاتا۔ اس کی زبان گدی سے کھینچ لی جاتی اور کبھی کبھی تختہ دار پر اس کے تڑپنے کا منظر بھی دکھایا جاتا۔ یہ دونوں عمل حکومت کے ضابطے میں داخل تھے چنانچہ۔

''جب معاویہ نے کوفہ کے لوگوں سے بیعت لینا شروع کی تو حضرت علیؑ سے برات اور بیزاری پر بیعت کرلی۔ یہی معمول تھا۔ یہ کیفیت دیکھ کر بنی تمیم کے ایک شخص نے کہا امیر المومنین! ہم زندوں کی اطاعت کریں گے مگر مردوں سے برات نہیں کریں گے اس پر معاویہ زیاد کی طرف متوجہ ہوا، اور بولا۔ اس شخص کو اچھائی کی وصیت کر۔'' (۱۳)

زیاد نے اس کو بیک ضرب شمشیر قتل کردیا۔ ایسے بہت سے واقعات ایک ہی زمانے میں پیش آئے اور جانوں کے خوف سے لوگوں نے اپنی زبانوں پر تالے ڈال لئے۔

اس تشدد کے دوش بدوش ایک زبردست پابندی یہ لگادی گئی کہ کوئی اپنے بچوں کے نام اولاد رسولؐ کے ناموں پر نہ رکھے۔ علیؑ کے چاہنے والوں کا یہ کڑا امتحان تھا۔ بادل نخواستہ انہوں نے اس میں بھی تقیہ شروع کردیا۔ بعض عقیدت مندوں نے گھر کا نام کچھ اور باہر کا کچھ اور نام رکھا مگر اس میں بھی پکڑے گئے۔ آخر زندگیوں کو محفوظ رکھنے کے لئے یہ بھی کرنا پڑا۔۔۔۔۔۔ شیعوں کی گواہی اب بھی ناقابل اعتبار تھی لہٰذا وہ عدالت میں پیش ہونے کے خطرے سے بچے ہوئے تھے۔

اب ہر طرف بنی امیہ کا دور دورہ تھا کوفہ، بصرہ، اور تمام جگہیں جو کبھی شیعان علیؑ سے بھری ہوئی تھیں وہ سب خالی ہوچکی تھیں۔ اکادکا لوگ کونے کھدروں میں پڑے ہوئے تھے جو کسی سے کوئی تعلق نہ رکھتے۔ مدینے میں امام حسن علیہ السلام نے تقریباً گوشہ نشینی اختیار کرلی تھی مگر رشد وہدایت کا سلسلہ جاری تھا۔ لوگ اب بھی فیضان علم سے بہرہ ور ہوتے تاہم خانوادہ رسالت کو حکومت سے کوئی سروکار نہ تھا۔

حضرت معاویہ کو یہ بھی گوارا نہ تھا، انہوں نے آپ کو کئی بار بلوایا تا کہ بھرے دربار میں ذلیل کریں مگر پیغمبرؐ کے نواسے اور علیؑ کے بیٹے سے کون بازی لے جاسکتا تھا جس نے جو کچھ کہا، اس کا جواب پایا۔

رہ گیا قتل ہونے کا اندیشہ تو امامؑ کو اس کی فکر کیوں ہوتی، وہ اپنے لئے تو زندہ نہیں تھے۔ آپ کی ہر سانس خدا اور اس کے دین کے لئے تھی۔ اس کے باقی رہنے یا ختم ہو جانے سے امامؑ کا کوئی تعلق نہ تھا لہٰذا آپ بے فکر جاتے اور بے خطر چلے آتے۔

اس طرح نو دس سال میں آپ نے دمشق کے کئی سفر کیے اور ہر سفر میں رموز دین کو منکشف کرتے رہے۔ لوگوں کو پاکبازی کی زندگیاں بسر کرنے کی تلقین فرماتے رہے۔ آخر وقت آ گیا کہ حیات مستعار اپنے انجام کو پہنچی۔ معاویہ نے اطمینان کا سانس لیا۔ ان کے راستے کا بڑا کانٹا صاف ہو گیا تھا۔ رہ گئے تھے حسینؑ تو ان کو نہ چھیڑنے کا فیصلہ امیر شام نے کر لیا تھا۔ البتہ ایک ہستی باقی تھی جو کسی وقت بھی ان کے مقابلے میں آ سکتی تھی اور وہ ہستی تھی ام المومنین حضرت عائشہؓ کی، جن سے وہ ڈرتے بھی تھے اور چوکنا بھی رہتے تھے۔ آخر مدینے کے قیام میں ایک بار پھر انھیں بھی ختم کروا دیا گیا۔

استقرار سلطنت کے لئے قتل و خونریزی کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ جابر و ظالم حکمران اس سے پہلے اور بعد ایسا ہی کرتے رہے ہیں۔ سکندر و دارا چنگیز و تیمور جیسے کتنے ہی فرمانروا تاریخ کے شعور اور شعور سے پہلے ملتے ہیں مگر وہ پیغمبرؐ برحق و عادل کے سجادہ زہد پر بیٹھنے کے دعویدار نہیں تھے۔ معاویہ پر نکتہ چینی تو اس لئے کی جاتی ہے کہ ان کا ہر سوء عمل اسلام سے منسوب تھا اور اسلام ان کے کرتوت سے بدنام ہو رہا تھا۔

یوں تو وہ ایک باصلاحیت حکمران تھے۔ انہوں نے ایران اور دوسرے علاقوں کی بغاوتوں کو بڑی حکمت عملی سے فرو کیا۔ سندھ، بلوچستان، مکران اور ترکستان کے بعض علاقوں میں حضرت علی علیہ السلام نے اسلام پھیلایا تھا۔ حضرت معاویہؓ نے ۴۴ھ میں مہلب بن ابی سفرہ کو متعین کیا پھر عبداللہ ابن عامر کو بھیجا۔ اس کے بعد عباد ابن زیادہ کو۔ ان لوگوں نے کافی مقامات کو مسخر کیا اور جو علاقے باغی ہو رہے تھے، انھیں از سر نو قبضے میں کیا اور ایک دانشمندی یہ بھی کی کہ یہاں ابوسفیان کے بجائے محمدؐ الرسول اللہ کا نام روشن کیا۔

شمالی افریقہ میں کئی نئے علاقے مفتوح کیے۔ رومیوں کا معرکہ حضرت معاویہؓ کا کارنامہ ہے۔ یزید بن معاویہ بھی اس جنگ میں شریک تھا اسی جنگ میں حضرت ابوایوب انصاری نے داعی اجل

کو لبیک کہا اور قسطنطنیہ کی دیوار کے نیچے دفن کئے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت ابوایوب انصاری جہاد میں شرکت کے لئے روم گئے تھے جو دوسری سیاسی کہانیوں کی طرح ایک کہانی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صفین کے عظیم مجاہد سے معاویہ کی لشکرکشی میں تعاون کے لئے کہا گیا تھا کہ آپ رسولؐ کے مقدس صحابی ہیں آپ کی برکت سے جنگ فتح ہو جائے گی تب بھی وہ نہیں گئے تو بجبر مگر بظاہر احترام کے ساتھ لے جایا گیا۔ راستے میں بیمار ہو گئے اور محاذ کے قریب پہنچتے پہنچتے خالق حقیقی سے جا ملے۔ آپ نے وصیت کی تھی کہ قسطنطنیہ کی دیوار کے قریب دفن کر دیا جائے جہاں ان کی قبر آج بھی پیغمبرؐ عرب کے دین کو متعارف کراتی ہے!

صحابی رسول

عام مسلمانوں کی غلط فہمی دور کرنے کے لئے حضرت ایوب انصاری کے مختصر حالات عرض کرنا ضروری ہے۔ آپ کا نام خالد بن زید اور کنیت ابوایوب تھی۔ آپ جنگ بدر کے علاوہ تمام غزوات میں شریک رہے مدینے میں آپ کے گھر پر آنحضرتؐ کا قیام آپ کی فضیلت کی ضمانت ہے۔ جنگ خیبر کے بعد جس رات صفیہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں داخل ہوئیں اس رات آپ خیمے کے گرد صبح تک پہرہ دیتے رہے۔ آنحضرتؐ نے آپ کے لئے فرمایا تھا۔ جس طرح تم نے میری حفاظت کی ہے خدا تمہاری حفاظت کرے!

انصار کی اکثریت کی طرح آپ نے بھی خلفائے سقیفہ کی بیعت نہیں کی۔ جنگ جمل و صفین میں امیرالمومنین کے ساتھ حق جہاد ادا کیا۔ غزوہ حنین میں اصحاب رسول کی نمائندہ جماعت میں آپ بھی شامل تھے۔

"عرصہ صفین میں ایک روز جب دونوں لشکر اپنی صفوں کو آراستہ کر چکے تو امیرالمومنین نے اپنے سرفروشوں کو مخاطب کر کے فرمایا:-

کل کی طرح آج بھی ثبات قدم اپنا شعار بنانا۔ جنگ چھیڑنے میں سبقت نہ کرنا لیکن جب ادھر سے آغاز ہو تو بھرپور حملہ کر دینا اور مقابل کو بچنے کا موقع نہ دینا البتہ جب وہ بھاگنے لگیں تو انھیں قتل نہ کرنا زخمیوں اور مجبوروں پر ہاتھ نہ اٹھانا عورتوں کی پردہ دری نہ کرنا، میری اجازت کے بغیر کسی خیمے میں نہ گھسنا اور نہ ان کا مال و اسباب برباد کرنا مقتولین کے پاس جو کچھ ملے وہ تمہارا حق ہوگا۔

عورتیں اگر تمہیں گالیاں بھی دیں تو جواب نہ دینا کیونکہ وہ بے عقل ہوتی ہیں اور ان پر کوئی

تشدد نہ کرنا۔

ابھی امیر المومنین کی تقریر جاری تھی کہ کئی شامی سوار میدان میں آ کر رجز خواں ہوئے، خلیفہ اسلام کے بہادران کے مقابل ہوئے ان کے مابین تلوار چلنے لگی۔

اس اثناء میں ایک بوڑھا صف شکن اپنی صف سے نکل کر لشکر شام سے مبارز طلب ہوا۔ یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عظیم صحابی تھا جو تاریخ اسلام میں ابوایوب انصاری کے نام سے جانا پہچانا جاتا ہے۔

معاویہ کے لشکر سے کوئی سامنے نہیں آیا تو ابوایوب انصاری نے پھر آواز لگائی۔

''کیا تم میں کوئی بہادر نہیں ہے جو حق و باطل کے اس معرکے میں میرے سامنے آئے؟''

کئی بار للکارنے پر بھی جب شام کے لشکر سے کوئی برآمد نہیں ہوا تو آپ نے آخری بار ان کی حمیت کو للکارا۔

''تم نہیں آتے تو میں خود تمہاری طرف آتا ہوں۔۔۔؟

یہ کہہ کر آپ نے گھوڑے کو مہمیز کیا اور سامنے کی صفوں پر جا پڑے۔ اس سن و سال میں لڑنے کا یہ عالم تھا کہ جو زد پر آ جاتا بچ کر نکلنے نہ پاتا۔ آخر آپ صفوں کو چیرتے ہوئے معاویہ کے پردہ سرا تک جا پہنچے۔ معاویہ دروازے پر موجود تھے۔ آپ کو دیکھ کر ہٹ گئے اور پردہ سرا میں گھس کر دوسری طرف نکل گئے۔۔۔ اس موقع پر کچھ شامی مقابلے پر آئے۔ مدینے میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلے میزبان نے ان کو غداری کا سبق دے کر سروں سے بے نیاز کر دیا ار باقی جانیں بچا کر بھاگ گئے۔ آخر ابوایوب حق جہاد ادا کر کے اپنے مقام پر واپس آ گئے۔ معاویہ کی آنکھوں میں انصار کے کفن بردوش مجاہد کی برش شمشیر سے ایک چکاچوند پیدا ہو گئی تھی انہوں نے غزوات نبوی میں اس کی کاٹ بھی دیکھی تھی اس لئے مقابلے کی ہمت نہ کر سکے لیکن ان کے جاتے ہی قریب کھڑے ہوئے لوگوں پر برس پڑے۔

''علی کا ایک سوار تم میں گھس آیا تھا۔ میرے پردہ سرا تک اس نے جیسے تم سب کو قیدی بنا رکھا تھا کاٹ چھانٹ کر چلا گیا۔ تم سے یہ بھی نہ ہو سکا کہ ایک ایک مٹھی خاک اس کے گھوڑے پر جھونک دیتے!''

بہادری کے دعویدار بہت شرمندہ ہوئے۔ ایک شامی مترفع بن منصور نے ہمت کر کے کہا۔۔۔

''میں اس کا جواب دوں گا وہ جس طرح آپ کے پردہ سر تک آیا تھا میں بھی علیؑ کے پردہ سرا

تک جاؤں گا، علیؑ سامنے پڑ گیے تو ان پر ایک ضرب ضرور لگاؤں گا اور آپ کو خوش کردوں گا۔"

موت اس کے سر پر سوار تھی۔ اس نے گھوڑے کو چھوڑ دیا اور علی کے پردہ سرا کا رخ کیا۔ ابو ایوب انصاری نے دور سے اس کے ارادے کو بھانپ لیا اور بڑھ کر سدراہ ہو گیے۔

شامی شہسوار چاہتا تھا کہ ابوایوب پر وار کرے مگر اس کی حسرت دل ہی میں رہ گئی۔ ابوایوب کی شمشیر اس کی گردن پر اس طرح پڑی کی کاٹ کر دوسری طرف نکل گئی اور سر اسی طرح گردن پر دھرا رہ گیا۔ (۱۴)

یہ تھی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جاں نثار کی شمشیرزنی کی ایک مثال جو تاریخ اسلام میں آج تک محفوظ ہے اور اس جاں نثار کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے معاویہ کی خلافت کو مان لیا تھ اور شام کی طرف سے تسخیر ملک کی جنگ میں لڑنے کے لئے گیا تھا جو دروغ بیانی کی ایک نظیر ہے اور جس سے تاریخ اسلام کا وقار مجروح ہوتا ہے یہ روایت بھی اسی طرح کی روایت ہے جو ابوسفیان کے سلسلے میں صحیح مسلم میں شامل کردی گئی ہے۔

حضرت ابوایوب انصاری مدینے میں پیغمبرؐ اسلام اور اسلام کے پہلے میزبان تھے جنہیں انصار کی اساسی عظمت کا درجہ دیا جاسکتا ہے آپ بھی اکثر انصار کی طرح ہمیشہ خانوادہ رسالت سے وابستہ رہے اسی لئے خلافت کی تسخیری مہمات میں آپ کا نام نظر نہیں آتا بلکہ سقیفہ کی ہنگامہ آرائیوں میں بھی آپ کا کوئی ذکر نہیں کیا جاتا مگر وہ سعد بن عبادہ کے ہم نوا ضرور رہے ہوں گے کیونکہ مسلک دونوں کا ایک تھا۔ حضرت سعد اور قیس بن سعد تاحیات خلافت کے سیلاب کے سامنے سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ایستادہ رہے تو حضرت ایوب کو ان سے الگ سمجھا نہیں جاسکتا۔

انصار کی ایک تعداد آگے چل کر خلافت کے متبعین میں شامل ہوگئی تھی مگر ان لوگوں میں سے کسی نے تعاون نہیں کیا۔ اسی لئے جنگ صفین سے پہلے ایسے افراد کا نام تاریخ میں نہیں ملتا اور ارباب خلافت نے غالبًا ان سے کوئی تعرض اس لئے نہیں کیا کہ کہیں مہاجر وانصار کی اندرونی جنگ شروع نہ ہوجائے۔ ایسا ہوتا تو اقتدار میں شامل کئے جانے کے باوجود بنی امیہ ابوسفیان کی سرکردگی میں حق اولی حاصل کرنے کے لئے انصار کے ساتھ آجاتے اور بنی ہاشم کی بڑی تعداد اور ان کے تمام سرفروش اور عرب کے مختلف کنبے سمٹ کر مدینے جمع ہوجاتے اور خالد بن ولید کے ان ساڑھے تین ہزار سواروں کا جواب مل جاتا جن کو حضرت ابوبکر کی جبریہ بیعت لینے کے لئے مسجد نبوی میں لاکر ٹھکرایا گیا تھا۔

لیکن ایسا کوئی خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوا کیونکہ حضرت علیؑ ہادی برحق کی وصیت اور منصوص من اللہ امامت کے تقاضوں کو پورا کر رہے تھے۔ انھیں برش شمشیر کے بجائے بھٹکے ہوئے لوگوں کو صراط مستقیم پر لانا تھا لہٰذا وہ اور ان کے متعلقین نشانہ ستم بنتے رہے اور حضرت عیسیٰ کی طرح ضبط و صبر کا اعجاز دکھاتے رہے۔۔۔ آنحضرتؐ کی زندگی کو آپ نے بچشم خود دیکھا تھا حجر و شجر اور عناصر فطرت سب تابع فرمان تھے مگر آپ لہولہان ہونے پر بھی درندہ صفت عربوں کو انسان بنانے میں لگے رہے اور بالآخر ظلم و جور کے ساتھ خود شل ہو گئے مگر مرسل آخر کا قدم جادہ استقامت پر لڑکھڑایا بھی نہیں۔

آج علیؑ کو بساط پیغمبری پر نائب ازلی کا کردار ادا کرنا تھا اور ان کی آزمائش کے ساتھ اصحاب باصفا کو بھی ایمان کی کسوٹی پر پورا اترنا تھا۔ ایسے میں سعد بن عبادہ ابوایوب انصاری، سلمان، ابوذر اور ان جیسے تمام لوگ مرضی مولا کے خلاف سر بھی ہلا نہ سکتے پھر بھی بنی ہاشم میں سے ہی کوئی زید شہید یا نفس ذکیہ بن کر اٹھ کھڑا ہوتا اور امام سے پوچھے بغیر اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے میدان میں آجاتا تو مستقبل کی تاریخ کیا ہوتی۔۔۔ قارئین اس کا فیصلہ خود کر لیں۔

مفروضات کے اس اندھے تصور میں ارباب سقیفہ کے اندھے مقلدین کو اپنے ہر سوال کا جواب مل جاتا اور خالد بن ولید کو سیف اللہ بنانے والے دیکھ لیتے کہ مدینے میں کوئی جواں سال قیس بن سعد بھی ہے جس کو شمشیر یزدانی کہا جا سکتا ہے۔۔۔ مگر ظلم ابھی انتہا پر پہنچا نہیں تھا اور کربلا میں کسی حسینؑ نے امامت کے منصب پر کھڑے ہو کر یہ بتایا نہیں تھا کہ عیسیٰ مریم کی طرح صلیب پر چڑھ جانے کا نام ہی اسلام نہیں ہے بلکہ ظالم کو سبق دے کر اور لڑ کر مر جانے کو بھی اسلام کہتے ہیں لیکن رسولؐ کو گزرے ہوئے ابھی زیادہ دن نہیں گزرے تھے۔ اسلام مجموعہ تھا تمام ادیان ماسبق کا اس میں ایوب و عیسیٰ کا صبر بھی تھا اور موسیٰ کی ہیبت بھی۔ صانع مطلق نے اجزائے اسلام کی تفسیر کو بارہ حصوں میں منقسم کر دیا تھا جس میں سے علیؑ کو شجاعت و استقامت حسنؑ کو حلم و تواضع حسینؑ کو دین کی حفاظت سید سجاد کو سجادہ صبر پر عبادت و ریاضت اور باقیات کو تقاضائے وقت کے مطابق دین کی ضرورت سپرد کی گئی تھی۔ ہر ایک کو مطابق منصب اپنے فرائض کو پورا کرنا تھا اس میں مشیت کا کوئی ردوبدل نہ ہو سکتا۔

علیؑ پہلے امام تھے اور ان کے صحابیوں کی اکثریت خود پیغمبر عرب کی تربیت یافتہ، سرتاپا دین کے سانچے میں ڈھلی ہوئی، کسی نے جانشین برحق کے ایماء کے بغیر قدم اٹھانا تو درکنار کچھ سوچنے کو بھی آداب ایمان کے خلاف سمجھا۔ دین کے دنیا ساز حکومت کو مضبوط کرنے کے لئے ختم ہو گئے۔ دنیا آج جعلی روایات کا سہارا لے کر اسلام کے ان مجسموں پر کیچڑ اچھالتی ہے اور اسے تاریخ کا حصہ قرار

دیتی ہے۔

دشمنان بانی اسلام

تاریخ مروجہ میں حضرت عمر کے بعد معاویہ کی فتوحات کا ذکر کیا جاتا ہے لیکن حقیقتاً ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اسلام کے نام پر اسلام کو مسخر کر لیا۔ مسلمانوں کے ایک گروہ کو لگ بھگ ناپید کر دیا تھا اور اولاد رسولؐ کے ناموں کو مستوجب عقوبت بنا دیا تھا۔ کتنی ہی جانبداری کی جائے مگر ان حقائق کو چھپایا نہیں جاسکتا کہ:-

یہود و نصاریٰ ہر طرح محفوظ تھے مگر علیؑ کا نام لیوا سات پردوں سے بھی ڈھونڈ ھ کر نکال لیا جاتا اور تہہ تیغ کر دیا جاتا یا زندگی کے دن پورے کرنے کے لئے زندان میں ڈال دیا جاتا تھا۔

بیت المال سے ملنے والا ان کا حق پہلے ہی چھینا جاچکا تھا اب خدا کی دی ہوئی زندگیوں میں سانس لینے کا فطری حق بھی ان کے پاس نہ رہا تھا۔ اولاد رسولؐ کے ناموں پر نام رکھنا مسلمانوں کے لئے موجب شرف ہوتا تھا، اب یہی شرف گردن زدنی قرار پایا تھا لہٰذا محبان علیؑ نے دشمنوں کے ناموں پر نام رکھنا شروع کر دیئے تھے جو تقیہ کی مصلحتوں میں دب کر رہ گئے اور صدیوں کے بعد ان کی اولاد دشمنوں کی صفوں میں ایستادہ نظر آنے لگی۔

رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امت سے فرمایا تھا کہ میرے اہل بیت سے محبت کرو یہی میرا اجر رسالت ہوگا۔ اس اجر رسالت کو ایک نئے معنی دیئے گئے تھے کہ اہل بیت سے دشمنی داخل ثواب اور علیؑ پر تبرا جزائے دینوی و اخروی ہے اور یہی نافرمانی رسول آہستہ آہستہ عین اسلام بن گئی جس پر توجہ دلائی جائے تو اس کا کوئی نہ کوئی فرضی جواب دے دیا جاتا ہے۔

فضائل علیؑ بیان کرنے کی جگہ مذمت اہل بیت میں جھوٹی روایتیں گڑھنے کو فرض عین ٹھہرایا گیا تھا جھوٹی احادیث کے لئے ایک علیحدہ شعبہ بھی قائم کر دیا گیا اور احادیث کو چوراہوں پر مشتہر کرنے کے لئے ایسے افراد بھی اس شعبے کے رکن بنادئے جو آیات کی غلط تفسیریں بھی بڑی خوبی سے کرتے تھے۔

اب علیؑ کے دوستوں کے مکانات مسمار ہوچکے تھے، جائدادیں بحق سرکار ضبط ہوگئی تھیں شیعہ عراق و شام میں منظر عام پر دکھائی نہ دیتے لہٰذا انہیں چھوٹے چھوٹے مقامات پر ڈھونڈ نکالنا لائق انعام ٹھہرایا گیا تھا اور یہ کام بڑی سرگرمی سے ہو رہا تھا۔

قید خانے محبان اہل بیت سے بھر چکے تھے اور لوگ شارع عام پر ان کا خون دیکھتے دیکھتے

تھک چکے تھے لہٰذا ان کی آنکھوں میں نیل کی سلائیاں پھروا کر چھوڑ دینا بھی داخل ثواب اور حکومت کی خوشنودی کا موجب بن گیا۔ ستم رانی کے نئے نئے طریقے ایجاد کئے گئے تھے جو بظاہر تو فرمانروائے وقت کی ذہنی اختراع تھی لیکن در پردہ اولادِ رسول کی دشمنی پر اس کی اساس رکھی ہوئی تھی اور جو لوازمات شاہی میں داخل تھی۔

استقرار حکومت کے لئے بنی امیہ کے نت نئے مظالم کا سہرا صرف اور صرف حضرت معاویہ کے سر جاتا ہے۔ شاید اسی لئے مسلمانوں کا ایک گروہ ان کی ہر لغزش اور ہر گناہ کی پردہ پوشی پر تیار رہتا ہے اور ان کی صحابیت، کتابت وحی اور ام المومنین سے اخوت کی رٹ لگائے رہتا ہے۔ اس کی تائید میں ایک حدیث قابل ملاحظہ ہے۔

''عبداللہ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ مسلمان ابوسفیان کی طرف توجہ نہیں کرتے تھے اور نہ اس کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے تھے۔ ایک بار اس نے رسول اللہ سے کہا: یا نبی اللہ میں تین عطیات کا امیدوار ہوں۔ آپ نے فرمایا، اچھا۔ ابوسفیان نے کہا عرب کی خوبرو اور حسین ترین عورت میری بیٹی ام حبیبہ ہے۔ آپ اس کو اپنی زوجہ بنالیں، آپ نے کہا، اچھا پھر وہ بولا: معاویہ کو اپنا کاتب مقرر کردیں آپ نے فرمایا، اچھا، پھر اس نے کہا، تیسری بات یہ ہے کہ مجھے اجازت دیں کفار سے لڑنے کی، میں اسی طرح لڑوں گا جس طرح مسلمانوں سے لڑا کرتا تھا۔''

''ابوذرمیل کا کہنا ہے کہ اگر وہ ان باتوں کا سوال آپ سے نہ کرتا تو آپ حامی نہ بھرتے کیونکہ وہ جو کچھ کہتا تھا آپ ہاں کہہ دیتے تھے''۔ (۱۵)

اس حدیث کی رو سے ابوسفیان نے چار باتوں کی درخواست کی تھی۔ پہلی تو یہ کہ مسلمان اس سے بے اعتنائی کرتے تھے لہٰذا وہ حضورؐ کا تقرب چاہتا تھا۔ دوسری بات یہ کہ اس کی حسین و جمیل بیٹی ام حبیبہ کو عقد میں لے لیں۔ اس میں بھی آنحضرت کی خوشنودی حاصل کرنے کا پہلو تھا۔ تیسری خواہش اپنے بیٹے معاویہ کو پیغمبرؐ اسلام کا کاتب بنالینے کی۔ چوتھی غرض یہ تھی کہ اسے بھی قدیم سرفروشوں کی طرح جہاد میں شریک کیا جائے۔ آپؐ نے ہر خواہش پوری کرنے کا وعدہ کرلیا۔

ان خواہشات کے وقت کا اندازہ کرنے کے لئے ابوسفیان کے حلقہ اسلام میں داخل ہونے کا جائزہ لیا جائے تو دس رمضان ۸ھ کو حضرت عباسؓ کی سفارش پر ابوسفیان کا قصور معاف کیا گیا تھا، معرکہ حنین شوال میں واقع ہوا اس میں ابوسفیان دور کا تماشائی تھا، واقعہ وادی الرمل میں بھی تاریخ اس کا نام نہیں لیتی۔ شاید ۸ھ کے آخر ۹ھ کے شروع میں اس نے بارگاہ نبوت میں جگہ بنانے کی کوشش کی ہو۔

دوسری خواہش ایک بے بنیاد بات معلوم ہوتی ہے کیونکہ ام حبیبہ عبداللہ ابن جحش کی بیوی تھی جو مسلمان ہو گیا تھا اور پھر حبش میں عیسائیت قبول کر کے مر گیا تھا مگر ام حبیبہؓ اسلام پر قائم رہیں۔ آنحضرت نے بنی امیہ کی ایک بیٹی کو داخل حرم کرنے کی خاطر نجاشی کو لکھا تھا۔ نجاشی نے مسلمانوں کو جمع کیا جن میں حضرت جعفر ابن ابی طالب بھی تھے۔ کہا جاتا ہے کہ نجاشی نے خود رسولؐ کی وکالت کی تھی اور خطبہ بھی پڑھا تھا جو بعض مورخین نے نقل کیا ہے۔ ام حبیبہ کی وکالت خالد بن سعید بن عاص نے کی تھی جو عمرو بن العاص کے بھتیجے تھے۔ مہر چار سو دینار تھا جو نجاشی نے یا حضرت جعفر نے خالد کو ادا کئے تھے لیکن ام حبیبہ عملی طور پر ۷ھ میں حضور کی زوجہ بنی تھیں جو ابوسفیان کے مسلمان ہونے سے تقریباً ڈیڑھ سال پہلے کی بات تھی۔

تیسری بات معاویہ کے کاتب ہونے کی ہے جس کی مدت پونے دو سال سے زائد سمجھ میں نہیں آتی۔ چوتھی خواہش پوری نہیں ہوئی کیونکہ ابوسفیان نہ غازی بن سکا اور نہ شہید۔

حدیث صحیح مسلم سے ماخوذ ہے جو صحیحین میں دوسرے نمبر پر ہے پہلا نمبر صحیح بخاری کا ہے جو بعد کتاب باری تصور کی جاتی ہے لہٰذا حدیث کے غلط ہونے کا گمان بھی نہیں کیا جا سکتا۔ صحیح مسلم کے بارے میں شیخ ابوعمرو کا قول ہے کہ جو کتابیں صحیح مسلم کے بعد لکھی گئیں ان کی صحت اغلب ہے مگر وہ صحیح مسلم کے برابر نہیں ہو سکتیں۔ اس صحیح کی شرحیں بہت سے علماء نے لکھی ہیں لیکن امام حافظ ابوزکریا محی الدین نووی شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی تالیف افضل ہے اسی کا ترجمہ مستند قرار دے کر زیر نظر ایڈیشن میں شامل کیا گیا ہے۔ (جلد اول صفحہ ۱۳)

بخاری اور مسلم کے تقابل و توازن میں ابوالعباس بن عقدہ نے مسلم کو ترجیح دی ہے جبکہ بخاری سے مسلم کا استفادہ بھی مسلم ہے پھر بھی زیر بحث حدیث کے سلسلے میں امام نووی کے نوٹ کا خلاصہ قابل ملاحظہ ہے۔

''ابوسفیان نے پہلے پہل جان کے خوف سے اسلام قبول کیا تھا، بعد میں شاید ایمان پختہ ہو گیا ہو یہ رحمۃ للعالمین کا حسن خلق تھا کہ آپؐ نے اس کا ہر قصور معاف کر دیا اس کے بعد معاویہ بن ابوسفیان نے امیر المومنین خلیفہ برحق حضرت علیؑ کا مقابلہ کیا اور جنگ صفین میں ہزاروں مسلمانوں کے خون میں ہاتھ رنگے، امام حسنؑ کو زہر دلوایا اور ان کے بیٹے یزید پلید نے تو ستم ہی ڈھا دیا امام حسینؑ کو اتنی بے دردی سے قتل کرایا کہ قلم لکھنے سے کانپتا ہے۔ یزید کے بعد سارے خلفائے بنی امیہ بجز عمر بن عبدالعزیز خاندان نبوت کے دشمن رہے اور دنیائے دنی کے لئے اپنی آخرت کو تباہ کرتے رہے۔''

امام نووی کا کہنا ہے کہ اس حدیث میں اشکال ہے۔ ابن حزم کا قول ہے کہ روایت میں وہم ہے اور یہ موضوع معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس کا راوی عکرمہ بن عمار ہے۔ شیخ ابن صلاح نے ابن حزم کی تردید کی ہے اور اس کو عکرمہ پر الزام تراشی کے ہم معنی قرار دیا ہے۔ وکیع اور یحیٰی ابن معین نے عکرمہ کو ثقہ اور مستجاب الدعوۃ بتایا ہے۔ ان کی دلیل ہے کہ ابوسفیان کا مقصد تجدید عقد ہوگا وہ سمجھتا ہوگا کہ بیٹی کا نکاح بغیر باپ کی مرضی کے ناجائز ہے۔ اسی لئے حضور نے صرف اچھا کہا۔ نہ تجدید عقد کیا اور نہ یہ کہا کہ تجدید عقد ضروری ہے۔

علمائے عظام کی آراء کا اختلاف حدیث کے صحیح یا غلط ہونے کے محور پر گھومتا ہے اور بعض علماء کے الفاظ سے ابوسفیان کی خوش نیتی کا تائیدی پہلو جھانکتا نظر آتا ہے، بغیر یہ سمجھے ہوئے کہ اس کی ہر بات پر ہاں کہہ دینا منصب پیغمبری کو مجروح کرتا ہے کہ آپ نے اس کے غلط خیال پر تو کا نہیں۔۔۔ ایک نظریہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ صحیح مسلم میں غلط حدیث شامل ہونے کی صفائی دیدی جائے حالانکہ ایسی ہر کوشش بیکار ہے۔ گڑھنے والے کو تو یہ بتانا تھا کہ ''عرب کی حسین ترین عورت'' میں پیغمبر اسلام دلچسپی رکھتے تھے ورنہ جو عورت ام المومنین بن چکی تھی، اس کے باپ کی بے خبری میں عقد کی دعوت دینا پیغمبر کی سیرت کو مجروح کرنے کے برابر تھا۔ حضور کسی عورت کو گھر تو نہیں ڈال سکتے تھے۔ امام ابن سیرین اور بعض جید علماء کا یہ فیصلہ ہے کہ حضرت علیؑ کے متعلق جو احادیث ہیں ان میں سے بیشتر وضعی ہیں لہٰذا اس موضوع پر کوئی بحث بیکار ہے۔ جہاں تک اس حدیث کا تعلق ہے وہ مسلمہ طور پر جھوٹی ہے مگر اس کے لئے امام بخاری یا امام مسلم موردالزام قرار نہیں دئے جاسکتے کیونکہ ذخیرہ احادیث جو کچھ تھا وہ احتیاط کے ساتھ اسی میں سے احادیث لے سکتے تھے۔ انتخاب میں انہوں نے سوجھ سے کام لیا ہوگا لیکن کرتے کیا اکثر حدیثوں کو جھٹلا تو نہ سکتے تھے۔۔۔۔۔ اور ہوسکتا ہے کہ بعض محدثین کے دلوں میں بغض علی بھی چھپا ہوا ہو اور انہوں نے جان بوجھ کر منقصت علی کی روایات منتخب کر لی ہوں۔

یہ اور بات ہے کہ ان احادیث سے بھی بہت سی دوسری حدیثوں کی طرح ان کرداروں کی قلعی اتر جاتی ہو جن کے بل پر اکثر مسلمانوں نے انھیں تاریخ اسلام کا ہیرو بنا رکھا ہے جیسے ابوسفیان، معاویہ بن ابی سفیان اور اس کے بعد باستثنائے عمر بن عبدالعزیز سارے سلاطین بنی امیہ۔ معاویہ بن ابی سفیان کے فضائل میں صحابیت، کتابت وحی، ام المومنین ام حبیبہ سے اخوت اور شمولیت عشرہ مبشرہ وغیرہ۔ صحابیت کی مدت اور کتابت وحی کا عرصہ مبینہ حدیث سے ظاہر ہوتا بشرطیکہ وہ حدیث صحیح ہوتی۔ ام المومنین سے قرابت کا شرف موجب قرابت قرار پاتا، اگر وہ ام حبیبہؓ کے رشتے سے اسلام لائے ہوتے

لیکن انہوں نے تو اپنے بڑے باپ کے ساتھ بادشاہ عرب کا طنطنہ دیکھ کر سر پر غرور کو خم کیا تھا۔
رہ گئی خود ان کی سیرت تو خلیفۂ اسلام کے باغی، حضرت علی ابن ابی طالب، امام حسن، مالک اشتر، محمد بن ابی بکر، حجر بن عدی، عبدالرحمٰن بن حسان عنزی، عمرو بن حمق خزاعی، محمد بن حذیفہ، اوفی اور صفین کے ہزاروں مسلمانوں کے قاتل، مکر و فریب اور زہر سے مخالفوں کو ٹھکانے لگانے والے، شکست سے بچنے یا جنگ جیتنے کے لئے قرآن کریم کا غلط استعمال کرنے والے، اسلام کا نام لے کر دھوکا دینے والے، بیت المال کو مستحق مسلمانوں کے بجائے آلہ کار بننے والوں اور دین کے دشمنوں میں تقسیم کرنے والے!

حدیث رسولؐ ہے:-

''جو شخص ہم پر ہتھیار اٹھائے اور جو ہم کو دھوکا دے وہ ہم میں سے نہیں ہے''!(۱۶)

لیکن جن کے سامنے صرف حصول تخت و تاج تھا وہ ایسے ارشادات کی پروا کیا کرتے۔ علی کے آغاز خلافت کا بنگاہ غائر جائزہ لیا جائے تو شام کے سیاست کار نے علیؑ کی بیعت کرنے والوں میں سے اس عنصر کو توڑ لیا تھا جن کے دلوں میں دین پر دنیا غالب تھی اور جو علیؑ سے کسی طرح کی عداوت دیرینہ بھی رکھتے تھے۔ عبداللہ ابن عمر، عبیداللہ ابن عمر، سعد بن ابی وقاص، عمرو بن العاص عبداللہ بن خالد، ولید، عتبہ، عبدالرحمٰن ابن خالد وغیرہ میں علی کے ایک معتمد اشعث بن قیس کا اضافہ ہوا پھر صحابہ کے بعض موقر نام ابوموسیٰ اشعری وغیرہ ان میں شامل ہوئے لیکن صاحبان ایمان سب کے سب خلیفہ برحق کے ساتھ تھے جن کی ایک تعداد نے اسلام کی بقاء کے لئے جام شہادت نوش کیا اور باقیات کو معاویہ نے اقتدار پر قبضہ کرنے کے بعد موت کے گھاٹ اتروا دیا۔

اس طرح شام کے حکمران نے مملکت اسلامیہ کی فرمانروائی حاصل کرنے کے لئے ہر حربہ استعمال کر ڈالا۔ جائز و ناجائز کی تمیز بارگاہ نبوت میں دو پونے دو سال بیٹھنے سے کیا ہوتی مگر موروثی ذہن کو اسلام کا نام دے کر کامیابی ضرور حاصل کر لی اور اس کا جواز پیدا کرنے کی خاطر صحابی رسول اور کاتب وحی کہے جانے کی جھوٹی روایات گڑھوالیں جن کی آواز بازگشت آج بھی گونجتی رہتی ہے مگر اہل علم وفکر اس کی حقیقت کو جانتے ہوئے بھی خاموش ہیں۔

سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ کہاں وہ ہستیاں جن پر کفر کا سایہ بھی نہیں پڑا اور کہاں وہ لوگ جو پیدا ہوئے شرک کے دامن میں، آنکھ کھول کر ہر طرف تاریکیاں ہی تاریکیاں دیکھیں، پرورش پائی تو کفر کی آغوش میں ان کا موازنہ صاحبان تطہیر سے کیا جائے تو اس کو زمانے کی بوالعجبی کے سوا کیا کہا جائے

گا۔۔۔ مانا کہ کلمہ لا الہ کہنے کے بعد پچھلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں مگر جو سایہ ایمان میں آ کر اپنے عمل سے عہد جاہلیت اور عالم کفر کی یاد تازہ کرے، اس کو صحابہ کرام کے زمرے میں کیسے شامل کیا جا سکتا ہے اور کاتب وحی کہے جانے کا تو کوئی محل ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کسی نے آخر وقت میں کسی وحی کا بیان سن لیا ہو اور اپنے طور پر اس کو لکھ لیا ہو تو اس سے کاتب وحی کیونکر بن سکتا ہے۔ مقام فکر ہے یاران نکتہ داں کے لئے!

عربی کہاوت ہے کہ "الحق مُرٌ"۔ مفروضات اگر عقیدہ بن جائیں تو اس کے خلاف مستند حقائق بھی اکثر قابل برداشت نہیں رہتے لیکن تاریخ کی روشنی میں محمدؐ اور دین محمدؐ کا حریف کافر ابوسفیان تھا اور فتح مکہ کے بعد سے مسلمان ابوسفیان تو کہا ہی جائے گا۔

پھر ارتقائے وقت میں شاہراہ دین پر اولاد ابوسفیان آل محمدؐ کو ہمیشہ جھٹلاتی رہی اور دین کے نام پر علم برداران دین کا خون بہاتی رہی اور آخر ایک وقت ایسا آیا کہ ابوسفیان کے نام لیواؤں نے وضع احادیث اور جھوٹی روایات کی مشتہری کرا کے دین کی شکل وصورت اتنی بگاڑ دی کہ خود اپنے خصائص جاہلیت کے ساتھ اس کے معیار پر پورے اتر سکیں اور مملکت اسلامیہ کی سربراہی کے اہل ثابت ہو سکیں۔ کرداروں کے اس تسلسل نے مسلمانوں کو ایک ایسے مقام پر لا کھڑا کیا جہاں سے -

بت خانہ بھی وحشت میں کعبہ نظر آتا ہے

تاریخ کی ان غلط بیانیوں اور کفر پر ایمان کی ملمع سازیوں کو دیکھ کر ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ پیغمبرؐ اسلام اور اسلام کی میزان پر ایسے تمام کرداروں کو پرکھا جائے جن کو مناصب خلافت کا مستحق اور اہل ثابت کرنے کے لئے فضائل ومناقب کے انبار لگائے گئے ہیں۔ لہٰذا ہادی برحق کی پوری زندگی کا ایک مختصر سا خاکہ پیش کیا جاتا ہے تاکہ اس کو معیار بنا کر ایک جائزہ لیا جائے کہ کس کس نے خدمت اسلام میں کیا کارنامے انجام دیئے جن کی بنیادوں پر بارگاہ احدیت اور دربار رسالت سے ان کے شرف و منزلت کا اعتراف کیا گیا اور انھیں بعد رسولؐ جانشینی کا اعزاز بخشا گیا۔

نبوت سے خلافت تک

حیات طیبہ کے بعد پیغمبر عرب کی جانشینی کے دو نظریے مختلف فیہ رہے ہیں۔ ایک امامت، دوسرے خلافت۔ خلافت کے لئے سورۃ شوریٰ کی ایک آیت کو بنیاد بنایا گیا کہ اپنے مسائل میں باہم مشورہ کرلیا کرو اس کا ڈھانچہ صحرا کے قبائلی رواج کے طرز پر تیار کیا گیا۔ امامت کے عقیدتمندوں کا کہنا یہ تھا کہ نبوت حضور پر ختم ہوگئی تھی اور نبی کا منصب یہ ہوتا ہے کہ سابقہ رسول کی شریعت کا نفاذ کماحقہ کرتا رہے۔

رسول اسلام کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں تھا اور اسلام کا نفاذ تا قیامت باقی رہنا تھا لہٰذا منصب نبوت کے بجائے پروردگار عالم نے ایک نیا منصب بنی نوع انسان کو تفویض کیا جس کا نام امامت تھا اور نبی کی طرح اس کا حامل منصوص من اللہ تھا۔ یہ کام کسی انسان کا نہیں تھا کہ خود امام بن جائے یا کسی کو اپنا امام بنالے کیونکہ شریعت اللہ کی طرف سے آئی تھی لہٰذا اس کا نافذ یا معلم بھی وہی ہوسکتا تھا جس کو رموز یا اسرار شریعت خود اللہ نے تعلیم دیے ہوں۔

اس عقیدے کو علم برداران خلافت نے تسلیم نہیں کیا اور نظریہ امامت کے حلقے نے اصول خلافت سازی کو نہیں مانا۔ وہ خدا کا اختیار بندوں کے ہاتھ میں لے لینے کے قائل نہیں تھے۔۔۔ یہ نظریاتی تضاد آج تک پایا جاتا ہے۔

اللہ کا کوئی سفیر طاقت کے بل پر کبھی اپنے اصول نہیں منواتا بلکہ اپنے کردار و عمل سے بھٹکے ہوئے انسانوں کو صراط مستقیم دکھاتا ہے اور ذہنوں کو آہستہ آہستہ اس طرح منقلب کرتا ہے کہ لوگ غیر ارادی طور پر سیدھا راستہ اختیار کرلیں۔ یہی سنت پیغمبری، امام کا مسلک و منصب ہوتی ہے لیکن وہ ان حدود کا پابند ہوتا ہے جو شارع ماسبق کی متعینہ ہوتی ہیں۔ اسلام میں اسی کا نام امامت تھا جو نیابت رسول

کہلائی۔

دوسرا نظریہ خلافت کا تھا جو درحقیقت نظم ونسق ہاتھ میں لینے کی خاطر وجود میں آیا تھا اور حلقہ اسلام پر بالادستی کی کشش اس کی اساس تھی جس کو عرف عام میں اقتدار کہا جاتا ہے۔ چونکہ یہ دونوں حیثیتیں عرب کے نجات دہندہ کی ذات واحد میں مرکوز تھیں لہٰذا جو مسند خلافت پر بیٹھا اس نے مقبوضات کا انتظام سنبھالنے کے ساتھ ساتھ دین کی رہنمائی بھی ہاتھ میں لے لی۔ کوئی نبی خدا کی طرف سے کوئی سند لے کر تو آتا نہیں ہے، خود اس کا کردار و سیرت صداقت کی دلیل بنتی ہے۔ وہی صورت امام کی تھی۔ وہ دنیا کو دین کے خطوط پر چلانے کے لئے وجود میں آیا تھا لہٰذا دینی رہنمائی کے لئے زور بازو کا استعمال نہ کر سکتا۔ بلاشبہ رسول برحق نے متعدد مواقع پر اپنے متبعین کو بتایا تھا کہ آپ کے بعد کون آپ کے منصب کے لئے منصوص ہوا ہے مگر اقتدار طلب ذہن نے اس کو ٹھکرا دیا اور امامت کے بجائے خلافت کا نفاذ کر دیا۔ اگر منصوص من اللہ امام خلافت کے لئے تلوار بے نیام کرتا تو لڑائی تاج وتخت کے لئے ہوتی اور سیرت رسولؐ کے خلاف قرار پاتی۔

یہ تاریخی تضاد بار بار زیر بحث آچکا ہے۔ بعد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان دو گروہوں کا مختصر تعارف کرایا جائے تو دو نام سرفہرست آتے ہیں۔ ایک حضرت علیؑ کا، دوسرا حضرت ابوبکرؓ کا۔ انہیں دو شخصیتوں کی بنیاد پر مستقبل کی تاریخ سازی کی گئی۔ امامت کا انحصار عقیدے پر تھا۔ ان کے منکرین بانیان خلافت قرار پائے اور یہی خلافت رسول کی نیابت کے مترادف ہے جس سے مسلمانوں کی دنیا و دین کی وابستگی آج تک غیر منفصلہ ہے۔ تاریخ کی روشنی میں متعلق افراد کا جائزہ لیا جائے تو پیغمبر حق کے زندگی نامے میں ان کی خدمات اور اہلیت واضح ہو سکتی ہے۔

پہلا نام حضرت ابوبکر کا ہے جو یار غار، صدیق اور محسن اسلام وغیرہ کہے جاتے ہیں۔ آپ کو آنحضرت کا ہم عمر بتایا جاتا ہے اور اسلام لانے کے بعد سے ہر مرحلے میں فداکار اسلام قرار دیا جاتا ہے۔ ترسٹھ سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔ ڈھائی سال خلافت کے نکال دیئے جائیں تو ساٹھ سال تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ساتھ رہا جس میں سے بچپن کے سات آٹھ سال آنحضرت کے مکے سے باہر گزرنا پھر اٹھتی جوانی میں حضرت ابوطالب کے ساتھ شام کا سفر اور خدیجۃ الکبریٰ کی تجارت کے سلسلے میں کئی برس باہر جانا ثابت ہے البتہ اعلان نبوت سے تادم مرگ اٹھارہ انیس سال آپ کو حضوری کا شرف حاصل رہا اور یہی مدت دوسروں پر آپ کو افضل قرار دیتی ہے۔

دوسرا نام حضرت عمر کا آتا ہے۔ آپ کی ذات سے تدبر، حق پرستی اور صداقت کی کتنی ہی

داستانیں مشہور ہیں۔ ایک حدیث یہ بھی ملتی ہے کہ نبوت آنحضرت پر ختم نہ ہو جاتی تو آپ ''صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' کے بعد حضرت عمر کو ملتی۔ مسلمانوں کی فتوحات ان کے عہد کا کارنامہ ہیں۔ آپ بعثت کے بعد اسلام لائے یعنی اعلان نبوت کے سات سال بعد۔ حلقہ بگوش اسلام ہونے کے وقت آپ کی عمر ۲۷ سال تھی قبولیت اسلام میں آپ کا اکتالیسواں نمبر تھا۔ ۶۳ سال کی عمر میں ابولولو فیروز کے ہاتھوں موت واقع ہوئی۔ آپ حضرت ابوبکر کے مشیر خاص تھے۔ تیرہ سال حضور کی خدمت میں گزارے۔

تیسرا نام حضرت عثمان کا لیا جا سکتا ہے۔ آپ کی دولت و ثروت مسلمانوں کی زبان زد ہے۔ اسلام کے سب سے بڑے دشمن بنی امیہ کے فرد تھے یعنی ابوسفیان کے بھتیجے۔ حضرت ابوبکر سے آپ کے بہت گہرے مراسم تھے۔ انہوں نے اسلام کی طرف مائل کیا اور آپ زبیر بن العوام، عبدالرحمٰن ابن عوف، سعد بن ابی وقاص کے تسلسل میں اسلام لائے اور اسلام کے لئے کافی سرمایہ خرچ کیا لہٰذا غنی کہے جاتے ہیں۔ بعض مورخین کے بقول رسول اللہ کی دو بیٹیاں یکے بعد دیگرے آپ کو بیاہی گئی تھیں اس لئے ذوالنورین ہونے کا شرف آپ کو حاصل ہے۔ ذی الحجہ ۳۵ھ کو ۸۲ سال کی عمر میں باغیوں کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ عمر کے چونتیس سال عالم کفر میں گزارے اور سینتالیس، اڑتالیس سال حلقہ بگوش اسلام ہو کر بسر کیے۔

صحابہ کرام کے ناموں کے ساتھ بعض خصوصی فضائل اور القاب لیے جاتے ہیں جو اختصار کے ساتھ درج کیے جاتے ہیں۔

حضرت ابوبکر:- مسلم اول، صدیق، یار غار، محسن اسلام، اہل علم و تقوی، اہل جنت و جانشین اور عاشق رسول۔

حضرت عمر:- فاروق، لائق پیغمبری، شجاع، غیرت دار، نیک، سخی، مقبول بارگاہ خداوندی، فاتح اعظم اور اہل جنت۔

حضرت عثمان:- غنی، ذوالنورین، حیادار اور اہل جنت۔

حضرت علی:- امام ابن سیرین کا کہنا ہے کہ حضرت علی کے بارے میں جو احادیث پائی جاتی ہیں، ان میں سے اکثر موضوعی ہیں۔ امام نودی ان روایات کو جھوٹا تو نہیں بتاتے لیکن ان کی جو تفاسیر کرتے ہیں ان میں روایات کے دائرے کو اتنا وسیع کر دیتے ہیں کہ علی کی ہر فضیلت دوسروں پر منطبق ہو جاتی ہے لہٰذا ان کو درج نہیں کیا گیا۔ سلسلہ بحث میں ان کا حوالہ خود بخود آ جائے گا۔

حضرت ابوبکر کی منزلت کے سلسلے میں یہ حقیقت ناقابل انکار ہے کہ وہ کاروان اسلام کے

ابتدائی چند افراد میں تھے۔ اقتدار کے پس منظر نے بعد رسول ان سے ہر شرف کو وابستہ کر دیا ہے جو پہلے دن سے متنازعہ رہا ہے اور کبھی متفقہ طور پر تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ بلاشبہ وہ زید بن حارثہ کے بعد یا پہلے اسلام لائے حالانکہ زید سے پہلے ان کی قبولیتِ اسلام ہمیشہ ثبوت کی محتاج رہے گی کیونکہ زید حضرت علیؑ کی طرح بیتِ رسول کے ایک فرد تھے۔

حضرت ابوبکر ہم سن ہونے کے سبب یقیناً محمدؐ ابن عبداللہ کو مکہ کی ابتدائی زندگی سے جانتے ہوں گے لیکن ابوطالب کا بھتیجا آٹھ نو سال کی عمر سے اپنے معمولات میں دوسروں سے مختلف تھا۔ اس کے پاس دوسرے عرب کے لڑکوں کی طرح ادھر ادھر ضائع کرنے کا وقت نہیں تھا تاہم اتنا ضرور ہوگا کہ ابوقحافہ کا بیٹا دوسروں کے مقابلے میں ان کے زیادہ قریب رہا ہو لیکن اس تقرب پر دوستی کا اطلاق تو نہیں ہو سکتا۔ ہاں وہ لوگ اس کو دوستی کہہ سکتے ہیں جو حضور کی ابتدائی زندگی کو کافرانہ قرار دیتے ہیں۔

ہم تو عبدالمطلب کے پوتے میں کم سے کم توحید کے اس یقین کے قائل ہیں جس کا اظہار عبدالمطلب نے ابرہہ سے کیا تھا۔ ''میں تو اپنی بھیڑوں کی واپسی کا مطالبہ کرنے آیا ہوں، رہی بات کعبے کی تو اس کی حفاظت کعبے کا مالک خود کرے گا''۔ جیسے عبدالمطلب کو ابابیلوں کا لشکر آنے کا حال معلوم تھا۔

بہر طور یہ مسلم ہے کہ حضورؐ حضرت ابوبکر کو بچپن سے جانتے پہچانتے تھے اور جب عرب کے مرکزی شہر میں آپ کی صداقت اور ذہانت کا آوازہ گونج رہا تھا تو حضرت ابوبکر کی آواز دوسری آوازوں میں ایک امتیاز رکھتی تھی۔ جہاں تک حضرت علیؑ کا تعلق ہے، وہ کسی توازن و تقابل کے دائرے میں آتے ہی نہیں۔ انہوں نے تو آنکھ ہی آغوشِ اسلام میں کھولی تھی۔ حضور ولادت کے بعد انہیں خانہ کعبہ سے لے آئے تھے اور مورخ کی بات مان لی جائے تب بھی چار برس کی عمر سے حضور کے سایہ عاطفیت میں پرورش پاتے رہے۔ حضور کے متعلقین میں خدیجۃ الکبریٰ، علی اور زید بن حارثہ تھے۔ ان سب کا حضور سے زیادہ متاثر ہونا ناگزیر تھا۔

حضرت علیؑ کا ارشاد ہے کہ میں آنحضرت کے پیچھے اس طرح چلتا تھا جیسے بکری کا بچہ اپنی ماں کے پیچھے چلتا ہے۔

اور مسلم اول ہونے کی بحث کا یوں بھی کوئی حاصل نہیں کیونکہ بات ہوتی ہے اسلام پر یقین کی اور یقین ہی میزان بنتا ہے ایمان کی درجاتی تقسیم کا۔ اسلام لانے کے بعد پچھلے تمام گناہ تو معاف ہو جاتے ہیں۔ بات رہ جاتی ہے منزلت ایمان کی تو علیؑ نے کفر کے سایے میں ایک لحظہ بھی نہیں گزارا تھا،

دیکھا تھا تو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو، سمجھا تھا تو دین رسول کو، وہ جانتے بھی نہیں تھے کہ لات وعزیٰ کے سامنے خم کس طرح ہوتے ہیں اور انسان کے دل میں ان کی عظمت کے تاثرات کیا ہوتے ہیں لہٰذا ان سے ابوبکر ابن ابوقحافہ، عمر ابن خطاب یا عثمان بن عفان یا کسی اور کا کوئی مقابلہ ہی کیا تھا!

وہ لوگ جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شق الصدر کے قائل ہیں، وہ تو کہہ ہی نہیں سکتے کہ دلوں سے کفر کی سیاہی ایمان کی ضو پڑتے ہی اکدم دور ہو جاتی ہے۔ دور ضرور ہوتی ہے مگر آہستہ آہستہ اور یقیناً وہ وقت بھی آ سکتا ہے جب جذبہ ایمان کی مسلسل تڑپ کفر کے گہرے گہرے نقوش کو پہلے ہلکا پھر کالعدم کر دے۔ نرم مٹی یا ریت کے ذرات جس طرح پتھر کی شکل اختیار کرتے ہیں اور ماہیت وآب و ہوا کے لحاظ سے کوئی رنگ اختیار کرتے ہیں، وہی صورت دل کی بھی ہے اور عقیدے کی پرداخت بھی اسی طرح ہوتی ہے۔ دماغ کی افہام وتفہیم اس پر اثر انداز ضرور ہوتی ہے لیکن ایک رنگ کے بعد دوسرا رنگ چڑھنا ہمیشہ وقت کا محتاج رہتا ہے۔

اس کا اندازہ کوئی آدمی خود اپنے کو مثال بنا کر کر سکتا ہے۔ اس نے جس ماحول کی گود میں پرورش پائی ہے اور جس عقیدے کے نقوش اس کے دل پر مرتسم ہو چکے ہیں، دماغ ان کا بطلان کرے تو دل قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتا اور کسی معجز نما پیغمبر کی صداقت دماغ کو مجبور کر دے تو دل چارونا چار سر جھکا دیتا ہے مگر ایک مدت تک ڈانواڈول رہتا ہے اور جب صداقت فرار کا ہر راستہ مسدود کر دیتی ہے تو دل تسلیم کر لیتا ہے۔ پھر بھی ماضی ذہن کے دریچوں سے جھانکتا رہتا ہے۔ ایسے میں ناپختہ عقیدہ کبھی کبھی پیچھے کی طرف پلٹ جاتا ہے مگر عام طور پر بتدریج راسخ ہوتا رہتا ہے۔

یہی صورت اسلام کے دامن میں پناہ لینے والوں کی بھی تھی۔ کوئی ایمان کی منزلوں پر منزلیں طے کرتا رہا، کوئی دوراہے پر کھڑا رہ گیا اور کوئی ماضی کی طرف پلٹا تو نہیں مگر حال کا نقاب چہرے پر ڈال کر صرف کہنے کے لئے حلقہ صحابہ میں شامل ہو گیا۔ دماغ پر دل کے غلبے میں وہ ہوا کا رخ دیکھتا رہا۔ انہیں کو قرآن کی اصطلاح میں منافق کہا گیا ہے۔ مورخ صرف ایک نام عبداللہ ابن ابی کا لیتا ہے لیکن تھے تعداد میں وہ بہت زائد کیونکہ قرآن مجید نے انتیس باران کا ذکر کیا ہے۔

حضرت ابوبکر پر اگرچہ اس کا اطلاق نہیں ہوتا مگر انہوں نے بھی سینتیس اڑتیس سال عالم کفر میں گزارے تھے تاہم اصحاب رسول میں سرفہرست انہیں کا نام ہے۔ ان کا لقب توصیفی صدیق رہا جو نام کا جزو بن گیا ہے۔ یقیناً انہوں نے پیغمبر برحق کے قول کی تصدیق کی تھی اور لب ہائے رسالت سے انہیں صدیق کہا گیا تھا مگر اصحاب میں بعض نام اور بھی ہیں جن کو حضور نے صداقت کی سند دی تھی۔ حدیث

رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے: ''آسمان نے سایہ نہیں کیا اور زمین نے اٹھایا نہیں کسی ایسے شخص کو جو ابوذر سے زیادہ سچا ہو'' الاستیعاب میں آنحضرت نے حضرت ابوذر کے زہد کو عیسیٰ مریم کے زہد سے تشبیہ دی ہے۔ ابوذر پروانہ اہل بیت تھے اور اس کی سزائیں بھگتے رہے۔ حضرت عمر کے دور خلافت میں شام چلے گئے تھے۔ وہاں مناقب آل محمد کا پرچم بلند کیا۔ معاویہ بن ابی سفیان کی شکایت پر حضرت عثمان نے مدینے طلب کیا۔ یہاں بھی انہوں نے اعلائے کلمۃ الحق میں زبان بند نہیں کی۔ انجام کار جلاوطن کئے گئے اور ربذہ کے بے آب وگیاہ ریگستان میں دم توڑ دیا۔

ایک بڑا اشرف ہے حضرت ابوبکر کا اسلام پر احسانات کرنے کا یعنی مالی احسانات کا جن کی تفصیلات عموماً بیان نہیں کی جاتیں۔ بعض تاریخوں میں اخراجات کا تذکرہ ملتا ہے اور حضرت عثمان نے تو ایک بار آدھی فوج کو کھانا کھلا دیا تھا لہٰذا آج تک غنی کہے جاتے ہیں۔ مورخ بھول جاتا ہے خدیجۃ الکبریٰ کو جن کی تجارت عراق وشام سے اس پیمانے پر تھی کہ اصل نام کے بجائے ملیکۃ العرب کہلاتی تھیں اور جن کی کاروباری زندگی میں شامل ہو کر آنحضرت ان کی ذاتی زندگی میں شامل ہوئے تھے۔ بڑی تجارت تھی بنی امیہ کی بھی جن کے ایک فرد ہونے کی حیثیت سے حضرت عثمان اس قابل تھے کہ ایکبار سیر چشمی دکھا کر ہمیشہ کے لئے غنی بن گئے۔ کیا پورے بنی امیہ بشمول ابوسفیان ملیکۃ العرب کے سامنے قابل ذکر ٹھہرتے تھے؟ کہنے کو اب جو کچھ بھی کہہ لیا جائے لیکن سب کا اجتماعی تقابل بھی فرد واحد سے نہ ہوسکتا۔ ان کی دولت حضورؐ کے ہاتھوں میں آ کر کیا ہوگئی۔ کل کی کل اسلام پر خرچ نہیں ہوئی تو کہاں چلی گئی؟ حد ہے احسان فراموشی کی۔ کوئی ان کا نام تک نہیں لیتا بلکہ کیچڑ اچھالتا ہے فرضی کہانیوں سے، کسی کو ذی النورین بنا دیتا ہے اور ملیکۃ العرب کی اکلوتی بیٹی پر ستم کی اتنی بجلیاں توڑتا ہے کہ تاریخ کے بھی آنسو نکل آتے ہیں۔

اسلام کے محسنوں کا ماضی ٹٹولا جائے تو فلپ ہٹی کے الفاظ میں ''شروع میں پیغمبرؐ عرب کے گرد جمع ہونے والے اگرچہ گلیلی کے ملاحوں سے بہتر تھے، جنہوں نے عیسیٰ کا پیغام قبول کیا تھا لیکن ان کی یہ حیثیت تو نہ تھی کہ عمائدین قریش انہیں خاطر میں لاتے، قریش کو ڈر تھا تو ابوطالب کا، اس لئے وہ کھلم کھلا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر دست ستم دراز نہ کرتے۔ ابوطالب کی آنکھ بند ہوتے ہی وہ شیر ہو گئے اور رسول اسلام پر ظلم کے پہاڑ ڈھانے لگے''۔

ایک غیر مسلم کا یہ تبصرہ مسلمانوں کے جذبات کو مجروح ضرور کرتا ہے مگر شعب ابی طالب کے محاصرے کا دور دیکھا جائے تو اس کی تردید کرنا مشکل ہو جائے گا۔ شعب کے تین سال کے مقاطعے میں

یہ نوبت آ گئی تھی کہ بچوں کی تسکین کے لئے پتے ابال ابال کر کھلا دیئے جاتے۔ آخر ایک دن ہشام بن عمر کو ترس آ گیا۔ اس نے کہا کہ ابو طالب کے بچوں کا بلکنا اب دیکھا نہیں جاتا۔ زمعہ اور مطعم وغیرہ نے اس سے اتفاق کیا۔ ابولہب اور اس کی بیوی راضی نہیں تھے پھر بھی باہم طے پایا گیا کہ اب ان پر رحم کیا جائے۔ اور باہمی معاہدہ کعبے سے منگوا کر پھاڑ دیا جائے۔

ابو طالب دور کھڑے ہوئے ہشام کے الفاظ اور ان سب کی باہمی گفتگو سن رہے تھے۔ انہوں نے پکار کر کہا۔

''تم لوگوں نے جو باہم معاہدہ کیا تھا، اس کو دیمک چاٹ گئی۔ میرے بھتیجے کا کہنا غلط نہیں ہو سکتا!''

معاہدہ کعبے سے منگوا کر دیکھا گیا تو واقعی چھلنی ہو گیا تھا۔ کس قدر یقین تھا ابو طالب کو بھتیجے کی صداقت پر اور اس کو کافر کہا جاتا ہے، کیونکہ اس نے پیغمبرؐ کے تحفظ کی خاطر مصلحتاً اعلان اسلام نہیں کیا تھا تا کہ دو طرفہ تعلقات کے پردے میں محمدؐ کی سپر بنا رہے۔

شعب ابی طالب کے محاصرے کا تین سالہ عرصہ کتنا صبر آزما تھا بنی ہاشم پر اور اسلام کے نبی برحق پر، کوئی لمحہ خطرات سے خالی نہ تھا۔ یار غار، پسینے پر خون بہانے والے، پیغمبری کے لائق صحابی، فاتح اعظم اور غنی سب ہی مکے میں موجود تھے۔ چین سے گھروں میں بیٹھے رہے۔ کسی نے خبر بھی نہ لی ان کے پیغمبرؐ پر کیا گزری۔ بنی ہاشم کے افراد جو باہر رہ گئے تھے۔ وہ جانوں پر کھیل کر کبھی کبھی کھانے کا کچھ سامان پہنچا دیتے تھے مگر عاشقان رسولؐ میں سے کسی کے دل میں تڑپ پیدا نہیں ہوئی۔ کسی کی کوشش کرنے کا کوئی سراغ بھی نہیں ملتا۔ اب کہا جاتا ہے کہ بزم رسول تو بزم رسول تھی، خدا کی بارگاہ میں بھی انہیں تقرب حاصل تھا!

انصاف سے دیکھا جائے تو مکے کے معاشرے میں ان کا کوئی درجہ ہی نہ تھا اور نہ ایسے وسائل بلکہ وہ مجبور تھے۔ عثمان بن عفان شاید کچھ کر سکتے ہوں مگر ممکن ہے کہ وہ ابوسفیان سے ڈر گئے ہوں۔ ابو قحافہ یا خطاب صنادید مکہ کے سامنے گنے بھی نہ جا سکتے تھے۔ وہ تو خود معروف ہوئے اولاد کی بدولت اور اولاد ریگزار عرب کے مایہ ناز سپوت کے قدم چوم کر پہچانی گئی۔

اسلام پر احسانات کے لئے اگر چہ پہلا نام حضرت ابوبکر کا ہے مگر تاریخ میں حضرت عمر کا نام زیادہ روشن ہے۔ شرع میں آپ کی اصلاحات ہمیشہ یادگار رہیں گی ماہ صیام کی برکتوں میں تراویح کا اضافہ کبھی فراموش نہ ہو سکے گا۔ آپ نے خود اس کو ایک اچھی بدعت قرار دیا تھا۔ متعہ کو اس لئے حرام کیا

تھا کہ متعہ کے نام پر لوگ حرام کاری کرتے تھے، حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حرام سے بچنے ہی کی خاطر اس کو حلال کیا تھا۔ تقیہ کو اس لئے ممنوع قرار دیا گیا کہ بنت رسول کے طرفدار اس طریقے سے بھی اپنے کو محفوظ نہ رکھ سکیں۔ دین میں یہ تراش خراش اصلاح معاشرہ کے نام پر کی گئی تھی جبکہ یہ سب کچھ احکام رسول کے خلاف تھیں جن کے لئے بخاری و مسلم کی احادیث کا حوالہ کافی ہوگا۔

توسیع مملکت اسلامیہ حضرت عمر کا وہ کارنامہ ہے جس سے ان کا شمار فاتحین عالم میں کیا جاتا ہے لیکن مشکل یہ آپڑی ہے کہ وہ بساط پیغمبری پر سجادہ نشین خلافت تھے لہٰذا نظریہ جہانبانی قیود انسانیت کا پابند ہوکر رہ جاتا ہے۔ جہاں ان کی افواج ان حدود کو توڑ دیتی ہیں جو جہاد فی سبیل اللہ کے دائرے سے باہر ہیں وہاں یورپ کے مورخین ان کے جرنیلوں کو نپولین اور ہنی بال سے تشبیہ دینے لگتے ہیں اور پھر ابو عبیدہ الجراح، عمرو عاص اور سعد بن ابی وقاص کے طوفانی حملے چنگیز خان اور تیمور کی یلغاروں سے مختلف نہیں رہتے۔

فتوحات کے اس سلسلہ کی نوعیت بھی جابجا ان اصلاحات سے ملتی جلتی ہے جو انہوں نے دین میں کی ہیں۔ پھر بھی ان کی تسخیر ممالک نے دائرہ اسلام کو وسعت دی اور مستقبل کے خلیفہ شام کو ایک موقع فراہم کیا کہ ان کے ادھورے کام کو پورا کر دیں۔

اور حقیقت یہ ہے کہ اگر آنحضرت کی تعلیمات میں تراش و خراش کی کھلی آزادی مل جاتی تو پیغمبر عرب کے جانشین ساری دنیا کو زیر نگین کر لیتے اور ایشیا کے ساتھ پورے یورپ کی سرزمین کو اپنے گھوڑوں کی ٹاپوں سے روند ڈالتے۔ اسلام وہ ہوتا یا نہ ہوتا جس کو لے کر آنحضرتؐ دنیا میں آئے تھے مگر اس کا نفاذ دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہو جاتا۔ نپولین نے الپس کی برف پوش پہاڑیوں کو کڑکڑاتی سردی میں عبور کیا تھا، صحرائی عرب اسکینڈی نیویا اور الاسکا سے ہوکر قطب شمالی تک پہنچ جاتے اور ممکن تھا کہ امریکہ کی دریافت صدیوں پہلے ہو جاتی لیکن نوع بشر کو وہ فائدہ نہ ہو سکتا جو آنحضرت نے مدینے کے دس سالہ قیام میں پہنچایا۔ عرب جو پیغام لے کر جاتے، نام تو اس کا اسلام ہی ہوتا مگر حقیقتاً اسرائیلیت، نصرانیت اور دہریت کا ایک آمیزہ جس میں دیوی دیوتاؤں کے ساتھ نادیدہ خدا کے مجسمے بھی شامل ہوتے۔

ان مفروضات کی بنیاد ان واقعات پر ہے جو وفات ختم المرسلین کے بعد رونما ہوئے اور جن کے نتیجے میں وہ خلافت وجود میں آئی جو مسلمانوں کے باہمی نزاع کا موجب ہوئی اور جس نے پہلے تو اولاد و اصحاب رسول کا خون ارزاں کیا پھر محبان علی کو صفحہ ہستی سے مٹا دینے کا سلسلہ شروع کیا جو آج تک

جاری ہے۔

علیؑ سن وسال کے اعتبار سے اصحاب کی اولاد کے برابر تھے اور حضورؐ نے انہیں بیٹے کی طرح پالا تھا لہٰذا صحابہ کو انہیں بیٹا ہی سمجھنا چاہئے تھا اور فاطمہ زہرا کے شوہر کی حیثیت سے یہ رشتہ اور بھی مضبوط ہو جاتا تھا اور ممکن ہے کہ بعض صحابی سمجھتے بھی ایسا ہی ہوں۔ خود آنحضرتؐ تو ہر لحاظ سے انہیں یہی درجہ عطا فرماتے تھے۔ دلیل کے طور پر اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ مکے سے ہجرت کے وقت علیؑ کو اپنی جگہ پر اس لئے چھوڑا تھا کہ اہالیان مکہ میں بیٹے کی طرح باپ کی ذمہ داریاں پوری کریں۔ علیؑ کو بھی اپنے فرائض کا پورا احساس تھا۔ ایک طرف آپ کو ابوطالب کے بیٹے کا حق ادا کرنا تھا اور اس حیثیت سے اسلام و پیغمبرؐ اسلام کی حفاظت ان کا منصب تھا، دوسری طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پرورش کے تقاضے پورے کرنا تھے اور جناب فاطمہ جب آپ کی زندگی میں داخل ہو گئیں تو ان کا ہر فرض علیؑ کا فریضہ بن گیا۔

اس طرح حضور کا سہ طرفہ سایہ بن کر رہنا علیؑ کا فرض تھا۔ چوتھی سمت منصوص من اللہ مستقبل کی جانشینی تھی جس کا نام امامت تھا اور جسے صرف خدا اور خدا کا رسولؐ جانتا تھا یا علیؑ کو معلوم تھا۔۔۔

حالات کا سطحی جائزہ لیا جائے تو اس میں شک نہیں رہتا کہ ابتداء جن لوگوں نے اسلام کا خیر مقدم کیا تھا، وہ حضور کی سیرت و کردار سے متاثر تھے اس لئے آپؐ نے جو کچھ کہا، اس کو سب نے توجہ سے سنا اور آپ کے پیغام کو دل و دماغ میں جگہ دی۔ حضرت علیؑ کی عمر اس وقت نو سال بتائی جاتی ہے مگر حقیقتاً آپ گیارہ سال کے تھے پھر بھی دوسروں کے مقابلے میں بہت چھوٹے تھے اور اصحاب نبی سن و سال کے تناسب سے دوڈھائی گنے تھے لہٰذا وہ آپ کو کمتر سمجھتے لیکن عملی زندگی میں جب آنحضرتؐ آپ کو افضل قرار دینے لگے تو دلوں میں پہلے ایک رشک پیدا ہوا پھر یہ رشک حسد میں بدل گیا۔

مکے کی زندگی میں صرف دعوت ذی العشیرہ میں کوئی جلن پیدا ہو سکتی تھی مگر اس وقت نہ رسولؐ کو اتنی اہمیت تھی اور نہ رسولؐ کے دین کو پھر تازہ واردان بساط اسلام میں شاید کوئی خاص جذبہ بھی پیدا نہیں ہوا تھا جس کا ثبوت محاصرہ شعب ابی طالب میں ان کی خاموشی سے ملتا ہے، پھر وہ دعوت بھی اہل خاندان سے مختص تھی لیکن اہم اتنی تھی کہ رسولؐ نے اسلام کے ساتھ ساتھ اسلام کے مستقبل کا فیصلہ بھی سنا دیا تھا۔

"یہ علی میرا بھائی میرا وصی اور میرا خلیفہ ہے۔ اس کی سنو اور اطاعت قبول کرو!"۔

لوگ کہتے ہیں کہ علی بہت چھوٹے تھے۔ مانا کہ علی چھوٹے تھے مگر نبیؐ تو چھوٹے نہیں تھے لہٰذا

بات کا وزن کچھ کم نہیں ہوتا۔ نبیؐ نے اسلام کے تعارف کے ساتھ یہ بھی اعلان کر دیا تھا کہ جو اسلام کو مانے، اس کو یہ بھی ماننا ہے کہ میرے بعد اسلام علیؑ کا ہے اور قیامت تک علی میرے جانشین ہوں گے۔ اس واقعہ کو ہر مورخ نے لکھا ہے اس لئے جو مسلمان ہے، وہ علی سے سرتابی نہیں کر سکتا۔ یہ اور بات ہے کہ جو لوگ اس دعوت سے قبل اسلام لا چکے تھے، وہ کہہ دیں کہ انہوں نے اسلام لاتے وقت اس شرط کو تسلیم نہیں کیا تھا تو پھر رسولؐ اس کے بعد جو کچھ کہتے رہے، اس سے پہلے داخل اسلام ہونے والوں پر اس کا اطلاق بھی نہ ہوگا۔

بات بالکل صاف ہے چند الفاظ میں پیغمبرؐ برحق نے خدا، اسلام اور اسلام کا حال و مستقبل سب کچھ سمو دیا تھا۔ حال وہ خود تھے اور مستقبل علیؑ تھے۔ علیؑ کو وصی اور خلیفہ نہ ماننے والے خود ہی بتا دیں کہ حضورؐ کو اگر یہ کہنا تھا کہ خدا کو ایک مانو، اسلام کو اپنا دین مانو، مجھے رسول اسلام مانو اور علیؑ کو میرا خلیفہ اور میرے بعد ہمیشہ کے لئے اسلام کا رہنما تو اس کے لئے مختصر ترین الفاظ میں آپ کیا کہتے؟ محمدؐ بن عبداللہ سے بہتر عربی جاننے والے، اگر ان سے بہتر الفاظ میں کہہ سکتے ہوں تو کہہ کر دکھا دیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کے بعد کبھی کچھ کہنے کی ضرورت نہ تھی لیکن آپ وقتاً فوقتاً یاد دہانی کراتے رہے۔ شاید آپ کو کچھ لوگوں پر اعتبار نہیں تھا اس لئے اتمام حجت کو ضروری سمجھا تھا۔

اسی موقع پر ابو طالب کا ایمان بھی واضح ہو جاتا ہے۔ مورخین نے متفق اللفظ ہو لکھا ہے کہ:-

لوگ تمسخر کرتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور ابو طالب سے کہنے لگے:-

"تمہیں حکم ہوا ہے کہ بیٹے کی بات سنو اور اطاعت کرو!"

ابو طالب نے تو اطاعت کرنے سے انکار نہیں کیا پھر کوئی کیوں کہتا ہے کہ وہ ایمان نہیں لائے؟ ایمان بالعمل کی تعریف اور کیا ہے؟ سر تسلیم خم کرنے کا نام کیا اسلام نہیں ہے؟

بدر واحد

مکے میں اسلام کی تیرہ سالہ زندگی اساسی طور پر اگرچہ بہت صبر آزما رہی مگر اس کو ہر لحاظ سے بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس میں اسلام کا چھوٹا سا کارواں تشکیل پا چکا تھا جس نے مدینے پہنچ کر آزاد اور کھلی ہوئی فضا میں اطمینان کی سانس لی اور یہیں سے اشاعت اسلام کی راہیں کشادہ ہوئیں۔

جنگ بدر کو کفر و ایمان کا پہلا مقابلہ کہا جاتا ہے لیکن وہ طاقت و ناطاقتی کی لڑائی تھی جس میں

صداقت کے بل پر فتح ناطاقتی کی ہوئی اور اسی کو مملکت اسلامیہ کا سنگ بنیاد قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس جنگ میں ستر افراد قریش کے قتل ہوئے تھے جن میں سے اکثریت بنی امیہ کی تھی۔ ولید بن عتبہ، حنظلہ بن ابی سفیان، طعیمہ بن عدی، عاص بن سعید اور نوفل بن خویلد سمیت چھتیس آدمی علی کے ہاتھوں مارے گئے تھے جن کے نام یہ ہیں۔ زمعہ بن اسود، عقیل بن اسود، حارث بن زمعہ، نضر بن حارث، عمیر بن عثمان، عثمان و مالک، مسعود بن ابوامیہ، قیس بن فاکہ، حذیفہ بن ابوحذیفہ، ابوقیس بن ولید، حنظلہ بن ابوسفیان، عمرو بن مخزوم، ابومنذر بن ابورفاعہ، منبہ بن حجاج سہمی، عاص بن منبہ، علقمہ بن کندہ ابوالعاص بن قیس، معویہ بن مغیرہ، لوذان بن ربیعہ، عبداللہ بن منذر، حاجب بن سائب، اوس بن مغیرہ زید بن ملیص، عاصم بن ابوعوف، سعید بن وہب، بنی عامر، معویہ بن عبدالقیس، عبداللہ بن جمیل، سائب بن مالک، ابوالحکم بن اغنس، ہشام بن ابوامیہ۔

سریاۃ کو چھوڑ کر دوسری جنگ احد کی تھی جس میں خالد بن ولید، علیؑ سے اپنے باپ کے قتل کا بدلہ لینے آئے تھے اور ابوسفیان اسلام دشمنی میں و نیز علیؑ سے اپنے بیٹے اور عزیزوں کے قتل کا انتقام لینے کی خاطر شریک جنگ ہوئے تھے۔ جنگ میں فتح مسلمانوں کی ہو رہی تھی مگر وہ لوٹ مار میں لگ گئے خالد بن ولید کمین گاہ سے ٹوٹ پڑے اور ایک آواز بلند ہوئی "رسول اللہ قتل ہو گئے۔۔۔!

کہا جاتا ہے کہ یہ آواز شیطان یا خالد بن ولید کی تھی، شیطان کی آواز سمجھ میں نہیں آتی کیونکہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حضرت عمر کے لئے ارشاد ہے کہ عمر جس راستے سے گزرتے ہیں، شیطان اس راستے کو کترا کر نکل جاتا ہے اور حضرت عمر وہاں موجود تھے اور وہ خود یہ آواز لگاتے، یہ ممکن نہیں تھا لہٰذا ماننا پڑے گا کہ خالد بن ولید کی چال تھی۔ نتیجہ جو نکلنا تھا، وہی نکلا کہ بھگدڑ شروع ہو گئی۔

"حضرت عمرؓ نے دل شکستہ ہو کر تلوار پھینک دی کہ اب لڑنے سے کیا فائدہ۔۔۔!"

"حضرت ابوبکر اور ابوعبیدہ الجراح ایک ساتھ بھاگے مگر پہاڑی کے اوپر رکے رہے"۔

بھاگنے والوں میں حضرت عثمان بھی تھے۔ وہ تین روز بعد تک پلٹ کر نہ آئے۔ واپس آنے والوں میں سب سے پہلے حضرت ابوبکر آئے تھے پھر دوسرے لوگ جن میں حضرت عمر بھی تھے مگر کہا جاتا ہے کہ ان سب کو خدا نے معاف کر دیا۔

اس جنگ میں طلحہ بن ابی طلحہ علمدار لشکر کفار تھا جس کی بہادری کا شہرہ تھا، مصعب ابن ابی طلحہ، صواب دیو قامت اور عبدالدار کے تمام علمدار علیؑ کے ہاتھوں قتل ہوئے پھر مسلمانوں کا فرار شروع ہو گیا اور اس کے بعد علی کا کام صرف حضور کی طرف بڑھنے والوں کو تلوار کے گھاٹ اتارنا تھا۔ کافروں کے کل

بارہ آدمی قتل ہوئے جن کو شاید علیؑ کے علاوہ کسی نے نہیں مارا تھا۔ مسلم شہداء کی تعداد ستر تھی جن کے قتل کی ذمہ داری بھاگنے والوں پر عائد ہوتی ہے۔ انس بن نصر بھی گھبراہٹ میں دوسروں کو دیکھ کر بھاگے تھے لیکن وہ پلٹ پڑے اور لڑتے ہوئے جنت کو سدھار گئے۔ انہوں نے بلند آواز سے کہا تھا کہ جب رسول اللہ ہی نہیں رہے تو زندہ رہ کر کیا کریں گے!

ایسے لوگوں کو اگر عاشق رسول کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ ان کے الفاظ کو بہت سے لوگوں نے سنا تھا مگر پلٹا کوئی نہیں۔ شاید وہ صرف رسولؐ کی کامیابی کے ساتھی تھے۔ فتح ہوجاتی تو بڑے بلند بانگ دعوے کرتے مگر اب مکے کے پرانے ساتھیوں سے دشمنی کیوں مول لیتے یا ہوسکتا ہے کہ ان کے ایمان کی زندگی، صرف رسولؐ کی زندگی تک ہو!

ایک روایت کے مطابق ذوالفقار اسی جنگ میں اتری تھی جس پر لکھا تھا۔

" لافتی الا علی لا سیف الا ذوالفقار ! "

اس جنگ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ستر زخم آئے تھے اور علیؑ کو نوے زخم پھر بھی وہ لڑتے رہے جب تک کہ بھاگے ہوئے مسلمان پلٹ کر نہیں آگئے اور وہ آنحضرتؐ کو کفار کے نرغے سے نکال نہیں لے گئے۔

چوتھے سال میں کئی سریات ہوئے جنہیں حضورؐ نے مختلف لوگوں کو بھیج کر دفع کرایا۔ ہجرت کے پانچویں سال میں جنگ خندق واقع ہوئی اس میں ابوسفیان نے نئے ہتھکنڈے استعمال کئے اور اپنے جاسوسوں کے ذریعے پہلے ہی سے مسلمانوں میں دہشت پھیلانا شروع کردی پھر عرب کے شہرہ آفاق پہلوان عمرو ابن عبدود کو لے کر یہودیوں اور کفار کے بڑے لشکر کے ساتھ مسلمانوں پر چڑھ دوڑا۔

جنگ خندق

مسلمانوں نے اپنے لشکر گاہ کے گرد حفاظت کے لئے سلمان فارسی کے مشورے سے خندق کھودلی تھی۔ چھوٹی چھوٹی لڑائیوں کے بعد ایک دن عمرو ابن عبدود گھوڑے کو خندق پھندا کر حضور کے خیمے کے عقب میں پہنچ گیا اور مبارز طلب ہوا۔ آنحضرت نے اصحاب کی سمت دیکھا مگر کسی طرف سے کوئی جواب نہ ملا۔ صرف ایک جوان اٹھ کھڑا ہوا جس کو آپ نے دعوت ذی العشیرہ میں اپنا وصی وخلیفہ بنایا تھا۔ حضورؐ نے ہاتھ کے اشارے سے اس کو بٹھادیا۔ دوسری بار پھر عمرو کی گرج سنائی دی۔ آپ نے پھر ایک سرے سے دوسرے تک نگاہ دوڑائی، اکثریت کے سر جھکے ہوئے تھے۔ شاید انہوں نے سانسیں

بھی روک لی تھیں۔ اس گہرے سکوت کو حضرت عمرؓ کی دھیمی آواز نے توڑا:۔

''ہزار پہلوانوں پر اکیلا بھاری ہے کون جائے اس کے مقابلے پر''

بدحواس مسلمانوں میں اور سراسیمگی پیدا ہوگئی۔ حضرت عمر کہہ رہے تھے۔ ''قزاقوں کے مقابلے میں اس نے اونٹنی کا بچہ سپر کے طور پر ہاتھ میں اٹھالیا تھا اور تن تنہا قزاقوں کو مار بھگایا تھا!''

پہلا نوجوان پھر اٹھا۔ حضورؐ نے پھر اس کو ہاتھ کے اشارے سے بٹھادیا۔ اب کی عمرو نے تمسخر کے انداز میں للکارا۔۔۔:۔

''شاید تم میں کوئی مرد نہیں ہے۔ تم نہیں آتے تو میں خود آتا ہوں''۔۔۔

بعض مورخین نے لکھا ہے کہ رسولؐ کے خیمے میں ایسا سناٹا تھا جیسے لوگوں کے سروں پر طائر بیٹھے ہوں اور وہ گردن ہلائیں تو طائر اڑ جائیں۔ پیغمبرؐ اسلام نے اس بار نام لے لے کر لوگوں کو مخاطب کیا مگر جواب میں قبرستان کی سی خاموشی کے سوا کچھ سنائی نہیں دیا۔ اب کے علیؑ اٹھے تو آپ نے بٹھایا نہیں۔ اپنے ہاتھ سے انہیں آراستہ کیا تبرکات زیب تن کئے ہاتھ اٹھا کے فتح مندی کی دعا دی اور فرمایا۔

''آج کُل ایمان کُل کفر کے مقابلے پر جارہا ہے''۔

علی، ابن عبدود کے مقابلے پر آئے تو اس نے سر سے پاؤں تک آپ کو دیکھا اور حقیر جثّے پر زیرِ لب مسکرا کر بولا ''تمہارے منہ سے تو اب تک دودھ کی بو آتی ہے''۔ پھر کہا ''جانتے ہو میرا نام کیا ہے۔۔۔عمرو ابن عبدود!''

اسّی سال کے دیو قامت کے مقابل شیر کا چھوٹا سا بچہ بہت حقیر معلوم ہوتا تھا مگر اس نے نسلی لب و لہجے میں جواب دیا۔

''میرا نام علی ابن ابی طالب ہے۔۔۔ میری ماں مجھے حیدر کہتی ہے''۔

''ابن ابی طالب۔۔۔'' عمرو نے آہستہ سے دوہرایا اور بولا ''ابوطالب میرے دوست تھے، جاؤ پلٹ جاؤ''۔

علی نے اس کا کوئی اثر نہ لیا اور بڑے اطمینان سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''سنا ہے تو مخالف کی تین شرطوں میں سے ایک ضرور مان لیتا ہے؟'' عمرو نے اثبات میں سر ہلایا تو آپ نے فرمایا ''اسلام قبول کرلے'' اس نے انکار کیا تو آپ بولے ''مقابلہ نہ کر واپس ہوجا'' اس نے اس کو بھی قبول نہ کیا تو آپ نے کہا ''تو گھوڑے پر سوار ہے، میں پاپیادہ ہوں تو بھی گھوڑے سے اتر آ''۔

عمرو فوراً گھوڑے سے نیچے آ گیا۔۔۔ رسولؐ نے کل ایمان کو کفر کے مقابل بھیجا تھا۔ عمرو گھوڑے پر سوار تھا اور گھوڑے کے ساتھ شامل تھا لہٰذا علیؑ نے اس کو بذاتہ کل کفر بنا دیا۔۔۔ تلواریں بے نیام ہوئیں عمرو کی ضرب علیؑ کے سر پر پڑی اور سپر کو کاٹ کر سر میں در آئی۔ علیؑ نے وار کیا تو عمرو زمین پر گر گیا۔ علیؑ اس کے سینے پر سوار ہوئے تو اس نے علیؑ کے منہ پر تھوک دیا۔ آپ غصے سے بے قابو ہو گئے اور اس کو چھوڑ کر ہٹ گئے۔ مولانائے روم نے اس کو نظم کیا ہے۔

او خیو انداخت بر روئے علیؑ
افتخار ہر نبی و ہر ولی

ہٹ جانے کا سبب دنیا کیا جانے۔ کسی نے اس کو جو معنی بھی پہنائے ہوں مگر علیؑ اس لئے ہٹ گئے تھے کہ ایسے میں وہ اس کا سر اتارتے تو اس میں ان کا غیظ و غضب بھی شامل ہو جاتا اور علیؑ اس کو صرف اللہ کے لئے قتل کرنا چاہتے تھے لہٰذا دوبارہ اس کو پچھاڑا اور سر تن سے جدا کر دیا۔

حضور نے فرمایا۔ ''خندق کے دن علیؑ کی ایک ضرب کونین کی عبادت سے بہتر ہے۔۔۔''

محدث دہلوی نے اس کو قدرے ترمیم سے لکھا ہے۔ ''یوم خندق میں علیؑ کی مبارزت قیامت تک امت کے اعمال سے افضل ہے''۔

عمرو کی بہن جب اس کی لاش پر پہنچی تو خود و زرہ کو اس کے جسم پر موجود پا کر اس نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے اور بڑی طمانیت سے بولی۔

''اس قاتل کے علاوہ تجھے کوئی اور قتل کرتا تو میں عمر بھر تجھ پر روتی لیکن تیرا قاتل تو وہ ہے جس کے نسب میں کوئی عیب نہیں اور جس کو ہمیشہ سے سید القریٰ مانا گیا ہے''! اس رات شدید طوفان آیا اور ابوسفیان بہانہ کر کے اپنے لشکر کو ہٹا لے گیا۔ خالد بن ولید، شجاعان قریش، یزید و معاویہ وغیرہ سب اس کے ساتھ واپس ہو گئے۔

جبریل نے اس خوشی کے موقع پر ایک رومال لا کر حضورؐ کو پیش کیا جس پر علیؑ ولی اللہ لکھا تھا۔

صلح حدیبیہ

۶ھ کا اہم ترین واقعہ صلح حدیبیہ کہلاتا ہے۔ حضورؐ حج بیت اللہ کے ارادے سے چلے تھے لیکن قریش کی شدید مزاحمت کا خطرہ محسوس کر کے چاہ حدیبیہ کے قریب ٹھہر گئے۔ اس مقام پر آپ نے بعض اندیشوں کے تحت صحابہ سے بیعت لی یہ تجدید بیعت ''بیعت رضوان'' کہلاتی ہے شاید آپ کو بعض صحابہ

کی وفاداری پر شک ہو گیا تھا۔ قریش کے ایلچی عروہ نے آپ کو بھڑکا دیا تھا کہ بعض لوگ جنگ کے دوران فرار ہو جائیں گے۔ اس پر عروہ اور حضرت ابوبکر کے درمیان گالی گلوچ کی نوبت آ گئی تھی۔

آنحضرت نے قریش سے گفتگو کرنے کے لئے حضرت عمر کو تجویز کیا مگر انہوں نے مصلحتاً عذر کیا اور حضرت عثمان بھیجے گئے مگر بعض تلخ واقعات پیش آئے۔ قریش کی طرف سے سہیل بن عمرو نے آ کر بات چیت کی اور قریش کی شرائط پر صلح ہو گئی۔ قریش نے صلح نامے میں لکھے ہوئے محمد الرسول اللہ پر اعتراض کیا کہ وہ رسول ہی مان لیتے تو جھگڑا کاہے کا تھا حضرتؐ نے رسول اللہ کاٹ کر ابن عبداللہ لکھ دیا۔ دس سال کے لئے صلح ہوئی اور حضور بغیر حج کئے واپس ہو گئے۔

اصحاب کو اس صلح پر بہت اعتراض تھا مگر کسی نے کچھ کہا نہیں۔ حضرت عمر نے کہہ دیا۔

''محمد کی نبوت پر جیسا شک مجھے آج ہے، اتنا شک اس سے پہلے نہیں ہوا تھا''۔۔۔

قرآن نے اس کو حضور کی فتح قرار دیا ہے۔

جنگ خیبر

۷ھ میں خیبر کی عظیم ترین جنگ واقع ہوئی۔ تفصیلات عام تاریخوں میں ملتی ہیں۔ خاص واقعات میں پہلے دن حضرت عمر کو لشکر کا علم دے کر بھیجا گیا۔ دوسرے روز حضرت ابوبکر کو علمدار بنایا گیا۔ تیسرے دن پھر حضرت عمر کو شرف بخشا گیا مگر ہر مرتبہ مسلمان ناکام واپس آئے بلکہ تیسرے دن لشکری اپنے قائد کو پسپائی کا ذمہ دار قرار دیتے تھے اور قائد اہل لشکر کو، اس پر مخبر صادق فرمایا۔

''کل میں علم اس کو دوں گا جو اللہ و رسول کو دوست رکھتا ہے اور اللہ و رسول اس کو دوست رکھتے ہیں، ایک مرد کرار و غیر فرار کو''۔

علیؑ کی طرف کسی کا خیال بھی نہیں گیا کیونکہ وہ مدینے میں آشوب چشم میں مبتلا تھے لہٰذا تمام صحابہ رات بھر ہمہ تن امیدوار بنے رہے۔ صبح کو ہر ایک حضورؐ کے سامنے جانے کی کوشش کرتا رہا۔ حضور نے ادھر ادھر دیکھ کر دریافت کیا۔

''کہاں ہیں علی۔۔۔؟''

کوئی جواب میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ علیؑ سامنے سے نمودار ہوئے۔۔۔ بعض کو تحیر اور دکھ ہوا اور بعض کو از حد خوشی!

کہا جاتا ہے کہ حضورؐ نے نادِ علیاً مظہر العجائب کو پہلی مرتبہ تلاوت کیا تھا اور علیؑ چشم زدن میں

آ پہنچے تھے۔ مسلم بن الکوع نے بڑھ کر علیؑ کی دستگیری کی اور حضورؐ کے قریب لا کھڑا کر دیا۔ آپ نے علیؑ کی آنکھ میں اپنا لعاب دہن لگایا۔ آنکھوں کی تکلیف اسی وقت جاتی رہی پھر حضورؐ نے انہیں اپنی زرہ پہنائی، ذوالفقار کمر میں باندھی اور علیؑ کو میدان کی طرف بڑھنے کا اشارہ کیا علی نے پوچھا۔

"کہاں تک قتال کروں یارسول اللہ۔۔۔؟"

آپ نے جواب دیا "جب تک لا الہ الا اللہ، محمد الرسول اللہ کی گواہی نہ دیں"۔ پھر آپ نے فتح ونصرت کی دعائیں دے کر علیؑ کو رخصت کر دیا۔ علیؑ نے میدان پہنچ کر اپنا علم نصب کیا۔ مرحب کا بھائی حارث کسی فیل مست کی طرح جھومتا ہوا نکلا اور آتے ہی اس نے دو مجاہدوں کو شہید کر ڈالا۔ علیؑ نے کسی شیر کی طرح بڑھ کر اس کو دبوچ لیا اور پلک جھپکتے میں اس کی لاش خون میں لت پت زمین پر پڑی تھی۔ مرحب بھائی کی لاش دیکھ کر دیوانہ ہو گیا اور چنگھاڑتا ہوا علیؑ پر حملہ آور ہوا۔

"سارا عرب جانتا ہے کہ میں مرحب ہوں۔۔۔!"

"میں حیدر ہوں۔۔۔ شیر نیستان بنی ہاشم!" علیؑ نے رجز پڑھا اور حارث کے خون میں ڈوبی ہوئی ذوالفقار سے مرحب پر ضرب لگائی۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ ایک برق کوند کر مرحب پر گری، ڈھال کو توڑ کر سر میں در آئی، گردن میں اتری اور جسد مرحب کو دو لخت کرتی ہوئی زمین سے جا لگی۔ عقیدے کی آنکھ کو ایک منظر بھی نظر آیا کہ جبریل نے اپنے پروں پر ذوالفقار کو روک لیا ورنہ گاؤ زمین کو دو ٹکڑے کرتی ہوئی گزر جاتی!

پھر عنتر، ربیع و یاسر کے سے سات نامی گرامی پہلوان آکر مقابل ہوئے۔ ان کا انجام بھی ویسا ہی کچھ ہوا۔ علیؑ لڑتے لڑتے قلعہ قموص کے پھاٹک تک پہنچ چکے تھے۔ آپ نے اس کے مضبوط طلا پوش آہنی دروازے میں اپنی انگلیاں پیوست کر دیں اور نعرہ تکبیر بلند کر کے ایک جھٹکا دیا تو وہ آپ کے ہاتھ میں تھا۔ علیؑ نے اس کو بلند کر کے اٹھایا اور لا کر قلعہ کی خندق پر رکھ دیا جس نے لشکر کے لئے پل کا کام کیا اور سرفروشان اسلام اس پر سے گزر کر قلعے میں داخل ہو گئے۔

قلعہ قموص کے اندر اور باہر نعرہ ہائے تکبیر بلند ہو رہے تھے اور فضائے آسمانی میں ایک آواز گونج رہی تھی۔

" لا فتی الا علی لا سیف الا ذوالفقار "!

~~یہ ہے معجزہ قوت ایمانی اور تائید ربانی کا، دنیا جس کی مختلف تاویلیں کرتی ہے اور امتیازی~~ شرف کم کرنے کے لئے کہہ دیتی ہے کہ باب خیبر بقوت رحمانیہ اکھاڑا تھا۔ سوال یہ ہے کہ کیا علی کی کوئی

قوت عطائے یزدانی کے سوا کسی اور کی دی ہوئی تھی؟ اور یہ اعجاز بھی تو مرحمت پروردگار ہے کہ جب علیؑ کو پکارو چشم زدن میں جواب آتا ہے۔ یہ خدائے بخشندہ کے سوا کس کی دین ہے۔

رجعت شمس

مدینے واپسی کے دوران صہبا کے قیام میں وقت عصر حضورؐ زانوئے علی پر سر رکھے استراحت میں تھے کہ نزول وحی ہونا شروع ہوا۔ علیؑ ساکت و صامت بیٹھے رہے۔ حضورؐ بیدار ہوئے تو دریافت فرمایا۔ ''نماز عصر پڑھ لی تم نے؟''

''بیدار کیسے کرتا آپ کو'' علی نے جواب دیا۔ آنحضرت نے افق مغرب میں ڈوبتے ہوئے سورج کی سرخی دیکھ کر فرمایا۔

''پلٹالو سورج کو''

علی نے انگلی سے اشارہ کیا۔ سورج سر اٹھا کر افق پر ٹھہرا۔ علی و رسولؐ نے نماز ادا کی اور سورج پھر ڈوب گیا۔

بعض لوگ رجعت شمس کو تسلیم کرنے پر جب مجبور ہو جاتے ہیں تو وہ اس کو شق القمر کی طرح حضور کا معجزہ قرار دینے لگتے ہیں اور ہم تو خود علیؑ کے وجود ہی کو حضورؐ کا معجزہ کہتے ہیں اور علیؑ کے ہر کارنامے کو نبیؐ سے منسوب کرتے ہیں تو اس سے انکار کیوں کریں۔

پھر مستقبل میں وحی کے سلسلے میں علیؑ کا امتیاز ختم کرنے کے لئے بنی امیہ کا حدیث ساز ایک حدیث بیان کرتا ہے کہ آپ دوسری ازواج سے کہتے ہیں۔

''عائشہ کے سلسلے میں مجھے تکلیف نہ پہنچایا کرو۔ اس کے لحاف میں تو مجھ پر وحی آتی ہے۔ کسی اور کے لحاف میں نہیں''۔

لحاف و زفاف کا بیان کھلے لفظوں میں امہات المومنین کے لئے خلاف تہذیب معلوم ہوتا ہے۔ شاید دوسرے الفاظ بیان کرنے والے کو نہیں ملے۔

آنکه در آفاق گردد بوتراب
باز گرداند زمغرب آفتاب

اقبالؔ

تاریخی تبصرے میں شعری خراج عقیدت برمحل نہیں ہوتا لیکن شعر کی نکتہ آفرینی میں بلوغت

انسانی کا حرف آخر اپنے کمال پر پہنچتا ہے۔ اس لئے صحیح بخاری کی ایک حدیث پیش کی جاتی ہے:-

''آنحضرت ایک دن علیؑ کو ڈھونڈتے ہوئے مسجد میں پہنچے تو علیؑ کو صحن میں سوتے ہوئے پایا آپ نے شانہ ہلا کر کہا اٹھو یا اباتراب''۔

مفسّر اس واقعہ سے صرف یہ ثابت کر کے رہ گیا کہ صحن مسجد میں سونا جائز ہے۔ ابوتراب کے لقب سے علیؑ کی فضیلت اس کی سمجھ میں نہ آسکی۔ مٹی کا باپ ہونا علیؑ کے لئے یقیناً موجب شرف تھا مگر ایک لفظ سے نظم کائنات پر قدرت عام فہم سے بالا تھی اور خود شاعر نے آفتاب کے ساتھ بوتراب کی قافیہ پیمائی کی تھی تو بوتراب کے توصیفی پہلو سے گردش ارضی اس کی سمجھ میں آئی تھی یا نہیں اس کو وہی جانتا ہوگا مگر نظام شمسی میں لیل ونہار کے وقوع کو خود زمین کے اپنے محور پر گھومنے سے ثابت کیا جائے تو شعر کا ہر لفظ سیاروں کی طرح چمکنے لگتا ہے۔

علیؑ مٹی کے باپ تھے۔ زمین آپ کی تابع تھی لہٰذا آپ کے اشاروں پر اس کا چلنا مسلم تھا۔ حضور نے فرمایا کہ سورج کو پلٹا کر نماز پڑھ لو۔ اگر آپ کہتے کہ زمین کی گردش کو روک کر قدرے دہنی طرف پلٹا لو تو سورج کی گردش پر یقین رکھنے والے کفار قریش کی طرح آپ کو فاترالعقل قرار دیتے لہٰذا آپ نے سننے والوں کی سطح فہم کے پیش نظر کہنے کا وہ انداز اختیار کیا جو سب کی سمجھ میں آ گیا۔ اب ابوتراب کا کام تھا کہ تابع فرمان زمین کو حکم دیں۔

حضورؐ جب معراج میں عرش پر گئے تھے تو گھر سے نکلتے وقت دروازہ کھولا تھا اور زنجیر در ہلنا شروع ہوئی تھی۔ واپس آئے تو زنجیر اسی طرح ہل رہی تھی البتہ ہلنے کی رفتار کچھ کم ہوگئی تھی۔ لمحات کے وقفے کی بنا پر بعض لوگ معراج جسمانی کے قائل نہیں ہیں، حالانکہ چشم عقیدت سے دیکھا جائے تو فضائے بسیط کی طنابیں کھینچ جانا ناقابل فہم تو نہیں ٹھہرتا۔

اسی انداز پر رجعت شمس کو سمجھا جائے تو بات سامنے کی ہے۔ ابوتراب نے داہنے ہاتھ کی ہتھیلی کو زمین پر رکھا، چلتی ہوئی زمین اچانک رکی۔ آپ نے کلمہ کی انگلی کو داہنی طرف سے بائیں طرف کو اشارہ کیا تو بائیں جانب سے داہنی جانب گردش کرنے والی زمین نے ہلکی سے گردش معکوس کی اور سورج سر اٹھا کر علی کی طرف دیکھنے لگا۔ آپ نے نماز ختم کی تو زمین کی رفتار معمول پر آ گئی۔

کہا جا سکتا ہے کہ نظم کائنات میں کوئی تغیر کیوں نہیں ہوا؟ تغیر ہوا لیکن ایسا نہیں کہ اس کو شدت سے محسوس کیا جا سکتا۔ جیسے زمین کی اپنے محور پر گردش کا احساس اہل زمین کو نہیں ہوتا پھر بھی زمین کی ہلکی سی رجعت معکوس کا اثر یقیناً کچھ نہ کچھ پڑا ہوگا اور ہو سکتا ہے کہ زلزلے کی کوئی صورت وقوع میں آئی ہو

مگر اس کا وقت مختصر سی نماز کا دورانیہ ہی رہا ہوگا اور ایسے زلزلوں کا اس زمانے میں آنا آج کیونکر ثابت کیا جاسکتا ہے۔۔۔اور یہ بھی تو بعید از مکان نہیں کہ خدا نے فرشتوں کے ذریعہ اس کی روک تھام کردی ہو۔

وہ علیؑ جس نے اس باب خیبر کو، جسے چالیس آدمی کھولتے تھے اور بند کرتے تھے، دو انگلیوں سے اکھاڑ لیا تھا اس کے لئے ایک کلمے کی انگلی سے زمین کی گردش کو پلٹا دینا قیاس سے باہر تو نہیں ہوسکتا!

سخن گسترانہ طور پر ابوتراب کی رعایت سے ایک فکری نکتہ توجہ طلب ہوگا کہ پانی نہ ملنے کی صورت میں وضو کے بجائے تیمم کیا جاتا ہے اور نماز اس کے بغیر پڑھی نہیں جاسکتی جو پہلا فرض عبودیت ہے اور مٹی نہ ہو تو تیمم نہیں کیا جاسکتا بالفاظ دیگر پانی نہ ہو اور مٹی ہو تو نماز پڑھی جاسکتی ہے یعنی تراب پئے ادائے نماز لازم ہے۔ نماز کا انحصار پانی یا مٹی پر اور اسلام کا انحصار نبیؐ پر اور نبی نہ ہوں تو ابوتراب پر۔

یہ ایک بدیہی فیصلہ ہے جس میں تراب کی نسبت ابوتراب کے علاوہ کسی سے نہیں ہوسکتی اس کے بعد اذان میں علی کا نام لینا ناگزیر ہے اور رسولؐ نہ ہوں تو امامت نماز کے لئے علی کے علاوہ کسی کو کوئی حق نہیں پہنچتا؟۔

جنگ خیبر کے بعد کی اہم ترین بات فدک کے یہودیوں کی دعوت اسلام ہے۔ یہودی اپنے زرخیز علاقے کی نصف زمین آنحضرت کو ذاتی طور پر پیش کرکے آپ کی امان میں آگئے تھے۔ حضور نے یہ علاقہ خدا کے حکم سے اپنی بیٹی کو عطیے کے طور پر دے دیا تھا اور اس کی سند بھی لکھ دی تھی۔ (۱۷)

تاریخ کا یہ واقعہ آج تک خلافت اسلام سے انصاف طلب ہے۔

جنگ موتہ

پچھلے دنوں حضور نے جب گرد و نواح کے حکمرانوں اور بادشاہوں کو دعوت اسلام دی تھی تو ایک خط والی شام شرجیل بن عمرو غسانی کو بھی لکھا تھا۔ اس نے آپ کے قاصد حارث ابن عمیر ازدی کو قتل کرادیا تھا۔ ۸ھ میں آپ نے تین ہزار کا امیر لشکر بنا کر حضرت جعفر، زید بن حارثہ اور عبداللہ بن رواحہ کو روانہ کیا۔ موتہ کے مقام پر ایک لاکھ فوج سے ان کا مقابلہ ہوا جس میں یکے بعد دیگرے تینوں مجاہد درجات شہادت پر فائز ہوگئے۔

کہا جاتا ہے کہ ان کے بعد ایک مرد مسلمان نے علم سنبھال لیا تھا اور جنگ کرتا ہوا بقیۃ السیف کو رزم گاہ سے نکال لایا تھا۔ اس کا نام خالد بن ولید تھا لیکن یہ بات ثبوت کی محتاج ہے کیونکہ خالد کچھ روز

قبل ہی مسلمان ہوئے تھے اوران کا نام جانے والوں میں کسی مورخ نے نہیں لکھا۔

سریہ ذات السلاسل

یہ وہ زمانہ تھا، جب اسلام کی مسلسل فتوحات سے مخالفین کا جذبہ انتقام بھڑک اٹھا تھا اور جہاں جہاں کفر میں کچھ جان تھی وہ ایک مرکز پر سمٹ رہا تھا۔ چنانچہ کفار کے بارہ ہزار سوار یابس کی پہاڑیوں پر جمع ہو گئے تھے اوران سب نے باہم عہد کیا تھا کہ موقع و محل سے طوفانی یلغار کر کے محمدؐ اور علیؑ کو قتل کر دیں گے تا کہ قصہ ہی ختم ہو جائے۔ آنحضرت کو کسی طرح اس کی بھنک مل گئی۔ آپ نے خود انھیں کی پناہ گاہ میں گھیر لینے کا فیصلہ کر لیا۔

اس منصوبے کے مطابق پہلے حضرت ابوبکر کو چار ہزار لشکر کے ساتھ بھیجا گیا پھر حضرت عمر کو اس کے بعد عمرو عاص نے جا کر مقابلہ کیا پھر تینوں یکے بعد دیگرے شکست یاب ہو کر واپس آئے۔

ابن بابویہ اور دوسرے راویوں کا بیان ہے کہ حضرت ابوبکر نے جب دشمن کے سامنے پڑاؤ ڈالا تو دو سوار گھاٹیوں سے نکل کر آئے۔ ان سے تنہائی میں حضرت ابوبکر کی کچھ بات چیت ہوئی اور ابوبکرؓ لڑے بغیر واپس ہو گئے۔ حضرت عمر اور عمرو عاص کے لئے بھی کچھ ایسا ہی کہا جاتا ہے۔ حقیقت جو بھی ہو مگر ہار کر آنے والی فوج میں کسی کا زخمی ہونا تو در کنار نکسیر پھوٹنے کا کوئی واقعہ بھی پیش نہیں آیا۔

غیر جانبدار ہو کر دیکھا جائے تو ان گھاٹیوں میں داخل ہونا موت کے منہ میں جانے کے برابر تھا جن کے چپے چپے پر مختلف قسم کے خطرات منڈلا رہے تھے۔ تین بار فوجوں کی ناکام واپسی ہمت شکن تھی مگر حضورؐ نے حوصلہ نہیں ہارا اور اب کی حضرت علی کو ویسی ہی ہدایات دے کر روانہ کیا جو اس سے قبل حضرت ابوبکر، عمرؓ اور عمرو عاص کو دے چکے تھے۔

حضرت علیؑ کو یابس کے حالات کا علم تھا لہٰذا روانگی کی خبر عام ہونے سے پہلے ہی دشمن کے سر پر جا پہنچے۔ کفار خلاف توقع اتنی جلد انہیں دیکھ کر حیرت میں پڑ گئے اور کچھ بدحواس بھی ہوئے کیونکہ گھاٹیوں میں ابھی موت کے جال پوری طرح بچھائے نہیں گئے تھے پھر بھی سخت اور کٹر دشمن تھے، رات ہی رات جو کچھ کر سکتے تھے کر لیا۔ حضرت علیؑ اول وقت نماز صبح سے فارغ ہو کر حملہ آور ہو گئے۔

ان گھاٹیوں کے پتھر بھی اتنے سخت تھے کہ گھوڑوں کی ٹاپیں بھی ان پر پڑتی تھیں تو ان سے چنگاریاں نکلنے لگتی تھیں۔ حضرت علیؑ نے اس کو پیش نظر رکھ کر حملوں کی رفتار تیز سے تیز تر رکھنے کی ہدایت دے دیں۔ انجام کار مسلمانوں کے لشکر کا آخری حصہ داخل بھی نہیں ہونے پایا تھا کہ کافروں کا صفایا

ہو گیا۔ آپ نے حکم مرسل کے مطابق مردوں کو قتل کر دیا، بچوں کو اسیر عورتوں کو پابہ زنجیر کر لیا کیونکہ سب کے دلوں میں اسلام کے خلاف نفرت کا زہر بھر دیا گیا تھا۔

فتح مکہ

صلح حدیبیہ کے شرائط میں یہ بھی طے پایا تھا کہ ہر دو جانب کے حلیفوں کے باہمی معاملات میں قریش اور مسلمانوں میں سے کوئی دخل نہیں دے گا لیکن بنی بکر قریش کا حلیف تھا اور بنی خزاعہ مسلمانوں کا۔ بنی بکر کے ایک شاعر نے جب پیغمبرؐ اسلام کی ہجو کی تو بنی خزاعہ سے اس کی نزاع ہو گئی اور قریش نے بنی بکر کا ساتھ دیا۔ مسلمانوں کو حلیف ہونے کی حیثیت سے بنی خزاعہ کا ساتھ دینا چاہئے تھا لہٰذا معاہدہ حدیبیہ خود بخود ٹوٹ گیا۔

بنی بکر نے مدد کے لئے قریش کو خط لکھا۔ وہ خط حضرت علیؑ نے پکڑ لیا اور حضورؐ کو پہنچا دیا۔ حضورؐ رمضان ۸ھ میں مدینے سے مکے کی طرف روانہ ہو گئے۔ ابوسفیان میں لڑنے کی طاقت نہ تھی مگر اس کا کوئی حیلہ حوالہ چل نہ سکا اور آنحضرت بڑی شان و شوکت سے داخل مکہ ہو گئے۔

وہ دن آپ کی نگاہوں میں پھر رہے تھے جب ابوطالب کی سرپرستی میں آپ نے اعلان اسلام کیا تھا پھر ام المومنین خدیجۃ الکبریٰ کی رفاقت یاد آئی اور آپ کی آنکھیں پرآب ہو گئیں۔ کفار قریش بھی آپ کی نظروں کے سامنے گھومنے لگے تاہم آپ بڑے تحمل سے آگے بڑھتے رہے۔ ابوسفیان حضرت عباس کی پناہ میں ایک تنگ گزرگاہ کے سہارے آ کر کھڑا ہو گیا تھا اور دبی دبی آہیں بھر رہا تھا۔ اچانک اس کے منہ سے نکل گیا:-

''عباس! تمہارے بھتیجے کی بادشاہت بہت عظیم ہو گئی ہے''۔

حضرت عباس کا جواب لوح تاریخ پر ثبت ہے ''وائے ہو تجھ پر اے اباسفیان، یہ نبوت ہے بادشاہت نہیں ہے''۔

حضرت عباس نے ابوسفیان کو آنحضرت کی خدمت میں پیش کر کے اعلان کرایا کہ جو ابوسفیان کے گھر میں پناہ لے گا، وہ معاف کر دیا جائے گا۔ پھر آپ نے مزید اعلان کروایا: ''جو ہتھیار پھینک دے گا یا اپنے گھر کا دروازہ بند کر کے بیٹھ جائے گا یا مسجد الحرام میں داخل ہو جائے گا، وہ بھی محفوظ ہے''۔

پھر آپ خدیجۃ الکبریٰ کی قبر پر ہوتے ہوئے خانہ کعبہ میں داخل ہوئے۔ علیؑ قدم قدم پر آپ کے ساتھ تھے۔ آپ نے فرمایا:-

''حق آیا اور باطل چلا گیا۔ باطل جانے ہی والا تھا۔ باطل کی کوئی ابتداء نہیں ہے اور نہ پلٹ کر اس کو آنا ہے''۔۔۔

پھر آپ نے اپنی کمان سے بڑے بڑے بتوں کی آنکھیں پھوڑیں، انہیں زمین پر گرادیا۔۔۔ بلندی پر جو بت نصب تھے، ان کو توڑنے کے لئے علیؑ کو اپنے کاندھے پر سوار کیا اور علیؑ نے محمدؐ کے کاندھوں پر پاؤں رکھ کر ان بتوں کو پاش پاش کر دیا۔ گویا علیؑ نے عظمت ختم المرسلین کی رفعت پر کھڑے ہو کر باطل کی ہر علامت کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے توڑ ڈالا۔

علیؑ کی اس افضلیت پر شاید ابوسفیان کے جانشین کا خیال نہیں گیا ورنہ مسلمانوں کے ذخیرہ احادیث میں ایسی کوئی نہ کوئی حدیث ضرور ملتی۔

اس اثناء میں ظہر کی نماز کا وقت آ گیا اور خانہ کعبہ کی چھت پر حضرت بلال کی آواز گونجنے لگی جسے سن کر قریش کے بعض افراد اپنی اپنی بولیاں بولنے لگے۔ ابوسفیان اس وقت یہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔ ''میں کچھ نہیں کہتا۔ دیواریں محمدؐ کو خبر دیدیں گی۔'' عکرمہ بن ابوجہل کہہ گزرا۔ ''میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کعبے کی چھت پر چڑھ کر رباح کا بیٹا گدھے کی طرح چیخے گا!''

خالد بن اسید بولا ''خدا کا شکر ہے کہ میرا باپ زندہ نہیں رہا ورنہ اس کو بھی یہ آواز سننا پڑتی!''

اور واقعی آنحضرتؐ کو اس مکالمے کی خبر ہو گئی۔ آپ نے بلا پوچھا اور مجبوراً انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔ پھر کچھ اور لوگ بھی آئے جنہوں نے کلمہ طیبہ کی تلاوت کی جن میں حضرت ابوبکر کے پدر بزرگ ابوقحافہ بھی شامل تھے۔ جن عورتوں نے بیعت کی، ان میں ہندہ جگر خوارہ کا نام بھی لیا جاتا ہے۔

قیام مکہ میں حضورؐ نے کئی تبلیغی مہمات انجام دیں۔ خالد بن ولید کو بنی خذیمہ کی طرف روانہ کیا۔

اس قبیلے سے خالد کی پرانی دشمنی تھی۔ وہ لوگ ہتھیار باندھ کر آئے تھے۔ خالد نے پہلے حضور کے نمائندے کی حیثیت سے ان کے ہتھیار رکھوائے پھر ان کے سو آدمی قتل کرا دیئے۔ اس کی شکایت پر حضورؐ نے تحقیق کرائی تو واقعہ سچا نکلا۔ حضورؐ خالد پر بہت برہم ہوئے اور بارگاہ خداوندی میں ہاتھ بلند کر کے عرض کیا:-

''پروردگار! میں تیرے حضور اپنی بریت کا اظہار کرتا ہوں خالد کے عمل سے'' حقیقت یہ ہے کہ نو واردان بساط اسلام نے حضورؐ کے سایے میں پناہ تو لے لی تھی لیکن عرب کی صحرائی کینہ پروری اور وحشیانہ جبلت ان میں اسی طرح باقی تھی جس کا مظاہرہ تاحیات ان کے اقوال و اعمال سے ہوتا رہا۔

مسلمان انہیں خالد کو سیف اللہ بنا کر علیؑ کے مقابلے پر لے آتے ہیں۔۔۔خدا کی پناہ!

غزوہ حنین

حضورؐ کی مسلسل فتوحات ایک طرف مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ کر رہی تھیں، دوسری طرف مملکت اسلامیہ کا دائرہ بڑھتا جارہا تھا لیکن اس کا ایک نتیجہ اور نکل رہا تھا کہ جہاں جہاں تھوڑا دم خم بھی باقی رہا تھا وہاں حد درجہ اشتعال پیدا ہو رہا تھا۔ چنانچہ فتح مکہ کی خبر جب وادی حنین میں پہنچی تو بنی ہوازن، بنی ثقیف، بنی جشم اور بنی سعد نے متحد ہو کر اسلام کے خلاف ایک محاذ بنالیا اور اوطاس میں پانچ ہزار کا لشکر جمع ہو گیا۔ حضورؐ نے مکہ کے دو ہزار نو مسلموں سمیت بارہ ہزار سے ان کا مقابلہ کیا۔ اپنی کثرت کو دیکھ کر حضرت ابوبکر کے منہ سے نکل گیا۔

''آج ہم پر کون غالب آ سکتا ہے''!

صبح کو بڑا علم حضرت علیؑ کے ہاتھ میں تھا۔ باقی علم لشکر کے دوسرے قائدین کے ہاتھوں میں۔ خالد بن ولید اپنی قبیلے کے ساتھ آگے بڑھے۔ بنی ہوازن نے کمین گاہوں سے نکل کر ان پر تیروں کی بوچھار کر دی۔ وہ تاب نہ لا کر ہمت ہار بیٹھے، ان کے بھی قدم اکھڑ گئے۔ آنحضرتؐ آوازوں پر آوازیں دیتے رہے مگر کسی نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔

یہ پہلی جنگ تھی جس میں حضورؐ نے بنفس نفیس شمشیر زنی کی۔ صرف دس آدمی آپ کے گرد و پیش دشمنوں کی یلغار کا مقابلہ کر رہے تھے۔ ان میں ام ایمن کا بیٹا قتل ہو گیا۔ حضرت عباس بن عبدالمطلب حضورؐ کے داہنی طرف، فضل بن عباس بائیں جانب ابوسفیان بن حارث بن عبدالمطلب گھوڑے کی لگام پکڑے ہوئے، حضرت علی سینہ سپر تھے۔ نوفل بن حارث، ربیعہ بن حارث، عبداللہ ابن زبیر اور ابولہب کے دو بیٹے عتبہ و معتب پشت پر اور اردگرد تلواروں کو بے نیام کیے، سب کے سب بنی ہاشم، جو آباء و اجداد کے شایان شان داد شجاعت دے رہے تھے۔

اس روز کی جنگ میں علیؑ نے چالیس آدمیوں کو اٹھا کر زمین پر پٹک دیا۔ آپ کی ہر ضرب مخالف کو دو حصوں میں اس طرح تقسیم کر رہی تھی کہ مقتول کا جسم لمبائی میں بالکل برابر کے دو ٹکڑوں میں بٹ جاتا۔ دشمنوں کا علمدار ابو جرول زد پر آیا تو ایک ہی وار میں دو نیم ہو گیا۔ اس کے مرتے ہی کفار میں بدحواسی پیدا ہو گئی اور ان میں بھی بھگدڑ شروع ہو گئی۔

حضرت عباس کی آواز شروع ہی سے سنائی دے رہی تھی۔

''کہاں جارہے ہو بیعت رضوان والو''

کافروں کے فرار پر بھاگتے ہوئے مسلمان کچھ ٹھہرے۔ دشمنوں کو بدحواس پاکر انہوں نے مفرورین کا قتل شروع کردیا۔ حضورؐ نے ایک مٹھی خاک اٹھا کر کافروں کی طرف اڑادی۔ کچھ ایک دوسرے پر گرتے پڑتے نکل گئے کچھ خوف وہراس میں مسلمانوں کے ہاتھوں لقمہ اجل بن گئے۔

حضرت براء ابن عازب سے روایت ہے کہ۔

''ہم نے ہوازن پر حملہ کیا تو وہ متفرق اور منتشر ہوگئے۔ اس کے بعد ہم غنائم پر متوجہ ہوئے تو انہوں نے جمع ہو کر تیروں کے زغے میں لے لیا۔۔۔ یہ جو پریشانی کی آزمائش ہم پر مسلط ہوئی، یہ ہماری ہی غلطی کی بنا پر تھی کہ ہم دنیاوی مال ومتاع کی طرف متوجہ اور اس کے ساتھ متعلق ہوگئے۔ غزوہ احد میں بھی ایسا ہی واقع ہوا تھا۔'' (۱۸)

''جنگ احد کے بعد ہزیمت یافتہ مسلمانوں کی یہ دوسری بھگدڑ تھی جس میں حضرت علی، حضرت عباس، ابن حارث اور ابن مسعود کے علاوہ سب بھاگ گئے تھے''۔ (۱۹)

یہ تھا حنین کا معرکہ، جس کے بعد اوطاس میں جنگ ہوئی۔ اس میں مسلمان کامیاب رہے۔ حنین کے مفرورین کا ایک گروہ ابھی طائف میں موجود تھا لہٰذا حضورؐ نے ان کا محاصرہ کرلیا لیکن یہ محاصرہ طول پکڑ گیا اور پندرہ دن گزر گئے۔

ایک دن علیؑ ہوازن وثقیف کے بتوں کو توڑ کر پلٹے تو آنحضرتؐ آپ کو تنہائی میں لے گئے اور رازدارانہ انداز میں کچھ باتیں کرنے لگے۔

''جب اس خلوت اور تنہائی کا وقت طول پکڑ گیا تو صحابہ کہنے لگے۔ دور دراز کی باتیں چچا کے فرزند سے کرتے ہیں، دوسروں سے نہیں کہتے۔ رسولؐ اللہ نے فرمایا میں ان کے ساتھ راز کی باتیں نہیں کرتا بلکہ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ راز کی باتیں کرتا ہے''[1]

بہرحال طائف کا محاصرہ ابھی جاری تھا کہ حضورؐ نے محاصرہ اٹھا لینے کی ہدایت فرمائی۔ یہ بات بعض صحابہ کو ناگوار گزری۔ انہوں نے کہا۔

''تعجب ہے کہ ہم کوچ کر جائیں اور طائف پر ہم مفتوح نہ ہو۔ یہ کیا صورت ہوئی؟

اس پر حضور نے ان کی توبیخ وسرزنش کے لئے فرمایا۔

''تم چاہتے ہو تو جنگ کر کے دیکھ لو۔۔۔''

دوسرے دن انہوں نے جنگ کی تو از حد زخمی ہوئے اور پشیمان وشرمندہ بھی۔ آخر وہ خود ہی

کوچ کے لئے سامان لادنے لگے۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا۔

''جب میں نے کوچ کا حکم دیا تھا تو توقف کیا اور ٹھہر گئے، اب خود اس کے خواہاں ہو''۔

جواب میں وہ کہتے بھی تو کیا کہتے، سر جھکا کر بولے۔

''یا رسول اللہ! ثقیف کے تیروں نے چھلنی کر دیا، بد دعا فرمایئے ان کے لئے۔۔۔''

حضور نے انہیں مایوس نہیں کیا، ہاتھ اٹھا کر بارگاہ الٰہی میں عرض کیا۔

''خدایا انہیں ہدایت دے اور اسلام پر میرے قریب لا۔۔۔!''

آپ کی دعا کس کے لئے تھی، آنحضرت ہی جانتے ہوں گے!

غزوہ تبوک

اسی زمانے میں یہ اطلاع ملی کہ شام میں مسلمانوں پر حملہ کے لئے لشکر تیار ہو رہا ہے۔ آنحضرتؐ نے ان کے حملہ آور ہونے سے قبل بڑھ کر روکنے کا منصوبہ بنایا مگر مسلمان ساتھ دینے میں پہلو تہی کرنے لگے۔ آنحضرتؐ نے آس پاس کے قبائل کو طلب کیا۔ ان میں سے کچھ آئے کچھ نہیں آئے۔ قریب کے لوگوں میں سے کچھ تو عذر و حیلہ کر کے گھروں میں بیٹھ رہے۔ ایک بڑی تعداد نے اہم اور ذاتی مسائل کے حوالے سے نہ جانے کی اجازت خواہی کی۔ حضورؐ نے نوشتہ ہائے قلوب ماتھوں پر پڑھ لئے تھے، جان بوجھ کر ان کی معذرت قبول کر لی۔ سرتابی صرف اسی حد تک نہیں کی گئی بلکہ لشکر کی تیاری کے لئے کسی قسم کا تعاون بھی نہیں کیا۔

ایک طرف نام نہاد سرفروشوں کی یہ سرد مہری تھی، دوسری طرف یہ افواہیں بھی اڑنے لگیں کہ شام میں اتنی فوجیں جمع ہو گئی ہیں کہ تل رکھنے کی جگہ نہیں ملتی لیکن حضورؐ نے جو عزم کر لیا تھا، وہ اپنی جگہ پر رہا۔ بڑی کد و کاوش سے تیس ہزار آدمی فراہم ہو سکے جن میں صرف ایک ہزار سوار تھے، اونٹ گنتی میں اتنے کم تھے کہ دس آدمیوں میں سے ایک اونٹ پر بیٹھتا، نو پیدل چلتے، انہیں باری باری سواری کا موقع ملتا، زادِ راہ کی اس قدر قلت تھی کہ دو آدمی مل کر کھجور کا ایک دانہ کھاتے تھے!

آنحضرت اندر و باہر کے منافقوں کے غدارانہ عزائم کا احساس کر رہے تھے۔ آپ گو اپنی عدم موجودگی میں فتنوں کا اندیشہ لاحق ہو رہا تھا لہٰذا چاہئے تو یہ تھا کہ وہ اپنا ارادہ ملتوی کر دیتے لیکن جھوٹوں کو بے نقاب کرنا بھی ضروری تھا اور جاں نثاری کے پرفریب دعووں کی حقیقت بھی واضح کرنا تھی اس لئے تبوک کی مہم پر روانہ ہو گئے۔ جانتے تھے کہ جانے والوں میں وہ عنصر بھی موجود ہے جو راہ فرار ناپ کر جیتی

ہوئی جنگ کو ہار میں بدلوادینے کا ماہر ہے تاہم مومنین خالص پر آپ کو اعتماد کامل تھا اور اسلام کی حفاظت کے لئے وہ کافی تھے۔

مدینے کی حفاظت کے لئے اپنے جیسے کسی کو چھوڑنا بھی تھا۔ اس کے لئے ابوطالب کی اس یادگار کو تجویز کرلیا تھا جس کو باپ نے اپنے تمام فرائض کی وراثت سونپی تھی جو آنکھ کھولتے ہی سایے کی طرح آپ کے ساتھ رہا تھا اور جس کی موجودگی میں رب کعبہ نے حضورؐ کو سایے سے بے نیاز کردیا تھا۔ حضورؐ کے پیکر انسانی میں بیک وقت ایک ہی سایہ ممکن تھا اور اس سایے کو آپؐ مدینے میں اپنا قائمقام بنا رہے تھے۔ اس کو علیؑ جانتے تھے اور محسوس بھی کرتے تھے پھر بھی عام مسلمانوں کے علم کے لئے ایک سوال کردیا۔

''کسی غزوے میں تو میں پیچھے نہیں رہا۔ اس مرتبہ کیوں مجھے چھوڑے جارہے ہیں، یارسول اللہ؟''

حضورؐ نے سر سے پاؤں تک علیؑ پر ایک نظر ڈالی اور فرمایا۔

''تمہاری نسبت مجھ سے ایسی ہے جو ہارون کی موسیٰؑ سے تھی۔ فرق صرف یہ ہے کہ میرے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے۔ کیا تم اس سے راضی نہیں ہو، یا علیؑ؟'' (صحیح مسلم)

علیؑ نے سرِ تسلیم خم کردیا مگر لشکر کے جانے کے بعد منافقوں نے مشتہر کرنا شروع کردیا کہ ''علیؑ رسول اللہ پر بار تھے تب ہی تو اپنے ساتھ نہیں لے گئے''!

بات یہ تھی کہ منافق علیؑ سے ڈرتے تھے کہ ان کے ہوتے ہوئے وہ مدینے میں کوئی خلفشار نہ کرسکیں گے۔ وہ تنہا سب کی سرکوبی کے لئے کافی ہیں اس لئے چاہتے تھے کہ کسی طرح وہ چلے جائیں۔ علیؑ کو علم تھا کہ ان کا مقصد کیا ہے پھر بھی آپ اس کی اطلاع دینے کے لئے مقام حرب باد میں جاکر حضور سے ملے اور آپ نے منافقوں کا کہنا دہرادیا۔ حضور نے فرمایا۔

''لوگ جھوٹ کہتے ہیں۔ میں نے تمہیں اس لئے چھوڑا ہے کہ تم میرے اہل بیت میں میرے خلیفہ بن کر رہو تا کہ ان کی دیکھ بھال کرسکو!'' (۲۰)

علیؑ مدینے واپس آگئے۔ لشکر آگے بڑھ گیا اور تبوک جاکر ٹھہرا تو معلوم ہوا کہ اس خبر کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ عیسائی خود مسلمانوں کی فوجوں کو دیکھ کر مرعوب ہوگئے۔ ایلہ کے سردار یوحنا نے حاضر ہوکر جزیہ دینا قبول کیا اور ایک خچر نذر کیا۔ آپ نے اس کو ایک ردا مرحمت فرمائی۔ جربا اور اذرح کے عیسائی بھی جزیہ ادا کرنے کی شرط پر اسلام کی پناہ میں آگئے اور حضورؐ نے لشکر کی واپسی کا حکم دیدیا۔

عقبہ ذی فتق

قرآن نے مسلم نما کافروں کو منافق کا نام دیا ہے۔ تاریخ صرف عبداللہ ابن ابی کا ایک نام لیتی ہے لیکن کلام باری میں انتیس مقامات پر لفظ منافقون کا استعمال کیا گیا ہے اس لئے ماننا پڑے گا کہ مسلمانوں میں یہ کالی بھیڑیں کافی بڑی تعداد میں شامل تھیں جو مسلسل اسلام اور پیغمبرؐ اسلام کے خلاف ریشہ دوانی کرتی رہیں اور آپ کے بعد تو ان کی سازشوں نے یہ کارنمایاں انجام دیا کہ غلط و صحیح کا فیصلہ آج تک ناممکن ہے۔

غزوات اسلام اور پیغمبرؐ اسلام کی حیات میں وہ ہر موڑ پر ایک نئے انداز سے سامنے آئے لیکن چہروں پر اسلام کے نقاب ڈالے ہوئے تھے لہٰذا جانئے بوجھنے کے بعد بھی ان کا نام لینا راستی فتنہ انگیز بن جاتا ہے۔

غزوہ تبوک کی مہم میں تو انہوں نے سازشوں کا ایسا جال بنا تھا کہ اس سے اسلام اور عمائدین اسلام کا بچ نکلنا بہت مشکل تھا مگر مخبر صادق کی صداقت نے اس کمین گاہ کے ہر وار کو خالی دیا۔ ان کے جال کا ایک سرا عقبہ ذی فتق تک پھیلا ہوا تھا جو تبوک سے مدینے جانے والے راستے پر ایک خطرناک گھاٹی ہے۔ اس گھاٹی میں نقاب پوش منافق کمین گاہوں میں بیٹھے ہوئے، حضورؐ کے آنے کے منتظر تھے تاکہ وہ ان پر حملہ آور ہو سکیں۔

آنحضرتؐ کسی بھی خطرے کے لئے تیار تھے۔ عمار یاسر اونٹ کی مہار تھامے تھے اور حذیفہ یمانی عقب سے ان کو ہانک رہے تھے۔ دونوں چہار جانب سے چوکنا تھے۔ جیسے ہی منافقوں کے اونٹ ایک طرف سے برآمد ہو کر سامنے آئے، عمار نے بڑھ کر اونٹ کے منہ پر چابک کی بوچھاڑ کر دی۔ اونٹ بدک کر دوسرے اونٹ سے ٹکرا گیا اب عمار کی پیہم ضربیں دوسرے اونٹوں پر پڑنے لگیں۔ سواروں کو وار کرنے کا موقع ہی نہ ملا اور وہ ایک طرف بھاگ کر چھپ گئے۔ ان کے جانے کے بعد حضور نے حذیفہ سے پوچھا ''پہچانا انہیں تم نے۔۔۔؟''

حذیفہ نے انکار کیا تو آپ نے حذیفہ کے کان میں ان کے نام بتا دیئے اور تاکید کی کہ کبھی زبان پر نہ لانا۔

بات وہی مصلحت کی تھی کہ ابھی اسلام کا نام تو لیتے ہیں۔ انہیں کھل کر دشمنی کا موقع کیوں دیا جائے!

کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد حضرت عمر نے کئی مرتبہ ان لوگوں کے نام پوچھے مگر حذیفہ نے

کبھی بتایا نہیں۔

ایک مسجد بعض لوگوں نے مسجد قبا کے سامنے مسجد ضرار کے نام سے بنوائی تھی۔ تا کہ ابو عامر فاسق کو اس کا پیش نماز بنائیں۔ آنحضرت نے تبوک سے واپسی پر اس مسجد کو منہدم کرادیا اور اس کو آگ لگوادی۔

سورہ برات

۹ھ میں آنحضرت نے تین سو آدمیوں کے ساتھ حضرت ابو بکر کو روانہ کیا کہ ایام تشریق میں سورہ برات کی دس آیتیں پڑھ کر سنائیں جو ایک طرح پر رسولؐ کی طرف سے حتمی اعلانات تھے، بالفاظ دیگر پیغمبرؐ اسلام نے اپنے بجائے اپنے نمائندے کو اپنے احکامات نافذ کرنے کو بھیجا تھا پھر کچھ وقفے سے علیؑ کو متعین کر دیا کہ وہ ابوبکرؓ کے بجائے ان فرائض کو انجام دیں چنانچہ علیؑ گئے اور اعلان کیا۔

''آج کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کرے گا اور نہ برہنہ ہو کر طواف کرے گا۔۔۔'' اسی طرح کی دس آیات بلند آواز سے پڑھیں۔ پھر قربانی کر کے اور دوسرے واجبات انجام دے کر واپس ہو گئے۔

واپسی پر حضرت ابو بکر نے اپنی جگہ پر علیؑ کو روانہ کرنے کی وجہ پوچھی تو آپؐ نے فرمایا کہ یہ فرض میرا تھا یا اس کا جو میرے اہل میں سے ہوتا۔ (۲۱)

کھلے لفظوں میں یہ اعلان تھا کہ میری جگہ اگر کوئی لے سکتا ہے تو صرف وہ جو میرے اہل میں سے ہو اور بحالت موجودہ صرف علیؑ اہل میں سے ہیں، ابوبکرؓ یا ان جیسا کوئی اہل میں نہیں ہے!

آنحضرت نے اپنے بعد افق پر مستقبل کو دیکھ لیا تھا، اور مسلمانوں کو اپنے عمل سے بتا رہے تھے کہ دیکھو دھوکا نہ کھا جانا، کہیں ایسا نہ ہو کہ جب میں نہ رہوں تو بجز علیؑ کے کسی اور کو میرا جانشین سمجھ لو لیکن دنیا والوں نے اپنے نجات دہندہ کی ہر کوشش پر پانی پھیر دیا۔

انہیں دنوں میں آیہ تطہیر کا نزول ہوا اور حضورؐ نے اپنی چادر میں فاطمہؑ، علیؑ اور حسنین کو لے کر دنیا کو بتایا کہ یہ ہی میرے اہل بیت ہیں۔ خدا نے ہر نجاست کو ان سے دور رکھا ہے۔ یہ پاکیزگی اور طہارت کا پیکر ہیں۔ اس کو بشمول صحیح مسلم سب نے لکھا ہے لیکن امام نووی نے تفسیر میں ملاوٹ کر دی ہے کہ آیت کی ابتداء اور آخر میں ازواج کا ذکر ہے لہٰذا ازواج بھی ان میں شامل ہیں۔ یہ حقیقتاً اہل بیت کے خلاف معنی آفرینی کا وہی انداز ہے جس کو امت نے شروع ہی سے روا رکھا ہے پھر بھی اکثر مفسرین

نے اس کی تردید کی ہے اور ڈنکے کی چوٹ پر کہا ہے کہ آیہ تطہیر میں صرف فاطمہؑ، آپ کے باپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، شوہر اور بچوں کے علاوہ کسی کو نہیں لیا جا سکتا۔ ایک گروہ کی روایت میں روح القدس بھی تحت کساء آ جاتے ہیں۔

غدیر خم

حضورؐ شاید مسلمانوں کے ایک گروہ کی بدنیتی سے واقف تھے اس لئے مستقبل کے صراط مستقیم کو واضح سے واضح تر کرتے چلے جا رہے تھے۔ مسلمانوں میں سے اکثر برگزیدہ لوگ ہر بار سر تسلیم خم کر دیتے مگر دلوں میں جو کچھ تھا اس کو وہی جانتے تھے۔

ہادیٔ مطلق اپنے فرائض کو تیزی سے انجام دے رہے تھے۔ آخر حجۃ الوداع کے بعد ۱۴ ذی الحج کو مکے سے چل کر ۱۸ ذی الحجہ ۱۰ھ کو جب آپ خم غدیر میں اقامت پذیر ہوئے تو آیہ بلغ کا نزول ہوا۔ آپ نے پالان شتر سے ایک منبر بنوایا اور حضرت بلال کو اصحاب کو جمع کرنے کی ہدایت کی۔ بلال نے آواز بلند کی۔۔۔!

''حی علی خیر العمل!''

ایک لاکھ چوبیس ہزار دیکھتے ہی دیکھتے جمع ہو گئے۔ آپ نے سر منبر پہنچ کر علیؑ کو اپنے برابر کھڑا کیا اور ایک خطبے کا آغاز کر دیا۔ فصاحت و بلاغت کے دریا بہہ رہے تھے، علم و عرفان کے چشمے ابل رہے تھے۔ آپ نے وصیت کے طور پر مسلمانوں سے فرمایا۔

''میں تم میں دو عظیم چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں جو ایک دوسرے سے بزرگ تر ہیں ایک ہے قرآن کریم، دوسرے میرے اہل بیت!'' (۴۴)

اہل بیت کا تعارف سورہ برات کے اعلان میں اور اپنی چادر میں سمیٹ کر نزول آیہ تطہیر کے موقع پر کر چکے تھے۔ ایک گہری سانس لیکر بیان کے تسلسل میں آپؐ نے فرمایا۔

''میرے بعد ان دونوں چیزوں میں احتیاط کرنا۔ دیکھنا ہے کہ کس طرح تم ان سے سلوک رتے ہو اور کیسے ان کے حقوق ادا کرتے ہو۔ یہ دونوں چیزیں میرے بعد کبھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گی، یہاں تک کہ حوض کوثر پر مجھ سے آملیں۔۔۔''

''حق تبارک و تعالیٰ میرا مولیٰ ہے اور میں تمام مسلمانوں کا مولیٰ ہوں''۔

پھر آپ نے علیؑ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اٹھایا اور اتنا بلند کیا کہ پورا مجمع دیکھ لے۔ اس

کے ساتھ ہی آپ نے فرمایا:-

"میں جس کا مولیٰ ہوں، یہ علی بھی اس کا مولیٰ ہے۔ خدایا! تو بھی اس کو دوست رکھ جو علیؑ کو دوست رکھے اور اس کو دشمن رکھ کہ جو علی کو دشمن رکھے!" (۲۳)

یہ اعلان دراصل اعلانِ خلافت تھا۔ تاریخ انبیاء جس کی شاہد ہے۔ ۱۸ ذی الحج کو حضرت آدم نے جناب شیث کو اپنا وصی بنایا تھا۔ اسی تاریخ کو حضرت ادریس کے حق میں وصیت کی گئی تھی۔ یہی وہ تاریخ تھی جب موسیٰ نے حضرت یوشع کے لئے وصیت کی تھی، حضرت عیسیٰ نے جناب شمعون کے وصی ہونے کا اعلان کیا تھا اور آج ختمی مرتبت حضرت علیؑ کو بھی اپنا جیسا مولیٰ بنا رہے تھے۔

صحیح بخاری کی ایک روایت میں عترتی کے بجائے سنتی پایا جاتا ہے۔ اگر اس کو بھی مان لیا جائے تو محبت و احترام فاطمہ زہرا، علی و حسنین کے لئے حضورؐ کا خلوص اور پیار سنت میں داخل ہے اور سب پر مستزاد ہے۔ یہ ارشاد گرامی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امت سے جو اجر رسالت مانگا تھا، وہ محبت اہل بیت کے سوا کچھ نہ تھا۔

ایک روایت محدث دہلوی کی بحوالہ مشکواۃ قدرے اضافے سے ملتی ہے!

"مدد کر اس کی جس نے علی کی مدد کی اور ذلیل کر اس کو جس نے علی کو چھوڑا۔ حق کو اس طرف لازم کر جس طرف علیؑ ہوں!"

پھر حضورؐ منبر سے نیچے اترے، علی کے سر پر سیاہ عمامہ باندھا اور اس مجمع میں چھوڑ دیا جو مبارکباد کے لئے علیؑ کی طرف بڑھ رہا تھا، جس میں سرفہرست عمر ابن خطاب تھے جو کہہ رہے تھے "یا علیؑ! مبارک ہو آج سے آپ میرے اور تمام مومنین و مومنات کے مولیٰ ہو گئے۔"

حسان بن ثابت کا شہرہ آفاق قصیدہ تکمیل دین کے اس اضافی منظر کو پیش کرتا ہے جس میں فضائل علیؑ کا موجیں مارتا ہوا سمندر نظر آتا ہے مگر مبارکباد دینے والے مومنین و مومنات نے مستقبل میں اپنے مولیٰ کے ساتھ جو سلوک کیا، وہ تاریخ کا ایسا المیہ ہے جس کو دمشق کی حدیث سازی بھی چھپا نہ سکی!

مباہلہ نجران

۶ھ میں جب آنحضرت نے سلاطین کو دعوت اسلام دی تھی تو مشہور و معروف کلیساؤں کو بھی خطوط لکھے تھے اور بنی نجران کے راہب عاقب، عبدالمسیح اور ابو حارثہ مدینے آئے تھے، حضورؐ سے کافی بحث

ومباحثہ ہوا تھا مگر وہ قائل نہ ہو سکے تھے۔ اس پر آیت نازل ہوئی تھی۔

''ان سے کہو کہ اپنے نفسوں، عورتوں اور بیٹوں کو لا کر مباہلہ کریں۔ ہم اپنے نفسوں، عورتوں اور بیٹوں کو لائیں گے۔''

عاقب نے منظور کر لیا اور ۲۴ ذی الحجہ ۱۰ھ کو اپنا وفد لے کر آ گیا۔ حضور بھی اپنے اثاثہ نبوت کو لے کر نکلے۔ آپ سیاہ عبا زیب تن کیے ہوئے تھے۔ آپ نے بڑے نواسے حسنؓ کا ہاتھ پکڑا امام حسین کو گود میں لیا، سیدہ کونین بالکل آپ کے عقب میں تھیں، ان کے پیچھے حضرت علیؓ پنجتن کا کارواں بنا کر آگے بڑھے۔

ابو حارثہ نے انہیں دیکھ کر پوچھا: ''یہ کون ہیں؟'' لوگوں نے ان کا مفصل تعارف کرایا۔ اس عرصے میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قریب پہنچ کر دو زانو بیٹھ گئے تھے۔

مباہلے کی شرط یہ تھی کہ دونوں خدا کے سامنے تضرع کے ساتھ دعا کریں گے اور جھوٹوں پر لعنت کریں گے۔ صداقت خود ظاہر ہو جائے گی۔

عبادت کے لئے اپنے وقف کر دینے والوں اور اعتکاف میں برسوں تک خدا سے لو لگانے والوں نے، جب ان چہروں پر نظر ڈالی جن کے گرد نور کے ہالے بنے ہوئے تھے اور پیشانیوں سے عرفان باری کی شعاعیں نکل رہی تھیں تو وہ انہیں ایک وجد میں دیکھتے رہ گئے۔

ابو حارثہ بھی اسی طرح بیٹھا ہوا تھا جس طرح حضورؐ فروکش تھے۔ اس کے منہ سے اچانک نکل گیا۔ ''ہم ان سے مباہلہ نہیں کر سکتے۔ اگر انہوں نے بد دعا کر دی تو روئے زمین پر کوئی عیسائی باقی نہ رہے گا۔'' اموی مورخین نے اس کے الفاظ کو توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے۔ زمخشری اور بعض دوسرے مورخین نے صاف لکھ دیا ہے کہ دوسرے راہب بھی تحیر اور سراسیمگی کے عالم میں تھے۔ ایک نے دوسرے کو استفہامیہ انداز میں دیکھا، سب کی آنکھیں ایک ہی بات کہہ رہی تھیں۔ آخر مقدس راہب اٹھ کر حضورؐ کے قریب آ گیا اور شکست خوردہ لہجے میں بولا:۔

''ہم آپ سے مباہلہ نہیں کر سکتے؟''

حضور کے سوالیہ انداز پر اس نے کہہ دیا۔

''جزیہ دینا اور آپ کی سرپرستی میں رہنا قبول کرتے ہیں''۔

کچھ وقفے سے نجران کا یہ قبیلہ حلقہ اسلام میں داخل ہو گیا۔

تاریخ اسلام کی ایک اور روایت اس سلسلے میں پائی جاتی ہے کہ بنی نجران نے یہ استدعا کی تھی

کہ ایک مقدس مسلمان اسلام کے اصول سمجھانے کے لئے بھیجا جائے لیکن اس کا امین ہونا شرط ہے۔ اس پر ابوعبیدہ الجراح بھیجے گئے تھے پھر یہ قبیلہ مسلمان ہوگیا۔اس وقت سے ابوعبیدہ الجراح امین الامت کہے جاتے ہیں۔اصول بتانے کے لئے امین ہونا ضروری کیوں قرار دیا گیا تھا۔ان کو مدینے سے کسی کی کوئی امانت لے کر تو جانا نہیں تھا۔نکات دین سے واقفیت اور زہد وتقویٰ تو درکار ہوسکتا تھا، امین ہونے کی شرط کیوں عائد کی گئی تھی؟ ممکن ہے راوی نے اس کو سمجھا ہو۔ بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ صادق و امین مکہ کی دو خصوصیات میں سے صدق تو حضرت ابوبکر نے لے لیا تھا، امانت داری کو حضرت الجراح سے مختص کر دیا گیا۔خدا حقیقت کا جاننے والا ہے۔

اس سلسلے میں ایک تاریخی انکشاف بے محل نہ ہوگا کہ آنحضرت کی وفات سے کچھ قبل مدینے کے قریب کوہ مرتشی پر حصول خلافت کے لئے ایک باہمی معاہدہ ہوا تھا جس پر ساڑھے تین سو آدمیوں نے دستخط کیے تھے۔ یہ معاہدہ ابوعبیدہ الجراح کے پاس رکھوایا گیا تھا۔اُس وقت سے وہ امین الامت کہے جاتے ہیں۔

بہر طور نجران کا قبیلہ مسلمان ہوگیا جس کی اساس کے لئے افراد مباہلہ کا امتیاز آج بھی مسلم ہے۔اس میں کسی اور کو شامل نہیں کیا جاسکتا، اور جب کوئی اضافہ ممکن نہیں ہے تو اہل بیت کا دائرہ بھی وسیع نہیں ہوسکتا اور اس میں ازواج کو ڈھکیلنے کی کوشش کسی سعی ناکام کے سوا کچھ نہیں ہے۔

اکثر مورخین کی آراء کے ساتھ ذخائرالعقبیٰ کا بیان اس پر مہر تصدیق ثبت کرتا ہے۔

"خدا کے نزدیک پیغمبر اسلام کے متعلقین میں کوئی بچہ، کوئی مرد یا کوئی عورت اور ہوتی تو آپ اس کو ضرور شامل کرتے یعنی صرف اتنے ہی افراد پر مشتمل آپ کا پورا گھر تھا۔اس کھلے اعلان کے بعد جو بھی اہل بیت میں شمولیت کا دعویٰ کرے، وہ باطل ہوگا"۔ (۲۴)

ختم المرسلین

کہا جاتا ہے کہ جو پیدا ہوا ہے، اس کو ناپید ہونا ہے، اس سے عام انسان کی طرح ہادیان عالم بھی مستثنیٰ نہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ انسان عموماً طبعی موت مرتا ہے لیکن انبیاء کے لئے شہادت مقدر ہوتی ہے۔ادیان عالم کے محققین کا اتفاق ہے کہ کوئی نبی ایسا نہیں ہے جسے کسی نہ کسی طرح مخالفین کے ہاتھوں موت نہ آئی ہو صرف حضرت موسیٰ کے بارے میں کچھ یقین سے نہیں کہا جاسکتا تاہم عقیدے کا تقاضا ہے کہ وہ مقدرات انبیاء سے محروم نہ رہے ہوں گے۔

خاتم المرسلین کو بھی خیبر میں یہودی عورت نے گوشت میں دیراثر زہر دیا تھا جو آہستہ آہستہ اپنا کام کرتا رہا اور آپ کے بعد آئمہ اثناء عشر میں سے گیارہ کو حضرت علیؑ سے لیکر امام حسن عسکری تک شہادت نصیب ہوئی، بارھویں کا فیصلہ ابھی تک باقی ہے مگر اس کا شمار ہادیان عالم کی گنتی میں ہے اس لئے انبیاء کی وراثت کا یہ شرف اس کو ملنا ہی چاہئے۔

خود آنحضرت پر زہر کو اثر کرنے میں کچھ وقت لگا لیکن ڈھائی سال بعد وہ تیزی سے اپنا کام کرنے لگا اور آپ کی طبیعت زیادہ خراب رہنے لگی۔ خود آپ کو قدرت کے اشاروں سے محسوس ہو رہا تھا کہ وقت آ گیا ہے لہٰذا غدیرخم میں تکمیل دین کے بعد آپ نے تیزی کے ساتھ آخری فرائض کو پورا کرنا شروع کر دیا۔ آپ کے خطبات کی رفتار بڑھ گئی، بار بار اصحاب کو جمع کرتے اور فرماتے:۔

''دیکھو، میرے بعد فتنے نہ اٹھانا، میری ہدایات کی مخالفت نہ کرنا، مرتد نہ ہو جانا!

لوگو! میں تم سے پہلے جانے والا ہوں۔ حوض کوثر پر جب تم میرے پاس آؤ گے تو میں تم سے پوچھوں گا کہ کس حد تک تم نے میرے کہنے پر عمل کیا ہے اور کس طرح میرا اجر رسالت ادا کیا ہے۔

میں تمہارے پاس دو گرانقدر چیزیں چھوڑ رہا ہوں خدا کی کتاب اپنی عترت۔ دیکھنا ہے کہ ان کی حفاظت میں تم کس طرح میری نیابت کرتے ہو۔۔۔ خدائے قدیر نے مجھے خبر دی ہے کہ یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گی تاوقتیکہ وہ حوض کوثر پر میرے پاس نہ آ جائیں۔

خبردار! میرے اہل بیت پر کبھی سبقت نہ کرنا، ان سے الگ نہ ہونا، ان کے حقوق ادا کرنے میں کوتاہی نہ کرنا ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے۔۔۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ دین سے پھر جاؤ، کافر نہ ہو جاؤ، ایک دوسرے کے خلاف تلواریں نہ کھینچ لو!''

وقتے وقتے سے آپ جنت البقیع بھی گئے اور صحابہ کی موجودگی میں فرمایا:۔

''حکم باری ہوا ہے کہ بقیع کے مردوں کے لئے استغفار کروں''۔

پھر آپ نے فرمایا:۔

''سلام ہو تم پر اے قبر کے مکینو! خوشگوار ہے تمہاری یہ حالت کہ تم نجات پا چکے ہو ان فتنوں سے جو دنیا والوں کو درپیش ہیں''۔

دیر تک آپ ان سب کے لئے مغفرت کی دعا کرتے رہے پھر حضرت علیؑ سے فرمایا۔

''جبریل ہر سال ایک قرآن لا کر مجھے پیش کرتے تھے۔ اب کی قرآن دو مرتبہ پیش کیا ہے۔ میرا وقت آ چکا ہے''۔

اس طرح مرض کی شدت کے ساتھ فرمودات میں اضافہ ہوتا گیا۔ تین روز کے بعد ایک دن مسجد میں آئے تو سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ نقاہت کافی بڑھ چکی تھی، دائیں ہاتھ سے حضرت علیؑ کو پکڑے ہوئے تھے، بائیں سے فضل بن عباس کو، آتے ہی آپ منبر پر تشریف لے گئے اور فرمایا۔

''لوگو! وقت آ گیا ہے کہ میں دنیا سے اٹھ جاؤں۔ جس سے میں نے کوئی وعدہ کیا ہے، وہ وعدہ پورا کرا لے، جس سے کوئی قرض لیا ہے، وہ آگاہ کر دے تاکہ اسے ادا کر دیا جائے۔

کوئی دعویٰ نہ کرے کہ میں عمل کے بغیر نجات حاصل کر لوں گا، کوئی امید نہ رکھے کہ وہ اطاعت خدا کے بغیر اس کی رضا پائے گا۔ عذاب الٰہی سے صرف عمل نیک ہی نجات دے سکتا ہے۔۔۔''

ایک طویل و بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا آپ نے پھر ام سلمہ کے گھر واپس تشریف لے گئے۔

شیخ مفید، شیخ طبرسی، ابن شہر اشوب، صحیح بخاری، صحیح مسلم اور المستدرک کے مبینہ واقعات میں کوئی اختلاف نہیں، اختلاف تو حضورؐ کے آخری ایام میں ہے کہ کہاں سے آپ نے سفر آخرت فرمایا؟ مورخین کی اکثریت حضرت عائشہ کا نام لیتی ہے لیکن روضۃ الصفا اور بعض دوسرے مورخین فاطمہ زہرا کا گھر لکھتے ہیں۔ اس میں جذبہ عقیدت کی کارفرمائی بھی ہے اور چونکہ شام کی حدیث سازی ام المومنین عائشہ کی ہم نوا ہے اس لئے اس بیان میں شبہات دامن گیر ہو جاتے ہیں۔ قیاساً یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ عائشہؓ دیگر امہات المومنین کو راضی کر کے اپنے گھر لے گئی ہوں پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیٹی کی محبت میں سیدہ کونین کے گھر چلے گئے ہوں۔ حجرے دونوں کے ملے ہوئے تو تھے ہی۔

یہ درمیانی فاصلہ شاید دونوں کے حلقہ ہائے عقیدت کو پسند نہ آئے لیکن غیر جانبدار فیصلہ یہی معلوم ہوتا ہے۔ اس سے صحیحین کی بعض روایات مجروح ضرور ہوتی ہیں مگر حقیقت یہی ہے اور یہ بھی غلط نہیں ہے کہ آپ کی وفات اس وقت ہوئی جب آپ کا سر حضرت علیؑ کے سینے سے ٹکا ہوا تھا۔ تجہیز و تدفین کے آخر مراحل جس کے ہاتھوں طے ہونا تھے، مخبر صادق اس کے سوا کسی اور کی آغوش سے سفر آخرت کرنے والے نہیں تھے۔

اس منزل پر پہنچنے کے بعد خدیجۃ الکبریٰ کی یادگار کو اس کا حق اولیٰ بھی مل جاتا ہے اور مشہد اقدس کی جگہ کا تعین بھی ہو جاتا ہے کہ حضورؐ نے جس مقام پر رحلت فرمائی وہیں آپ کو سپرد خاک بھی کر دیا گیا۔ دونوں حجرے اتنے ملحق تھے کہ حضورؐ جب ام المومنین عائشہ کی باری پر آپ کے حجرے میں ہوتے تو درمیانی موکھے سے عظیم المرتبت بیٹی سے گفتگو بھی کر لیتے تھے۔

باپ بیٹی کے مابین محبت کا محیر العقول جذبہ بھی اس کی تصدیق کرتا ہے اور یہ حقیقت بھی ک

حضورؐ زندگی کے کسی موڑ پر بھی خدیجہ کو نہ بھول سکے تھے۔ فاطمہ زہرا کے آنسو حضور کی رحلت کے بعد بہتے ہی رہے اور چھ ماہ سے زائد وہ جی نہ سکیں جبکہ آپ کا سن صرف انیس برس تھا۔ اس عمر میں مرنے کا تصور بھی نہیں کیا جاتا مگر باپ کو حد سے زائد چاہنے والی بیٹی پر باپ کے بعد مظالم کے ایسے پہاڑ امت نے ڈھائے کہ وہ چور چور ہو کر رہ گئی اور غموں کی شدت میں دنیا سے اپنا رشتہ توڑ گئی۔

دو طرفہ روایات کی رو سے شدید تکلیف کی صورت میں بھی گیارہ روز تک آپ نے نماز پڑھائی۔ بارہویں دن حضرت علیؑ کے سہارے تشریف لائے۔ خطبے اور نماز سے فارغ ہوئے تو واپس ہو کر جناب فاطمہ کے گھر میں داخل ہو گئے۔ تمام امہات المومنین حضرت عائشہؓ کے حجرے میں جمع تھیں۔ اس رات طبیعت بہت خراب تھی۔ امہات المومنین کے بارے میں متضاد روایات کے سبب کہا نہیں جا سکتا کہ رات انہوں نے کہاں اور کس طرح گزاری لیکن صبح کو جب حضرت بلال کی اذان پر آپ بیدار نہیں ہوئے تو حضرت عائشہ نے حضرت ابوبکر سے فرمایا کہ وہ نماز پڑھا دیں۔ حضرت حفصہ نے یہی پیغام حضرت عمر کو بھجوایا۔

اس سے یہ رائے قائم کی جا سکتی ہے کہ سب کی سب جناب فاطمہ کے حجرے میں موجود تھیں اور ان کی آوازیں آپ نے سن لی تھیں لہذا بیدار ہو گئے تھے اور آنکھیں کھول دی تھیں۔ ایک لحظہ کے بعد آپ اٹھ کر بیٹھ گئے اور حضرت علیؑ کا سہارا لے کر آہستہ آہستہ چل کر مسجد میں داخل ہو گئے۔ حضرت ابوبکر نماز پڑھا رہے تھے۔ آپ صفوں کو چیرتے ہوئے ان کے برابر پہنچ گئے۔ اس موقع کے لئے کہا جاتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کی امامت دیکھ کر بہت خوش ہوئے لیکن حقیقت یہ ہے کہ حضرت ابوبکر پیچھے ہٹ گئے تھے۔ ان کی پڑھائی ہوئی نماز کالعدم ہوگئی اور حضور از سرِ نو نماز پڑھا کر واپس ہو گئے۔

گھر آ کر آپ نے انہیں طلب کیا اور دریافت کیا۔

وہ اسامہ کے لشکر کے ساتھ موتہ کی طرف کیوں نہیں گئے جبکہ انہیں تاکید کی گئی تھی۔

حضرت ابوبکر نے جواب دیا: ''میں گیا تھا مگر واپس اس لئے آ گیا کہ آپ سے تجدید عہد کر لوں''۔۔۔شاید حضرت ابوبکر کو جلد ہی آنحضرتؐ کے سفرِ آخرت کر جانے کا یقین تھا۔

حضرت عمرؓ نے کہا۔ ''مجھے اچھا نہیں لگا کہ آپ کی خیریت دوسروں سے معلوم کرتا رہوں''۔

آنحضرت ان جوابات پر ناگواری کے لہجے میں بولے ''تم لوگوں نے سخت نافرمانی کی۔ خیر جاؤ اسامہ کا لشکر روانہ کرو۔۔۔علیؑ کے علاوہ سب اس لشکر کے ساتھ جائیں گے۔ جو نہ جائے گا۔ اس پر

خدا کی لعنت ہوگی!''۔

اس کو مورخین کی اکثریت نے لکھا ہے۔ علامہ عبدالحق محدث دہلوی نے مدارج النبوہ میں اس کی صراحت کی ہے کہ وہ لوگ نہیں گئے اس کا سبب یہ تھا کہ اسامہ ان کے مقابلے میں بہت کم سن تھے اور جانا خلاف مصلحت بھی تھا۔

اور حضرت ابوبکرؓ اسامہ کے لشکر کے ساتھ جانے کے بجائے مدینے سے باہر اپنے دیہات کے مکان پر چلے گئے۔ حضرت عمرؓ مسجد نبوی میں آ گئے جہاں دوسرے لوگ بھی موجود تھے اور حضورؐ کے عالم نزع کی خبر پر ان کے لئے دعا کر رہے تھے۔

صحیحین کی رو سے یہ بھی صحیح ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غیر حالت کے دنوں میں حضرت ابوبکر نے مسجد نبوی میں نماز کی امامت کی تھی اور یہ بھی صحیح ہے کہ حضورؐ کی حالت اطمینان بخش سمجھ کر اسامہ کے ساتھ جانے کے بجائے اپنی زمینوں پر چلے گئے تھے اور تیسرے روز واپس آئے جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سفر آخرت کر چکے تھے۔ حضرت عمر کو اس سے اتنا صدمہ ہوا کہ وہ اس خبر کو شدت غم میں برداشت نہیں کر سکتے تھے لہٰذا نیم جنونی کیفیت میں کوڑے کو ہوا میں لہرا رہے تھے کہ اگر کوئی کہے گا کہ آنحضرتؐ انتقال فرما گئے تو اس کی کھال ادھیڑ ڈالیں گے۔ کس قدر تضاد ہے بیانات میں، فہم الجھ کر رہ جاتی ہے!

مخبر صادق تو اب رہے نہیں تھے ورنہ پوچھ لیا جاتا کہ حقیقت کیا ہے پھر بھی اس کا کوئی حاصل نہ ہوتا کیونکہ دین کا اہتمام تو ۱۸ ذی الحجہ کو غدیر خم میں ہو چکا تھا، نبوت کا آخری باب آج بند ہو گیا۔ اب مستقبل کی باگ ڈور بعد والوں کو سنبھالنا تھی اور وہ اس کے لئے تیار تھے۔

حضرت ابوبکر جب واپس آئے تو حضورؐ رحلت فرما چکے تھے۔ انہوں نے چادر ہٹا کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روئے مطہر کو دیکھا، پیشانی کو چوما اور کہا۔

''میرے ماں باپ فدا ہوں آپ پر، اللہ آپ پر دو موتیں وارد نہ کرے گا۔ یہی ایک موت آپ کے لئے لکھی ہوئی تھی''۔

پھر آپ نے چادر منہ پر ڈال دی اور مسجد نبوی میں آ گئے۔ کہا جاتا ہے کہ ابوبکرؓ نے وفات پر ایک خطبہ مسجد میں فرمایا تھا۔ بعض روایات میں ہے کہ خطبہ انتخاب سقیفہ سے قبل دیا تھا۔۔۔ حضرت عمرؓ آپ کو دیکھ کر قریب آ گئے۔ انہیں حضرت ابوبکرؓ نے سینے سے لگایا۔ تسلی دینے کے انداز میں پیٹھ کو تھپکا۔ اس سے حضرت عمرؓ کو کچھ سکون میسر آ گیا۔ اس وقفے میں ابوعبیدہ الجراح، سعد بن ابی وقاص اور بعض

دوسرے لوگ بھی قریب آ گئے تھے۔ انہوں نے آپس میں ایک دوسرے سے کچھ کہا اور سب کے سب سقیفہ بنی ساعدہ کی طرف چلے گئے۔

مہاجروں کا یہ گروہ کہتا ہے کہ انصار وہاں انتخاب خلافت کے لئے جمع ہو گئے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ وغیرہ پہنچ نہ جاتے تو انصار سعد بن عبادہ کو خلیفہ بنا لیتے۔ انصار کا کہنا تھا کہ تین چار انصاری حضرت عمرؓ کے دوست تھے۔ ان کے ذریعے سعد بن عبادہ اور ان کے مخالف قبیلے کو خبر ملی تھی کہ حضرت ابوبکرؓ زمینوں پر جانے کے بہانے سقیفہ بنی ساعدہ میں لوگوں کو یکجا ہونے کی اطلاع دینے گئے ہیں۔ اس خبر پر جو انصار موجود تھے، انہیں لے کر سعد سقیفہ پہنچ گئے تا کہ مہاجر من مانی کرنے نہ پائیں۔

حقیقت جو کچھ بھی ہو لیکن حضرت ابوبکرؓ اپنے ساتھیوں کو لے کر وہاں پہنچے تو مہاجر کافی تعداد میں موجود تھے۔ عین اسی وقت سعد بن عبادہ داخل ہوئے۔ پورا مجمع شمار میں ستر پچھتر یا زائد سے زائد سو بتایا گیا ہے جن میں بعض بنی ہاشم بھی شامل تھے جو خبر پا کر چلے گئے تھے۔ مختلف تاریخی بیانات کے مطابق مہاجروں کی تعداد کم و بیش دو تہائی تھی۔ ایک تہائی میں انصار، بنی ہاشم اور غیر جانبدار لوگ تھے۔

اور بیعت کرنے والوں میں تو وہی چند انصار تھے جن کے ذریعہ اس اجتماع کی بو پھوٹی تھی۔ سعد بن عبادہ دھینگا مشتی میں کچل کر رہ گئے تھے جن کو قیس بن سعد اور دوسرے انصار اٹھا کر لے گئے تھے۔

اس سلسلے میں بعض مورخین نے صاف صاف لکھا ہے کہ پیغمبر عرب جن دنوں موت و حیات کی کش مکش میں مبتلا تھے، ان دنوں مدینے کے گلی کوچوں میں یہ خبر اڑ رہی تھی کہ حضورؐ نے علیؑ یا کسی اور کو اپنا جانشین مقرر نہیں کیا لہٰذا مسلمان خود اپنے خلیفہ کا انتخاب کریں گے۔ ابوبکر اور ابوعبیدہ وغیرہ کہتے ہیں کہ وہ بنی ہاشم میں سے کسی کو خلیفہ بننے نہیں دیں گے۔

صراحت مزید کے طور پر واقعہ قرطاس کا حوالہ بے محل نہ ہوگا۔ حضور نے اپنی بیماری کے زمانے میں محسوس کیا تھا کہ لوگ کہتے ہیں، میں نے کسی کو خلیفہ نہیں بنایا، شاید امہات المومنین میں ایسی کوئی گفتگو ہوئی ہو۔۔۔ باہر لوگوں کا عام خیال بھی یہی تھا:-

''عبداللہ ابن عمر سے ایک روایت ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ انہوں نے زخمی ہونے کے بعد حضرت عمر سے پوچھا کہ وہ اپنے بعد کسی کو خلیفہ نامزد کریں گے یا نہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ چاہوں تو نامزد کروں نہ چاہوں تو نامزد نہ کروں کیوں کہ رسول اللہ نے کسی کو خلیفہ نہیں بنایا تھا اور حضرت ابوبکر

نے مجھے بنادیا تھا۔(۲۵)

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پہلے دن سے بتاتے آئے تھے کہ اسلام کا آج میں ہوں، اسلام کا کل وہ ہوگا جس کو میں بار ہا بتا چکا ہوں۔ پھر بھی کہا جار ہا تھا کہ اپنا جانشین نہیں بنایا کسی کو لہذا غشی سے کچھ افاقہ ہوا تو آپ نے حسب روایت عبداللہ ابن عباس مبینہ عبیداللہ وعتبہ مستولہ صحیح بخاری میں فرمایا:۔

''مجھے لکھنے کا سامان لا دو میں ایک نوشتہ لکھ دوں تا کہ میرے بعد تم گمراہ نہ ہو۔ یہ سن کر حضرت عمر نے فرمایا کہ آپ مرض کے غلبے میں ایسا کہہ رہے ہیں، ہمارے لئے کتاب خدا کافی ہے۔ اس پر دوسرے لوگوں سے حضرت عمر کی تو تو، میں میں ہونے لگی۔ حضورؐ نے شور وغل پر فرمایا۔ ہٹ جاؤ میرے پاس سے، میرے سامنے تم لوگوں کو ایسی باتیں زیب نہیں دیتیں''۔(۲۶)

حضرت عمر کے جانے کے بعد لوگوں نے عرض کیا۔ آپ فرمائیں تو قلم اور کھال لا کر دیدی جائے؟ آپ نے فرمایا۔''جو کچھ میں دیکھ چکا ہوں، اس کے بعد اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' شاید آپ مایوس ہو چکے تھے۔۔۔''البتہ میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ میرے بعد میرے اہل بیت سے اچھا سلوک کرنا۔'' یہ واقعہ وفات سے چار روز قبل کا ہے۔

بعض لوگ حضرت عمر کے لفظ ہذیان استعمال کرنے کی تردید کرتے ہیں لیکن شہاب الدین خفاجی نے نسیم الریاض فی شرح شفائے قاضی عیاض میں صراحت کی ہے کہ حضرت عمر نے حضورؐ کے لئے لفظ ہذیان استعمال کیا تھا۔ مسند امام احمد ابن حنبل اور صحیح مسلم میں لفظ ہذیان کی تصدیق کی گئی ہے۔ امام غزالی تک نے تردید نہیں کی۔ صحیح بخاری میں بھی دبے الفاظ میں تسلیم کیا گیا ہے البتہ محدث دہلوی اور مولانا شبلی حضرت عمر کی گستاخی کو دائرہ تہذیب میں لانے کی کوشش کرتے ہیں مگر یہ بات حضور کو اتنی ناگوار ہوئی تھی کہ آپ نے برہم ہو کر انہیں اور دوسرے لوگوں کو باہر نکال دیا تھا۔

مورخین کی اکثریت نے اسے اپنے اپنے انداز میں بیان کیا ہے۔ امام غزالی کی سر العارفین کی عربی عبارت کا اردو ترجمہ ملاحظہ ہو:۔

''جب آنحضرت نے انتقال فرمایا تو اپنی وفات سے پہلے آپ نے ارشاد فرمایا کہ لاؤ قلم اور کاغذ تا کہ میں امر خلافت کے متعلق تمہارے سارے شبہات دور کردوں کہ میرے بعد کون خلافت کا مستحق ہے لیکن عمرؓ یہ کہہ کر مانع ہوئے کہ یہ شخص بہک رہا ہے اور ہذیان بک رہا ہے؟''۔

اس کے بعد حضور نے تین وصیتیں اور کیں۔ اکثر مورخین نے کسی دباؤ میں دو وصیتیں درج کر کے لکھ دیا ہے کہ تیسری وصیت راوی بھول گیا۔ بیان کا یہ طریقہ کچھ نیا نہیں ہے۔ اکثر راوی اپنی

طرف سے کچھ کہنے کے لئے یہ انداز اختیار کر لیتے ہیں۔

''جابر بن سمرہ سے روایت ہے کہ نبی کریم نے فرمایا ''امیر بارہ ہوں گے۔ اس کے بعد آپ نے ایک کلمہ فرمایا جو میں سن نہ سکا۔ میرے والد نے بتایا۔ سب قریش سے ہوں گے۔۔۔''

کام کا جملہ آخری تھا جو راوی، نے خود نہیں سنا تھا لہٰذا دوسرے آدمی سے کہلوا دیا گیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تیسری وصیت بعض راویوں نے نہیں سنی۔ ہم نے ایک بڑے مورخ سے سنی ہے۔ اس کو عوام کی اطلاع کے لئے لکھا جاتا ہے:-

اس کو ابن حجر مکی نے اپنے معتبر محدثین سے معلوم کیا تھا۔ وہ صواعق محرقہ، الباب التاسع فصل الثانی میں ص ۵۷ پر تحریر کرتے ہیں۔

''حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے مرض موت میں فرمایا۔ ''میں بہت جلد رحلت کر جاؤں گا خدا کا فرستادہ مجھے لے جائے گا۔ پہلے بھی کہہ چکا ہوں، پھر کہتا ہوں تا کہ تمہیں کوئی عذر باقی نہ رہے۔ میں اللہ کی کتاب، اپنی عترت یعنی اہل بیت تمہارے درمیان چھوڑے جا رہا ہوں۔ آپ نے علیؑ کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیکر کچھ اٹھایا۔ یہ علیؑ قرآن کے ساتھ ہے اور قرآن علیؑ کے ساتھ ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے اس وقت تک جدا نہ ہوں گے جب تک میرے پاس حوض کوثر پر پہنچ نہ جائیں لہٰذا ان دونوں سے پوچھتے رہنا، اس کے بارے میں، جو کچھ ان میں چھوڑا گیا ہے''۔

آخری جملے میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن صامت اور قرآن ناطق کی صراحت بھی کر دی ہے۔۔۔ ابھی ابھی حضرت عمر یہ کہہ کر گئے تھے کہ کتاب خدا ہمارے لئے کافی ہے۔ مخبر صادق نے اس کا جواب بھی دے دیا تھا کہ صرف قرآن کافی نہیں ہے جب تک معلم قرآن اس کے ساتھ نہ ہو۔

غدیر خم کے حاضرین میں سے بھی کوئی نہ کوئی اس وقت ضرور موجود ہوگا اور اس نے باہر جا کر کہا بھی ہوگا لیکن جو لوگ جانتے بوجھتے ہوئے بھی ایک فیصلہ کر چکے تھے، اس پر اس کا اثر کیا ہوتا۔

حضرت عمر کے لئے احترام کے ساتھ اتنا ہی عرض کیا جا سکتا ہے کہ اپنے نجات دہندہ سے ایسے وقت میں یہ لب و لہجہ اور یہ گستاخانہ انداز ایک گرے ہوئے آدمی کو بھی زیب نہیں دیتا نہ کہ وہ شخص جس کو دین میں فاروق کہا جاتا ہے۔

تعجب تو اس پر ہے کہ اسلام کے جان نثاروں کی موجودگی میں ایسے الفاظ استعمال کرنے کی ہمت کیسے پڑی؟ شاید وہ سب پہلے سے ان کے ہم خیال تھے اور حضرت عمر نے صرف ترجمان کا کردار ادا

کیا تھا۔ تب ہی تو بنی ہاشم اور بعض صحابہ کے سوا کوئی کچھ نہیں بولا اور باہر پھر پہلی جیسی کانا پھونسی شروع ہو گئی۔

اس سے صریحی طور پر یہ معنی اخذ کرنا کچھ غلط نہ ہوگا کہ ایک تعداد اپنے نجات دہندہ سے بغاوت پر آمادہ تھی اور اس آخر وقت میں ایسی نظیر پیش کرنا چاہتی تھی جو تاریخ عالم میں تخت حکومت کے امیدوار پیش کرتے رہے ہیں۔۔۔ مسلمانوں میں ہندوستان کے محی الدین اورنگزیب عالمگیر مستقبل بعید میں اس کی تقلید کرتے نظر آتے ہیں لیکن اورنگزیب کا مقابلہ اپنے بھائیوں سے تھا اور بات وراثت کی تھی اس لئے بیٹے نے باپ کو گرفتار کر کے نظر بند کر دیا تھا جہاں شاہجہان نے سات برس زندہ رہ کر سفر آخرت کیا۔۔۔

عرب کی صورت بالکل مختلف تھی، سلسلہ انبیاء کا آخری نمائندہ بستر مرگ پر تھا۔ اعلان نبوت کے بعد دعوت ذی العشیرہ میں بنی ہاشم کے صنادید عرب کو بتا چکا تھا کہ یہ میرا بھائی میرا وصی اور میرا خلیفہ ہے۔ پھر آپ اکثر مواقع پر کبھی اشاروں میں اور کبھی کھلے لفظوں میں ایک طرح کا اعلان کرتے رہے اور آخر میں تکمیل دین کے موقع پر اپنے بھائی کو ہاتھوں میں لے کر یہ فیصلہ بھی کر دیا کہ یہ بھی میری طرح تمام مسلمانوں کا مولیٰ ہے اور اس وقت آخر میں یہی لکھ دینا چاہتے تھے تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ کسی کو جانشین نہیں بنایا۔۔۔ لٰہذا لکھنے کا سامان نہیں دیا گیا بلکہ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا گیا کہ دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے تاکہ اگر کچھ دیر بعد لکھ کر دیدیں تو کہنے کی گنجائش رہے کہ لکھا اس وقت جب ہوش و ہواس میں نہیں تھے۔

علیؑ کا منصب امامت شروع ہونے والا تھا۔ انہوں نے نیتوں کو بھانپ لیا تھا، پیغمبرؐ برحق کے ساتھ گستاخی کے انداز میں سمجھ لیا تھا کہ کچھ بھی کہا جائے، ہوگا وہی جس پر عملدرآمد شروع ہو چکا ہے اس لئے علیؑ نے اپنے کو صبر کے مرحلے میں آزمانا شروع کر دیا اور زندگی کے آخری لمحات میں اپنے ہادیؐ مطلق کو کسی مزید تکلیف سے بچالیا۔

عقیدت مند اپنے نجات دہندہ سے ایسی گستاخی کی تاویلیں کرتے ہیں اور مورخین کو جھٹلا کر کبھی الفاظ کو نرم کرنے کی سعی کرتے ہیں اور کبھی معنی آفرینی کر کے کوئی مفہوم کو بدل دیتے ہیں مگر لکھنے کا سامان مانگا تھا جو نہیں دیا گیا۔ اس سے انکار ممکن نہیں کیونکہ حسبنا کتاب اللہ کا اقبال کیا گیا ہے جو عدول حکمی کا ثبوت ہے اور اس سے یہ بھی مسلّم ہو جاتا ہے کہ وقت آخر جس طرح عام آدمی کا دماغ صحیح کام نہیں کرتا ویسا ہی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی سمجھ لیا گیا تھا، حالانکہ جس خدا کی کتاب کو کافی کہا گیا تھا، اسی

کتاب نے یہ بھی بتایا تھا کہ نبی بغیر وحی کے کوئی بات نہیں کرتے۔ اس کی کوئی صراحت تو نہیں کی گئی تھی کہ جب بیمار ہوں تو بغیر وحی کے بھی بولنے لگتے ہیں۔ شاید لوگ یہ بتانا چاہ رہے تھے کہ پیغمبرؑ صرف جاگتے ہی میں نبی ہوتا ہے۔۔۔ صحت مند ہونے کی صورت ہی میں پابند وحی رہتا ہے۔

صحیح بخاری کی احادیث میں یقیناً وضعی احادیث شامل ہیں لیکن اکثر حدیثیں سچی بھی ہیں، جن میں ایک حدیث یہ بھی ہے جس کو امام بخاری نے اپنے قول کی صورت میں پیش کیا ہے:-

''حضورؐ اپنی رائے اور قیاس سے کبھی کچھ نہیں فرماتے تھے۔ جب تک وحی نازل نہ ہوتی۔۔۔ ابن مسعود کا بیان ہے کہ آپ سے روح کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے سکوت اختیار کیا حتیٰ کہ وحی نازل ہوئی''۔ (۲۷)

بات بالکل واضح ہے کہ قلم دوات جو بھی طلب فرمایا تھا، وہ حکم خدا سے تھا، جس کی تعمیل نہیں کی گئی اور خدا کی نافرمانی کا ارتکاب کیا گیا۔ اب ایسی عظیم شخصیت کے لئے کیا کہا جائے۔ بات خدا اور رسول دونوں کی ہے اس کے بعد یہ کہنا ایک فاضل بات ہوگی کہ تقاضائے ایمانی کیا تھا اور کیا کیا گیا۔۔۔؟ عجیب وغریب میزان وفا پیش کی اصحاب رسولؐ نے۔

حدیث سازی کا تدریجی ارتقاء

آنحضرت کی ایک متفقہ حدیث ہے کہ:-

''کوئی مجھ سے ایسی بات منسوب کرے جو میں نے نہ کہی ہو تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے''۔

''ترمذی جلد ۲ باب تعظیم الکذب علی النبی'' میں ایک واقعہ ملتا ہے:-

''حضورؐ نے ایک شخص کو کسی جگہ ایک پیغام لے کر بھیجا اس نے وہاں پہنچ کر کچھ کا کچھ کہہ دیا تو آپ نے اس کے لئے بددعا کی۔ اس کا پیٹ پھٹ گیا، وہ اسی وقت مر گیا اور اس کو زمین نے بھی قبول نہیں کیا''۔

''ایسا ہی ایک واقعہ ابن جوزی نے لکھا ہے۔ ابن سعد اور امام طبرانی نے مقنع تمیمی کے مبینہ کئی واقعے لکھے ہیں اور یہ بھی تحریر کیا ہے کہ آنحضرت کی وفات کے بعد بے شمار حدیثیں ایسی کانوں میں پڑیں جو اس سے پہلے سننے میں نہیں آئی تھیں''۔

سیرۃ النعمان میں بعض اکابر کے حوالوں سے بیان کیا گیا ہے:-

''صحابہ کے عہد میں اہل بدعت نے سیکڑوں بلکہ ہزاروں احادیث وضع کر لی تھیں۔ ان میں زندیقوں کے علاوہ بہت سے پارسا متقی لوگ بھی تھے جو عوام کو اپنا ہم خیال بنانے کے لئے ایسا کرتے تھے اور مسلمان ان کے اعتبار زہد و تقوی میں اُن کا یقین کر لیتے تھے۔ اس طرح یہ حدیثیں اصل احادیث میں شامل ہو گئیں''۔

ترمذی کتاب العلل میں بحوالہ امام ابن سیرین لکھا ہے:-

''شروع میں لوگ اسناد کو نہیں پوچھتے تھے۔ جب فتنہ پیدا ہوا تو احتیاط کی گئی کہ اہل بدعت کی حدیثیں قبول نہ کی جائیں لیکن حدیث کی بے اعتباری اہل بدعت پر موقوف نہ تھی لہٰذا اس سے کچھ فائدہ

نہ ہوا اور یہ سلسلہ جاری رہا"۔

علامہ سیوطی نے تاریخ الخلفاء میں تحریر کیا ہے:-

"بعد وفات، میراث رسولؐ کے بارے میں اختلاف ہوا تو حضرت ابو بکر نے کہا کہ حضور نے فرمایا تھا: ہم گروہ انبیاء کسی کو وارث نہیں بناتے عائشہؓ اور حفصہؓ نے تصدیق کی مگر کسی اور صحابی نے اس حدیث کو اس سے قبل نہیں سنا تھا۔ اس پر حضرت عباسؓ، حضرت علیؑ اور حضرت فاطمہ نے ان کو جھٹلایا کہ حضرتؐ نے یہ حکم غیروں کو بتا دیا اور گھر والوں سے چھپایا۔ یہ ممکن نہ تھا"۔

علامہ عبدالحق محدث دہلوی تحریر فرماتے ہیں۔

"سب سے بڑی مصیبت اور مشکل ترین قضیہ حضرت فاطمہ زہراؑ کا ہے۔ اگر یہ کہیں کہ حضرت فاطمہ زہراؑ اس حدیث سے بے خبر تھیں تو یہ بات خلاف عقل ہے کہ رسول اللہ نے ان کو خبر نہیں دی۔ اگر یہ فرض کر لیں کہ حضرتؐ نے حدیث ان سے بیان نہیں فرمائی تو اور زیادہ مشکل کا سامنا ہے کہ جب ابو بکر سے فاطمہ زہرا نے حدیث سن لی تو اس کے بعد کیوں قبول نہیں کی اور اپنی وفات تک غضب ناک رہیں اس سے معلوم ہوا کہ انھیں حدیث کے وضعی ہونے کا یقین تھا"۔ (۲۸)

مولانا ابن عقیل حنفی نے نصائح کافیہ میں لکھا ہے:-

سقیفہ بنی ساعدہ میں خلافت کے جھگڑے پر حضرت ابو بکر نے بیان کیا کہ آنحضرت نے فرمایا ہے:-

"خلیفہ قریش سے ہوں گے (غیر قریش سے نہیں) تو حضرت سعدؓ بن عبادہ نے انھیں جھٹلایا اور حدیث کو قبول نہیں کیا۔ علی صدیق، فاطمہ زہرا صدیقہ طاہرہ، ابو بکرؓ صدیق، عائشہؓ صدیقہ کس کے بارے میں کوئی کیا کہے؟"

علامہ ابن عقیل حنفی نصائح کافیہ میں مزید تحریر کرتے ہیں۔

"معاویہ نے سر منبر علیؑ کو گالیاں دینے اور لعن وطعن کرنے کا حکم دیا تو لوگوں کے دلوں میں نفاق کے بیج بو دئے۔ آہستہ آہستہ لوگوں کو اس کی عادت پڑ گئی پھر فراعنہ امویہ نے اس سلسلے کو جاری رکھا اور اس کا زہر عوام سے آگے بڑھ کر علماء میں بھی سرایت کرنے لگا۔ اس کے بعد سنت رسولؐ کا کوئی پیرو فضائل اہل بیت بیان کرتا تو اس کو بدعتی قرار دیا جاتا، اگر کوئی اہل بیت اور ان کے راویوں کو جھوٹا اور ناقابل اعتبار کہتا تو اس کو ناصر امت ٹھہرایا جاتا اور اس کی جھوٹی اور ضعیف حدیث کو بھی معتبر سمجھ کر قبول کر لیا جاتا:۔ اور اگر کوئی بھی انجانے میں فضیلت اہل بیت بیان کر دیتا تو مستوجب عتاب ہوتا۔ پھر یہ

طریقہ آگے چل کر بھی جاری رہا۔ یہ کارنامہ معاویہ بن ابی سفیان کا ہے''۔

شرح نہج البلاغہ میں ابن ابی الحدید معتزلی رقم طراز ہیں:-

''معاویہ نے صحابہ اور تابعین کی ایک جماعت کو متعین کیا کہ علیؑ کے لئے مذمت اور توہین کی حدیثیں تصنیف کر کے بیان کریں تا کہ وہ رسوا ہوں اور لوگ ان پر تبرا کریں۔ اس خدمت کے لئے اس نے انعامات اور اجر کا اعلان کیا جس پر لوگ ٹوٹ پڑے اور اس کے حاشیہ نشین ایک دوسرے پر سبقت کرنے لگے جن میں ابو ہریرہ عمرو بن العاص اور مغیرہ بن شعبہ سر فہرست تھے۔ تابعین میں عروہ بن زبیر نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ان سب نے مال دنیا کی ہوس میں جھوٹی حدیثیں گڑھ کر انبار لگا دیئے۔'' (۲۹)

اسی زمانے میں حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ کے فضائل میں تو تصنیف احادیث بیان کی گئیں اور ان کی رو سے بعض تاریخیں قلم بند کی گئیں۔

علامہ ابن عقیل کی نصائح کافیہ میں ابو الحسن مدائنی کی کتاب الاحداث کے حوالے سے لکھا گیا ہے کہ:-

''امیر معاویہ نے اپنی مملکت کے تمام حکام کو ایک فرمان جاری کیا تھا کہ کسی شیعہ علی کی گواہی قبول نہ کی جائے۔ عثمانؓ کے عقیدت مندوں، ان کی ولایت کا اقرار کرنے والوں اور فضائل و مناقب بیان کرنے والوں کی عزت و احترام کیا جائے، انھیں مقرب بنایا جائے اور ان کے قوم و قبیلے اور باپ دادا کے نام لکھ کر میرے پاس بھیجے جائیں۔ ایسا کرنے والوں کو خلعتیں، بخششیں اور جاگیریں عطا کی جاتیں۔ یہ حدیثیں شہر بشہر، دیار بدیار مشتہر کی گئیں اور ان کی اتنی کثرت ہوگئی کہ لوگ سنتے سنتے تھک گئے۔

اس کے بعد شیخین کے لئے ہدایات جاری کی گئیں اور یہ التزام کیا گیا کہ جیسی احادیث ابوتراب کے لئے ملتی ہیں ان سے بڑھ کر ان لوگوں کے لئے احادیث بیان کی جائیں۔ ایسی تمام حدیثیں لکھ کر دمشق بھیجی جائیں۔ تا کہ انھیں مشہور کیا جائے۔ میرے لئے یہ امر بہت پسندیدہ ہوگا، علیؑ کے فضائل بیان کرنے والوں کو یہ احادیث سن کر دکھ ہوگا اور علیؑ کی قدر و قیمت بھی گرے گی۔''

''انجام کار مدح صحابہ کی روایات عرب میں زبان زد ہوگئیں اور منبروں پر ان کے بیان سے گھروں میں بھی ان کے تذکرے ہونے لگے اور لوگ قرآن مجید کی طرح ان کی تعلیم حاصل کرنے لگے۔

پھر گھروں میں خواتین لڑکے اور لڑکیاں ان کو رٹنے لگیں اور نوکر چاکر بھی حافظہ کرنے

لگے۔"

ان واقعات کی تائید ابن ابی الحدید معتزلی نے شرح نہج البلاغہ میں بھی کی ہے اور اس سلسلے میں جلیل القدر علماء کی مساعی کا بھی تذکرہ کیا ہے۔

علامہ شبلی نعمانی نے سیرۃ النعمان میں اشارہ کیا ہے کہ بہت سے ثقہ اور پارسا لوگ بھی نیک نیتی سے اس عمل میں شامل تھے۔

حافظ زین الدین نے تحریر کیا ہے کہ "ان احادیث نے بہت ضرر پہنچایا۔ لوگ واضعین کے ثقہ، تورع اور زہد کو دیکھ کر۔ ایسی احادیث کو صحیح سمجھنے لگے پھر علم سینہ سے گزر کر تمام حدیثیں کتابوں کی زینت بن گئیں اور حکومت دولت اور طاقت سے نسل بعد نسل اُن کی منتقلی ہوتی رہی اور چودھویں صدی ہجری تک پہنچتے پہنچتے جزو عقائد بن گئیں۔ پروپیگنڈا جھوٹ کو سچ بنا دیتا ہے!"

امام غزالی سر العارفین میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"ریاست وخلافت کی محبت میں صحابہ پر خواہش نفس غالب آ گئی تھی۔ پھر فوج کی افسری اور شہروں کو فتح کرنے کی ہوس نے ان کو مدہوش کر دیا اس لئے وہ پچھلی مخالفتوں کی طرف پلٹ گئے رسول اللہ کی غدیری فرمائش کو پس پشت ڈال دیا، دولت حاصل کی اور برے کام کرنے لگے"۔ (۳۰)

شرح مقاصد آخر، بحث امامت میں امام سعد الدین تفتازانی لکھتے ہیں:۔

"بعض صحابہؓ حق سے گزر کر حد ظلم و فسق تک پہنچ گئے تھے۔ سبب اس کا کینہ، فساد، حسد، عناد ملک و ریاست اور لذت شہوت کی خواہشات تھیں"۔

علامہ شبلی نے سیرۃ النعمان میں تحریر کیا ہے:۔

"اختلافات آراء کی بنیاد پر جو اختلافات تھے۔ ان سے زیادہ نقصان نہیں ہوا مگر صحابہ کے بعد یہ اختلافات زور پکڑ گئے اور فرقہ بندی شروع ہوگئی۔ اکثر اعتقادی مسائل میں نص قاطع نہیں ملتی اور ملتی ہے تو ایک دوسرے سے متعارض، اس لئے استنباط رفع تعارض کی ضرورت نے اجتہاد کو بہت وسعت دی اور سیکڑوں رائیں قائم ہوگئیں۔ بلاشبہ ان میں بہت سی صحیح نہیں ہیں لیکن ضروری نہیں کہ وہ سب کفر ہوں۔ افسوس کہ سرگرم طبیعتیں، جو مذہبی جوش اور تقدس کے نشے میں سرشار تھیں، اختلاف رائے کے صدمے کی تاب نہ لا سکیں اور نہایت بے صبری سے مخالفت پر آمادہ ہوگئیں۔ بات بات پر کفر کے فتوے ہونے لگے۔ جو لوگ جس قدر زیادہ مذہبی حرارت رکھتے تھے، اسی قدر کفر کے اطلاق میں کم احتیاط کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ نوبت پہنچی کہ ہر فریق نے دوسرے کی ضلالت و گمراہی ثابت کرنے کے لئے موضوع

روایتوں کی اعانت لی۔ کہیں خود گڑھی کہیں دوسروں کی گڑھی ہوئی روایتوں سے کام لیا۔
ان تعصبات اور جھگڑوں نے جماعت اسلامی کے تمام اجزاء پراگندہ کر دئے اور مذہب، اخلاق، حکومت، تمدن، معاشرت سب کا نقشہ بگڑ گیا''

حقیقت الفقہ مطبوعہ دہلی، انصار میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے لکھا ہے:-

''تقلید کا سبب فقہاء کے باہمی جھگڑے اور نزاعیں ہوئیں اور فتووں میں ٹکریں ہوئیں جب ایک مجتہد کوئی فتوی دیتا تھا تو بالکل اسی کے مقابل دوسرا فتوی دے کر اسے توڑ دیا جاتا اور رد کر دیا جاتا۔ یہ جھگڑے اس وقت تک طے نہیں ہوتے تھے، جب تک ان کی تائید میں متقدمین (صحابہ یا تابعین) میں سے کسی کا قول یا حدیث پیش نہیں کی جاتی۔ نیز قاضیوں کے مظالم بھی اس کا سبب ہوئے کیونکہ اکثر قاضیوں نے اپنے فیصلوں میں جب ظلم کیا اور امین نہ ہوئے تو ان کے فیصلے اس وقت تک قبول نہیں کئے جاتے، جب تک وہ متقدمین کے کلام سے اپنے فیصلے کی تائید میں کوئی ایسی سند نہ پیش کر دیں جس میں عوام کو شک نہ ہو یعنی عوام اُس کی شخصیت سے مرعوب ہو کر سر جھکا کر قبول نہ کر لیں''۔

شاہ صاحب نے فوز الکبیر میں لکھا ہے کہ ''اگر تم یہودیوں کا نمونہ دیکھنا چاہتے ہو تو علمائے سو کو دیکھ لو جو طالب دنیا ہیں اور اگلے مجتہدین کی تقلید کے خوگر ہیں جو کتاب وسنت سے روگرداں ہو کر، کسی عالم کے تعمق واستحسان کی سند پکڑ کر، کلام شارع معصوم سے بے پروا ہو کر، گڑھی ہوئی حدیثوں کو اور لغو تاویلات کو اپنا مقتداء بنائے ہوئے ہیں گویا کہ یہودی ہیں۔''

''ان بیانات سے فقہاء و مجتہدین اہل سنت کے باہمی تنازعات ان کے خود بنائے ہوئے بے سروپا جھگڑے اور لغو فتوے اثبات میں جھوٹی حدیثوں اور متقدمین کے بے سروپا اقوال سے مدد لینا واضح اور روشن ہے۔ یہاں تک کہ ان کی فقہ کی کتابیں اسی قسم کے فتووں اور حدیثوں سے بھری ہوئی ہیں جن پر آج اہل سنت چل رہے ہیں اور ان کو خدا کی نازل کی ہوئی شریعت سمجھتے ہیں اور ان کے مقابے میں کل شریعتوں کو باطل سمجھتے ہیں''۔

''مولانا عبدالحئی لکھنوی نافع الکبیر مقدمہ جامع الصغیر میں لکھتے ہیں:-

''کتنی ہی ایسی مستند کتابیں ہیں جن پر بڑے فقہاء نے بھروسا کیا ہے جو گڑھی ہوئی حدیثوں سے بھری پڑی ہیں، خاص کر فتوے''۔

حقیقت الفقہ بحوالہ الارشاد میں مولانا عبدالحئی لکھتے ہیں:-

''اسی بنا پر علماء نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ کوئی اعتبار نہیں ان حدیثوں کا، جو فقہ کی بڑی

بڑی کتابوں میں نقل کی گئی ہیں جب تک ان کی سند ظاہر نہ ہو یا علمائے حدیث کا ان پر اعتماد نہ ہو، چاہے ان کے مصنفین بڑے بڑے فقیہ ہی کیوں نہ ہوں"۔

"محک رجال علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں دس ہزار نو سو سات راویوں کا ذکر کیا ہے جو کذاب، حدیث گڑھنے والے مجہول و مجروح تھے"۔

"ابن حجر عقلانی نے لسان المیز ان میں اپنے زمانے تک تیرہ ہزار تین سو سینتالیس مرد اور عورتوں کا ذکر کیا ہے"۔

یہ تو وہ لوگ ہیں جن پر علمائے اہل سنت نے جرح کی ہمت کی اور ان کے کذب کا پتہ لگایا، وہ صحابہ اور تابعین اور بڑے بڑے پارسا و ثقات ان کے علاوہ ہیں جو بقول علامہ شبلی نیک نیتی سے فضائل و ترغیب میں حدیثیں گڑھا کرتے تھے۔ بقول حافظ زین الدین، ان حدیثوں نے بہت ضرر پہنچایا کیونکہ واضعین کے زہد و تقویٰ کی بنا پر وہ مقبول ہو گئیں، جو ان تیرہ ہزار پر مستزاد ہیں، انھیں حدیثوں پر علماء و محدثین اہل سنت کا اعتماد رہا اور ہے۔ یہی وہ بے شمار حدیثیں ہیں جو ثقہ فقہاء محدثین کے معیار پر پوری نہ اتر سکیں اور ان کو ہمیشہ رسولؐ کی صحیح السند حدیثوں کی کمی کی شکایت رہی چنانچہ وہ اپنی رائے اور قیاس سے فتوی دینے پر مجبور ہو گئے اور صحاح ستہ، امام بخاری و مسلم و ابن ماجہ، ابوداؤد و ترمذی اور نسائی وغیرہ نے ان پر اعتماد کیا اور ان سے اپنی کتابوں کو بھر دیا پھر صحاح ستہ کے علاوہ مسند دارمی، مسند ابو یعلی، سنن دار قطنی، کتب بیہقی و طبرانی وغیرہ پچاس سے زائد کتابیں لکھ دی گئیں۔

نہیں کہا جا سکتا کہ ساری حدیثیں ان کتابوں کی جھوٹی اور گڑھی ہوئی ہیں بلکہ ان میں احادیث ضعیفہ اور موضوعہ کثرت سے ہیں۔ جس کا خود اہل سنت نے اعتراف کیا ہے لیکن ان کا جدا کرنا علماء کی طاقت سے باہر ہے۔ یہاں تک کہ خود امام بخاری و مسلم وغیرہ بھی سچی اور جھوٹی حدیثوں کو جدا نہ کر سکے کیونکہ ان کا احادیث کی پرکھ کا معیار ناقص تھا اور جو اصول بنائے بھی تھے ان پر بھی عمل نہیں کیا۔۔۔۔"

یہ ہیں اکابر کے نتائج تحقیق کے چند اقتباسات جن کو بلا کسی ترتیب کے لکھ دیا گیا۔ ان سے احادیث سازی کے تدریجی ارتقاء کا ایک اندازہ کیا جا سکتا ہے اور منافقوں کی اس تعداد کا قیاس بھی ہو سکتا ہے، جس کی بناء پر قرآن مجید میں بار بار ان سے چوکنا رہنے کی تاکید کی گئی۔

اس کے بعد کسی مجموعہ حدیث کو بالکل صحیح نہیں کہا جا سکتا جن میں شیعوں کی چاروں کتابیں بھی شامل ہیں۔ ان کے انتخاب میں ممکن احتیاط کے باوجود بعض وضعی احادیث اصلی ہونے کے دھوکے میں

شامل ہوگئی ہیں۔ لہٰذا شیعوں کا بالکلیہ یہ معیار ہے کہ جو حدیث یا روایت قرآن وسنت اور سیرت آئمہ کے معیار پر پوری نہ اترے تو وہ قابل اعتبار نہیں۔

یہی صورت تاریخی واقعات کی بھی ہے جن کو اموی دور میں جھوٹے پروپیگنڈے سے مسخ کر دیا گیا ہے۔ ایسے واقعات لوگ زیب داستاں کے لئے بیان کر دیتے ہیں جن کو قطعاً مستند قرار نہیں دیا جا سکتا۔ تحقیق ضروری ہے۔

سیرت صحابہ
تاریخ وقرآن کے آئینے میں

تاریخ عرب میں یوں تو کئی موقعوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ پہلا وہ دن جب حضرت ابراہیم اپنی زوجہ اور بچے لے کر ریگزار میں وارد ہوئے، پھر وہ ایام جن میں آپ نے کعبے کی تعمیر کی، اس کے بعد وہ لمحات جب بنی نوع انسان کے نجات دہندہ نے شہر مکہ کو صحیح معنی میں ام القراء بنا دیا۔۔۔اور آخر میں تاریخ ساز ہے تھوڑے سے آدمیوں کا وہ اجتماع جس نے حضرت ابو بکر کو ختم المرسلین کا جانشین منتخب کیا۔

یہ انتخاب حلقہ اسلام میں ہمیشہ موضوع بحث رہے گا اور نظریاتی اعتبار سے غیر منفصلہ۔ اس کے اسباب میں ظرف ومظروف کی وسعت و ماہیت کو بڑا دخل ہے مثال میں اس کو باران رحمت اور زمین کی جذبی صلاحیت سے سمجھا جاسکتا ہے۔ رحمۃ للعالمین کا سایہ قلوب انسانی پر یکساں طور پر پڑتا رہا لیکن ہر ایک اس سایے کے اثرات ایک سطح پر قبول نہ کرسکا۔ ان میں زمین کی نرمی اور سختی کی طرح زرخیزی کی قوت بھی شامل رہی اس لئے اصحاب نبی میں ایمان کی قدریں سلمان، ابوذر اور مقداد میں بھی تشکیل پائیں اور ابوسفیان میں بھی، پھر جب جنگ بدر کے بعد مملکت اسلامیہ کے وجود میں آنے کے امکانات پیدا ہونے لگے تو عربوں کا صحرائی مزاج اندر ہی اندر جذبہ اسلام کو ٹھوکے دینے لگا۔

الزام تراشی ہوگی مہاجرین کے کاروان اول پر، اگر یہ کہا جائے کہ پہلے ہی دن سے ان کی نیتوں میں کھوٹ تھا۔ وہ یقیناً صداقت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے متاثر ہو کر اسلام لائے تھے مگر ان کی سیرت وکردار کے جو قصیدے آج پڑھے جاتے ہیں، وہ بالکل ویسے نہ تھے۔ ان کی اکثریت اسلام اور پیغمبرؐ اسلام دونوں سے خلوص رکھتی۔ اصنام نوازی اور اوہام پرستی کے پروردہ لوگوں نے

محمدؐ اور محمدؐ کے خدا دونوں کو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کردار دیکھ کر قبول کیا تھا اور انھیں یقین تھا کہ ابو طالب کا بھتیجا جھوٹ نہیں بول سکتا۔

ان اصحاب کی موجودہ سیرتیں اس وقت پائی نہ جاتیں، جب اسلام کا نبی سختیوں پر سختیاں جھیل رہا تھا۔ بلاشبہ وہ کفار قریش کو حق پر نہ سمجھتے اور ان کے مقابلے پر آنحضرتؐ کا ساتھ دینے کو تیار تھے مگر اپنے دائرے میں رہ کر۔ اسی لئے جب حضرت حارث بن ابی ہالہ حضور کو بچانے میں شہید ہوئے، جب عمار یاسر کی والدہ گرامی اسلام پر قربان ہوئیں پھر جب ابوجہل نے آپ پر غلاظت پھینکی تو کسی کا کوئی کردار نظر نہیں آتا البتہ حضرت حمزہ نے ابوجہل کو ڈھونڈ کر سزا دی آخر میں شعب ابی طالب کا تین سالہ محاصرہ قابل ذکر ہے اس کے باوجود ان میں سے کسی کو بے مہری کا طعنہ نہیں دیا جاسکتا وہ کرتے تو اتنا ہی جتنا کر سکتے تھے۔ ذکر تو اس وقت آجاتا ہے جب جذبہ ایمان اور جرات وشجاعت کے فرضی افسانے تاریخ میں نظر آتے ہیں۔

اعتراف کیا جاتا ہے کہ سب مخلص بھی تھے اور وفادار بھی۔ دور کفر کے تمام گناہ معاف ہو چکے تھے اور اعمال کے لحاظ سے سب کے سب طاہر تھے تاہم ایسے بھی نہیں جیسے کفر کا سایہ ان پر کبھی پڑا ہی نہیں تھا۔ وہ خود بھی مانتے ہوں گے کہ ایام ضلالت کی یاد کبھی کبھی آجاتی ہوگی اور وہ ایک لمحے کے لئے سوچنے لگتے ہوں گے کہ کتنے برے دن تھے جب وہ ابوسفیان اور ولید بن عتبہ کے زمرے میں شامل تھے۔ ہجرت مدینے تک سب آنحضرتؐ کے فداکار رہے اور بڑے جوش وخروش سے اسلام کے پہلے معرکے میں لڑے بھی۔

علیؑ ان کے سامنے کل کے بچے تھے اور اب بھی سن وسال کے اعتبار سے ان کی بزرگی کو چھو نہ سکتے۔ بدر کی لڑائی میں کفار کے ستر مقتولوں میں سے چھتیس کو علیؑ نے مارا تھا جن میں بنی امیہ کے بعض روح رواں شامل تھے ان کے خون کو وہ گروہ بھلا نہ سکا جو اموی عمائدین کی جواں نسل کہلاتا تھا لہذا ایک طرف ہر اموی علیؑ کے تصور کا بھی دشمن ہو گیا تھا۔ دوسری طرف وہ لوگ جو بڑے جری اور دلیر کہے جاتے ہیں اور بعض مورخین لکھتے ہیں کہ ان کے اسلام لاتے ہی مسلمان اتنے شیر ہو گئے کہ خانہ کعبہ میں کھلے خزانے نماز ادا کی لیکن اس جنگ میں ان میں سے شاید ہی کسی نے ایک آدھ آدمی گرایا ہو، چونتیس میں سے باقی کو حضرت حمزہؓ، سعد بن عبادہ اور دوسرے لوگوں نے قتل کیا تھا لہذا ان لوگوں کا کل کے بچے کے سامنے احساس کمتری میں مبتلا ہو جانا فطری تھا، حالانکہ اب وہ بچہ نہیں رہا تھا پچیس سال کا جوان ہو گیا تھا۔

پھر بھی جس نے ظرف سے کام لیا ہوگا، اس نے اپنے کو سمجھا لیا ہوگا کہ کیا ہوا، رسولؐ کے گھر کا نوجوان ہے خدا نے اس کو توفیق عطا کی۔ لیکن عام سطح پر دلوں میں حسد ضرور پیدا ہوا ہوگا۔۔۔ یہ تھی علیؑ سے دوطرفہ عداوت کی ابتداء۔

پھر جس جنگ میں بھی علیؑ کی تلوار چمکتی دشمنان اسلام موت کے گھاٹ اترتے ہی رہتے، حتیٰ کہ جنگ احد میں حضرت حمزہ کی شہادت ہوئی اور خالد بن ولید نے قتل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جھوٹا آوازہ بلند کیا تو مسلمان بھاگنے لگے اور جنگ کا پورا بوجھ علیؑ پر آ پڑا۔ ایسے میں علیؑ کی تلوار ایک برق تجلی بن گئی اور کفر کی دیواریں جذبہ ایمان کے شعلوں سے گرنے لگیں۔ اس دن رسولؐ کی زندگی کے ساتھ علیؑ کی زندگی بھی آزمائش میں پڑ گئی تھی، جس میں علیؑ پورے اترے۔۔۔ اس جنگ میں بڑے بڑے جان نثار پیٹھ دکھا گئے تھے۔ مگر علیؑ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مرکز اسلام کو بچاتے رہے۔ آج ستر کافروں کو قتل نہ کر سکے تھے تو اپنے جسم پر ستر زخم کھا لئے اور اپنی شجاعت کی سند تحسین ذوالفقار کی شکل میں خدا اور اس کے رسول سے حاصل کر لی۔

رسولؐ کے دعویداران وفا کو یہ بات پہلے سے زائد ناگوار گزری کیونکہ وہ سرفروشی کے معیار سے جس قدر گر گئے تھے، علیؑ کی منزلت اتنی ہی بڑھ گئی تھی۔ ادھر اعدائے دین کی عداوت میں اور اضافہ ہو گیا کہ علیؑ نے بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا ورنہ انہوں نے تو اسلام کا قصہ ہی ختم کر دیا تھا۔ پھر چھوٹی چھوٹی لڑائیوں میں جہاں جہاں شمشیر حیدری بے نیام ہوئی، وہاں مقتولین کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا اور علیؑ کا دائرہ دشمنی وسیع سے وسیع تر بنتا رہا۔

جنگ خندق میں کسی کو کم ہمتی اور بزدلی کی سند ملی تو کسی کو کل ایمان کا اعزاز، جس کے بعد شجاعت ایک ہی نام سے مختص ہوتی رہی۔ عرب کے شہرہ آفاق پہلوان کی بہن کے الفاظ اپنے بھائی کے قاتل کے لئے ضرب المثل بن گئے۔ پھر صلح حدیبیہ سے غزوہ خیبر تک پہنچتے پہنچتے علیؑ اطاعت نبی کے کردار شجاعت کا پیکر منجانب پروردگار بن چکے تھے اور جزو پیغمبرؐ اسلام اور شامل اسلام بھی۔

مکے میں اہل اسلام کا جو چھوٹا سا کارواں ترتیب پایا تھا اس میں آنحضرتؐ کے بعد اگرچہ علیؑ تھے اور ان کے بعد ایک بزرگ مگر علیؑ چھوٹے تھے اس لئے گنتی میں نہ لائے جاتے، سارا شرف بزرگ کا حق تھا اب کل کا بچہ سب کو پیچھے چھوڑ کر فضائل کی بلندیوں کو چھوتا چلا جا رہا تھا۔ جن لوگوں نے باہر سے اندر تک روابط کی شیرازہ بندی کی تھی۔ ان میں یقیناً خلوص تھا پھر خلوص میں رہبری کی تمنا شامل ہوئی اور اب تو ایک مملکت بھی بن رہی تھی اس لئے اس پر فرمانروائی کا جذبہ پیدا ہونا ناگزیر تھا اور بعض

نے تو اپنے کو اس منزلت پر فائز سمجھ لیا تھا اور ان پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے نوازشیں بھی ہو رہی تھیں لہذا آنحضرتؐ کے بعد سب کچھ اپنا سمجھ لینے کا خیال بے محل تو نہیں تھا۔

سوجھ بوجھ رکھنے والوں کا انداز فکر یہی تو ہوتا ہے تب ہی تو ابوسفیان نے آنحضرتؐ کے مستقبل کو ہاتھ میں لینے کی خاطر ایسے ہی تقرب کی خواہش کی تھی۔۔۔آج کی کہاوت ہے کہ ہر آدمی کی ترقی کے پس پردہ کسی عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔عرب کے جہاندیدہ بھی شاید اس نکتے کو جانتے تھے۔اسی لئے اس میں پہل کرنے والے کی کامیابی کے امکانات زیادہ روشن تھے۔ایسے میں علیؑ ماضی کے پردوں سے جھانکتے جھانکتے اچانک سامنے آ گئے تو بعض لوگوں کے دلوں میں اک آگ ہی تو لگ گئی پھر بھی انہوں نے مصلحت کے قفل لبوں پر ڈالے رکھے کہ کہیں بھانڈا پھوٹ گیا تو بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔

عرب کے ذہن کو خالق مطلق کے آخری سفیر نے اپنی پاکیزہ سیرت سے بہت کچھ سنوار لیا تھا پھر بھی صحرائیت کے نسلی اثرات دل و دماغ کے پردوں میں موجود تو تھے ہی۔مشیت نے علیؑ کو خانہ زاد بنا کر اور ہادیانہ صلاحتوں سے نواز کر بھیجا اور انہوں نے دین برحق کی نصرت میں اپنے جوہر دکھائے تو دبی ہوئی کینہ پروری اور ابھر آئی۔

بدر کے مقتولین کی اولاد پرچم اسلام کے نیچے نعرہ ہائے تکبیر بلند کر رہی تھی کہ اس کو اپنے باپ دادا کی آوازیں سنائی دیں۔''تمہاری رگوں میں ہمارا خون دوڑ رہا ہے اور تم نے ہمارے قاتل کو کھلا چھوڑ رکھا ہے۔کیا عرب کی حمیت تم میں باقی نہیں رہی،،؟ ان آوازوں نے قومی جبلت کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور انہوں نے جائزہ لینا شروع کیا تو پیغمبرؐ اسلام کے قدیم وفاداروں کو علیؑ کی عداوت میں بالکل اپنا جیسا محسوس کیا۔اس اتحاد خیالی نے اندر ہی اندر مسلمانوں میں ایک نیا مسلک پیدا کر دیا جو حضور کی محبت اور علیؑ سے دشمنی میں ہم آہنگ تھا اس طرح پس پردہ دو حلقے وجود میں آ گئے بڑا حلقہ علیؑ سے انتقام لینے والوں کا اور چھوٹا حلقہ علیؑ کو پیچھے ڈھکیل کر طالبان اقتدار کا پھر دونوں دھیرے دھیرے ایک نقطے پر باہم خلط ملط ہو گئے۔

اس کے متوازن ایک گروہ بے لوث فدائیان اسلام کا بھی تھا جو حضورؐ اور علی کا یکساں وفادار تھا۔

جنگ خیبر میں جب استیصال اسلام کی بھرپور کوشش رائے گاں گئی تو ابوسفیان کی ہمت ساتھ چھوڑ گئی مگر دشمنان علیؑ کی اندرونی سرگرمیاں اور تیز ہو گئیں۔احد سے لیکر آج تک کسی غزوہ

میں علیؑ کے علاوہ میدان کسی کے ہاتھ نہیں رہا تھا اور کوئی علیؑ کی اہلیت چھین لینے پر قادر نہ تھا اور نہ انھیں راستے سے ہٹا سکتا تھا لہذا ناکامیوں کا احساس کرب و اشتعال کو بڑھاتا جا رہا تھا۔ سریہ ذات السلاسل میں یہ انتہاء پر پہنچ گیا۔

اس لمبے وقفے میں منافقین کے ایک گروہ نے یہ فیصلہ کیا کہ بات کو جڑ ہی سے ختم کر دیا جائے۔ حضورؐ پر حملے کے منصوبے بھی بر سر عمل لائے گئے مگر وار خالی گئے جنگ موتہ کے بعد سریہ ذات السلاسل میں علیؑ کی منزلت اور بڑھ گئی پھر فتح مکہ کے بعد علیؑ کی بت شکنی نے امتیاز عرب پر ضرب کاری لگائی تو عربوں کی وطنیت تلملا اٹھی۔ کعبے کے بت اب موجب تکریم نہ رہے تھے لیکن ریگزار کی امتیازی علامت تو تھے ہی۔ یہ بات نہ جانے کیوں بعض لوگوں کو اچھی نہ لگی حالانکہ اب وہ وحدانیت ربانی کے قائل ہو چکے تھے۔

معرکہ حنین میں اگرچہ احد کی سی شرمندگی نہیں ہوئی تھی مگر پیغمبرؐ کو چھوڑ کر جنگ سے فرار ہونے کی ایک اور نظیر قائم ہو گئی تھی۔۔۔ کیا کہا جائے اس مزاج طبعیت کو کہ سبک ہوتے تھے اپنے عمل سے اور دل ہی دل میں غصہ اتارتے تھے علی پر اور تلملا کر رہ جاتے تھے۔

غزوہ تبوک کے لئے ہر لحاظ سے مکمل سازش کی گئی تھی۔ اس میں نہ صرف بنی ہاشم بلکہ پورے اسلام کا بچ سکنا مشکل تھا مگر نتیجہ برعکس نکلا علی کا شرف اور بڑھ گیا۔ آنحضرتؐ نے علیؑ سے اپنی نسبت بمنزل ہارون و موسیٰ قرار دی اور حج کے موقع پر سورہ برآت کی آیات حضرت ابوبکرؓ سے لے کر حضرت علیؑ سے پڑھوائیں تو ایک طرح کا اعلان ہو گیا کہ دینی مراحل میں اگر کوئی حضورؐ کا قائم مقام بن سکتا ہے تو صرف علیؑ، ابوبکرؓ بھی نہیں۔ اس عمل نے ہر لحاظ سے ساری امیدوں کو منقطع کر دیا اور کل کے وفاداروں نے بیوفائی کا قطعی فیصلہ کر لیا اور باہم ایک عہد کر لیا ہو کہ کچھ ہو جائے مگر علیؑ کو جانشین رسولؐ نہ بننے دیں گے۔ اسی کی آواز بازگشت انعقاد سقیفہ سے قبل مدینے کے گلی کوچوں میں سنائی دے رہی تھی کہ ابوبکرؓ و عمرؓ اور الجراح کہتے ہیں کہ کچھ ہو جائے مگر علیؑ کو جانشین رسولؐ نہ بننے دیں گے۔

حضورؐ یقیناً لوگوں کے عزائم کو بھانپ گئے تھے تب ہی تو غدیر خم میں علیؑ کی مولائیت تکمیل دین میں شامل کر دی پھر مباہلے میں امت کو بتا دیا کہ میں قرآن کے ساتھ جن اہل بیت کو چھوڑ رہا ہوں، وہ یہ اور صرف یہ ہیں۔ اس کے بعد وقت آخر آخری حجت کے طور پر دستاویزی ثبوت چھوڑ دینے کی کوشش کی مگر حضرت عمر نے جب باغیانہ رویہ اختیار کیا تو جو لوگ موجود رہ گئے تھے، ان کے

سامنے اس اعلان کو وصیت کے طور پر بیان کر دیا۔ مقصد یہ تھا کہ آپ قرآن صامت کے ساتھ قرآن ناطق بھی چھوڑ رہے ہیں۔ یہی دونوں قیامت تک امت کی رہنمائی کریں گے لیکن مفاداتی گروہ نے جو عزم محکم پہلے سے کر لیا تھا، اس پر عمل کیا گیا

لوٹ کر صحن چمن اجر وفا دینے لگے　　ہم نشین گل تھے، کانٹوں کا مزہ دینے لگے
فصل کیا بدلی کہ گویا خاک سے شعلے اٹھے　　جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

ان حالات سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کسی طرح غلط نہ ہوگا کہ لوگوں کو انتخاب کے لئے بہت پہلے سے ہموار کر لیا گیا تھا جب اس کا یقین ہو گیا کہ اب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بچنا ممکن نہیں تو حضرت ابوبکرؓ بہت ضروری کام سے جانے کا بہانہ کر کے لوگوں کو سقیفہ میں جمع ہو جانے کی ہدایت کرنے روانہ ہو گئے اور حضرت عمرؓ آنحضرت کا انتقال ہو جانے پر مسجد نبوی میں ہنٹر ہلاتے رہتے کہ جو کہے گا کہ حضورؐ رحلت فرما گئے، اس کی کھال ادھیڑ کر رکھ دیں گے۔ آپ کا یہ انداز سوق مکہ کا آزمایا ہوا تھا اور اسی پر خالد بن ولید سے ان کی لڑائی بھی ہوئی تھی۔

واقعی بڑے عاشق رسولؐ تھے حضرت عمرؓ۔ ابھی دو روز قبل اپنے محبوب پیغمبرؐ سے ہتک آمیز گستاخی کر چکے تھے۔ آج موت کی خبر پر دیوانے ہوئے جا رہے تھے۔ کل احد میں مر جانے کا اعلان سنتے ہی بھاگ کھڑے ہوئے تھے، انس بن نضر کی طرح محبت رسولؐ میں دشمنوں سے لڑتے لڑتے مر نہیں گئے تھے۔ حنین میں رسولؐ کو دشمنوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر پیٹھ دکھا گئے تھے، اس وقت نہ جانے جنون عشق میں یہ عالم کیسے ہو گیا تھا۔ شاید حضرت ابوبکرؓ کی واپسی کا انتظار تھا اور حقیقتاً بات تھی بھی یہی اور ہوا بھی ایسا ہی کہ جیسے ہی انہوں نے حضرت ابوبکر کو دیکھا تو وہ کیفیت دور ہو گئی۔ حضرت ابوبکرؓ نے آ کر سینے سے لگایا تو اطمینان ہو گیا اور ان کے ساتھ دوسروں کو لے کر وہ سقیفہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

چوں صحابہ حب دنیا داشتند
مصطفیٰؐ را بے کفن بگزاشتند
(مولانا روم)

قریش میں خفیہ خفیہ ایک اعلان نہ جانے کب سے کیا جا رہا تھا کہ بنی ہاشم اپنے کو افضل سمجھتے ہیں۔ اگر حکومت انھیں مل گئی تو کبھی کسی دوسرے کے ہاتھ میں نہیں آ سکتی۔ اس لئے شروع ہی سے اس پر قبضہ کر لیا جائے۔ موقع گنوا دیا گیا تو پھر ہماری نسلوں کو پچھتانا پڑے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ

وآلہ وسلم کے جانبر نہ ہوسکنے کا یقین ہونے پر عمل درآمد شروع ہوگیا اور حضرت ابوبکرؓ بہانہ کر کے خاص خاص لوگوں کو اطلاع دینے کے لئے چلے گئے۔

یہ غلط ہے کہ انصار سقیفہ میں انتخاب کے لئے جمع ہوئے تھے۔ ان کو تو یقین تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد علیؑ ان کے نائب ہوں گے۔ دلیل یہ ہے کہ رئیس قبیلہ سعد بن عبادہ پھر سعد بن عبادہ قیس خانوادہ رسالت کے ساتھ رہے۔ ابوایوب انصاری کے کارنامے جنگ صفین میں بیان کے محتاج نہیں اور سقیفہ میں حضرت عمرؓ کے تین دوستوں کے علاوہ کسی انصار نے بیعت بھی نہیں کی۔۔۔ تاریخ گواہ ہے کہ انصار جتنے بھی سقیفہ میں تھے ان میں سے تین چار کے علاوہ باقی حضرت ابوبکرؓ سے چند لمحے پہلے یا بعد میں پہنچے۔۔۔ یہ غلط ہے کہ حضرت علیؑ سقیفہ جاتے تو مسلمان انھیں منتخب نہ کرتے۔۔۔ مگر علیؑ دنیاوی خلافت کی خاطر مرشد برحق کی میت چھوڑ کر جاتے؟

اگر انتخاب کا انعقاد کرنے والوں کو علیؑ کے مقابلے میں ذرا سی بھی کامیابی کی امید ہوتی تو میت رسول کو پیٹھ ہی کیوں دکھاتے۔۔۔ ان کا تو بس ایک ہی مقصد تھا اور اسی کے لئے اسامہ کے لشکر کے ساتھ نہیں گئے تھے۔ رسول کی نافرمانی اور خدا کی لعنت برداشت کر لی تھی۔۔۔ مگر گئے نہیں کیونکہ چلے جاتے تو ان کی عدم موجودگی میں علیؑ جانشین پیغمبر بن جاتے اور تجہیز و تکفین کے بعد انتخاب کا التزام کرتے تو کامیاب نہ ہوتے۔ اسی ڈر سے حضرت ابوبکرؓ نے مرتے وقت اپنے بعد انتخاب کا سوال پیدا ہی نہیں ہونے دیا اور اصول شوریٰ کو توڑ کر اور احسان کا بدلہ احسان ہوتا ہے کے پیش نظر حضرت عمرؓ کو نامزد کر دیا کیونکہ ایسا نہ کرتے تو علیؑ تو نہ آتے مگر شیعان علی دنیاداروں کو دین کا جذبہ ضرور دکھا دیتے۔ مسلمان کہتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے کسی کو نامزد نہیں کیا تھا اور فیصلہ مسلمانوں پر چھوڑ دیا تھا تو پھر حضرت عمر کی نامزدگی خلافت سنت تھی اور حضرت ابوبکرؓ اس کے مرتکب ہوئے تھے وہ نعوذ باللہ رسول اللہ سے بڑے تو نہیں تھے کہ رسولؐ کے اصول کو توڑ دیا۔۔۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت تو علیؑ ختم المرسلین کی تجہیز و تکفین میں لگے ہوئے تھے۔ سب جانتے تھے کہ کچھ ہو جائے، علیؑ میت کو چھوڑ کر آنے والے نہیں اور جہاں تک دوسرے حضرات کا تعلق تھا، وہ تو اپنے نبی کو زندہ یا مردہ دشمنوں میں چھوڑ کر چلے جانے کے عادی رہے تھے۔ ان کے لئے میت کو پیٹھ دکھا دینا کوئی اہم بات تو نہ تھی۔ اس بے وفائی کی تاویل میں کبھی کبھی کہہ دیا جاتا ہے کہ دشمن کے حملے کا خطرہ تھا لہٰذا سربراہ کا انتخاب کرنے کی جلدی تھی۔ خطرہ بالکل نہیں تھا ایسا ہوتا تو اسامہ بن زید اپنے جاتے ہوئے لشکر کو روک کر چلے نہ آتے اور تدفین میں شریک نہ ہوتے۔۔۔ پھر جب دوبارہ استقرار خلافت کے بعد

لشکر بھیجا گیا تو دشمن کی فوجیں سرحد پر بھی نہیں ملیں ۔اس کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ دشمنوں کیطرف سے مملکت کو خطرہ تھا۔اموی مورخین کی اکثریت کے بقول مدینے میں منافقین بڑی تعداد میں جمع ہو گئے تھے تو حضورؐ کی تدفین سے قبل ناکامی کے خطرات محسوس کرنے کی ضرورت کیا تھا۔یقیناً شیر کی ہیبت اتنی طاری تھی کہ اس کو سقیفہ میں آنے کا موقع دینا اندیشوں سے خالی نہ تھا۔

عجیب دیدہ دلیری ہے کہ آج بدیہی حقائق سے انکار کر دیا جاتا ہے اور پورے یقین سے متفق اللفظ ہو کر کہہ دیا جاتا ہے کہ حضرت ابو بکرؓ کو قبول عام حاصل تھا۔وہ بیک آواز منتخب ہوئے تھے۔کوئی اپنے مفروضات پر زندہ رہنا چاہتا ہے تو اس کی خوشی مگر دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش فضول ہوگی۔۔۔جواباً اگر بالاعلان کہہ دیا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ سازش ،فریب ،چالاکی سے اور اپنے نجات دہندہ سے بیوفائی کر کے انتخاب کرایا گیا۔لکھا تو لگ بھگ بیشتر مورخین نے لیکن زیر نظر کامل ابن اثیر کی دوسری جلد میں خلافت کے تذکرے میں خود حضرت عمر کا بیان نقل کیا گیا ہے:۔

''سقیفہ میں بیعت کا تنازعہ شروع ہوا تو آوازیں بلند ہو گئیں اور شوروغل ہونے لگا مجھے اندیشہ لاحق ہو گیا کہ جھگڑا زیادہ بڑھ نہ جائے لہذا میں نے ابو بکرؓ سے کہا کہ اپنا ہاتھ بڑھاؤ، میں تمہاری بیعت کرلوں۔انہوں نے ہاتھ بڑھا دیا۔میں نے بیعت کر لی پھر اور لوگوں نے۔اس کے بعد میں اور میرے ساتھی سعد بن عبادہ پر ٹوٹ پڑے۔اس پر ان کے کسی ساتھی نے کہا، ارے تم نے سعد کو قتل کر دیا۔میں نے جواب دیا، خدا اس کو قتل کرے!،،

پھر مورخ نے ایک بیان اور تحریر کیا:۔

''قریب تھا کہ لوگ سعد بن عبادہ کو روند ڈالیں کہ سعد کے بعض ساتھی چیخ پڑے چھوڑ دو سعد کو، انھیں کچلو نہیں، جواباً حضرت عمرؓ بولے، سب لوگ مل کر سعد کو قتل کر ڈالو۔اس کے بعد عمر خود سعد کے سر پر چڑھ کر گرجے! میں نے طے کر لیا ہے کہ تمہیں اس طرح روند ڈالوں کہ پورا جسم پارہ پارہ ہو جائے۔سعد نے ہاتھ بڑھا کر عمر کی ڈاڑھی پکڑ لی۔اس پر عمرؓ نے کہا کہ اگر ڈاڑھی کا ایک بال بھی اکھڑا تو تمہارے سارے دانتوں کو توڑ دوں گا اور تم گھر اس طرح جاؤ گے کہ تمہارے منہ میں ایک دانت بھی نہ ہوگا۔،،

اس مقام پر یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ اکثریت سعد بن عبادہ انصاری کی تھی یا مہاجرین کی؟ پھر یہ بھی مسلم ہو جاتا ہے کہ اکثریت والے طبقے ہی نے پہلے سے لوگ جمع کر رکھے

ہوں گے اور جو سن کر چلے آئے تھے، وہ تھوڑے ہی ہوں گے۔

تاریخ طبری، روضتہ الااحباب، کتاب الامامتہ والسیاستہ، فتح الباری وغیرہ وغیرہ سب نے ایسا ہی کچھ لکھا ہے مگران سب کو دروغ گو بتا کر کتنی ڈھٹائی سے فرضی کہانیاں بیان کر دی جاتی ہیں اور اسلام کے نام پر دھبہ لگایا جاتا ہے۔ چلتے چلتے تاریخ طبری جلد ۳ کی ایک عبارت کا خلاصہ بھی عرض کر دیا جائے تو بے محل نہ ہوگا۔

حضرت عمرؓ نے جب سعد بن عبادہ کو چھوڑا تو سعد نے کہا۔

''خدا کی قسم، اگر میں بیمار نہ ہوتا اور اتنی قوت بھی ہوتی کہ خود اٹھ سکتا تو مدینے کے گلی کوچوں میں تم میری اتنی ہیبت ناک گرج سنتے کہ تم اور تمہارے ساتھی مارے دہشت کے سوارخوں میں گھستے پھرتے ا خدا کی قسم میری صحت درست ہوتی تو میں تم کو ان لوگوں میں شامل کر دیتا، کبھی جن کی رعایا بن کر تم رہتے تھے اور پھر تم سرداری کی طرف دیکھ بھی نہ سکتے لیکن میرے مرض نے مجھے مجبور کر دیا ہے۔

اس کے بعد سعد کے ساتھی انھیں اٹھا لے گئے۔

سعد نے چند لفظوں میں اپنی اور ان سب کی سماجی حیثیت کو بتا دیا تھا۔ اس کے بعد کسی مورخ کا یہ کہنا کہ حضرت ابو بکرؓ مکے میں باعزت اور حضرت عمرؓ اپنے قبیلے کے منصب دار تھے، کس حد تک صحیح ہو سکتا ہے اور یورپ کے مورخ فلپ ہٹی کے تبصرے پر عقیدت مندوں کے چراغ پا ہونے کی گنجائش نہیں رہتی۔

آخر میں ابن اثیر اور دوسرے مورخوں کے بیانات کا لب لباب حرف آخر کا درجہ رکھتے ہیں۔ انصار نے کہا۔ ''ہم تو علی کے سوا کسی کی بیعت نہیں کر سکتے۔ حضرت علیؑ، بنی ہاشم زبیر وطلحہ سب نے ابو بکرؓ کی بیعت سے انکار کر دیا۔ زبیر نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ جب تک علیؑ کی بیعت نہیں کی جائے گی، میں اپنی تلوار نیام میں نہیں ڈالوں گا۔ اس پر حضرت عمرؓ نے کہا کہ زبیر کی تلوار چھین کر پتھر پر پٹک دو۔ اس کے بعد ان لوگوں کو غلبہ کر کے گرفتار کر لیا گیا۔،، مہاجر اگر تھوڑے تھے تو غلبہ کس طرح حاصل کیا۔۔۔؟

ابوسفیان کا شمار بھی بیعت نہ کرنے والوں میں شامل تھا اور اسی پر موقوف نہیں، مورخین کی اکثریت کے بقول انصار کی بڑی تعداد اور مہاجرین کے شرفاء میں سے کسی نے حضرت ابو بکرؓ کو خلیفہ نہیں مانا۔ طبری نے اپنی تیسری جلد میں ابوسفیان کے الفاظ نقل کئے ہیں۔

''ابوسفیان نے حضرت علی سے کہا: اس خلافت کی کیا گت بن گئی ہے کہ قریش کے سب سے حقیر خاندان میں پہنچ گئی۔ علی تم چاہو تو خدا کی قسم، تمہاری حمایت میں مدینے کو سواروں اور پیدلوں سے بھر دوں؟''

ابوسفیان کا نسلی تفاخر اس کے الفاظ کو غلط قرار نہیں دے سکتا اور ہوس اقتدار کو بھی چھپا نہیں سکتا۔ علیؑ اس کے ضمیر کو پیشانی کی لکیروں میں پڑھ چکے تھے لہذا آپ نے انکار کر دیا۔ کنز العمال مدارج النبوہ، مشکواہ، صحیح بخاری اور فتح الباری وغیرہ سے حضرت علیؑ کا موقف واضح ہوتا ہے:۔

''علی! جب دیکھنا کہ لوگوں نے دنیا اختیار کر لی ہے تو تم آخرت ہی اختیار کیے رہنا!''

یہ وصیت ارباب سقیفہ کے علم میں تھی۔ وہ جانتے تھے کہ علیؑ آنحضرتؐ کی ہدایت سے سرتابی نہیں کر سکتے اسی لئے وہ عمائدین مدینہ کی مخالفت، آل محمدؐ کے اثرات اور علیؑ کی تلوار سے لرزہ براندام ہونے کے باوجود مطمئن تھے کہ علیؑ میدان میں نہیں آئیں گے پھر بھی اندر ہی اندر خوف و دہشت محسوس کرتے ہوئے دیدہ دلیری سے سب کچھ کرتے رہے۔

اس سلسلے میں امام غزالی کا تبصرہ صفحہ ۲۰۸ بھی علیؑ کے موقف اور حقائق کو بے نقاب کرتا اور بعد کے قلمکاروں کی ملمع سازی کا پردہ فاش کر دیتا ہے۔ (۳۱) مگر دلائل کتنے بھی دیئے جائیں، فیصلہ نہ ماننے کا ہے تو کوئی مانے گا نہیں اور چودہ سو سال میں تو پست کو بالا اور بالا کو پست کر دیا گیا ہے اور عقائد موروثی بن چکے ہیں ایسی کوئی کوشش فضول ہی ہو گی لیکن چاند پر خاک ڈالنے کی سعی پیہم دیکھ کر خاموش رہنا بھی دین سے غداری ہے اس لئے اسلام کا ڈھانچہ بدلنے کی جو تاریخی مساعی کی گئی ہیں، انھیں سامنے لانا تقاضائے حق پرستی ہے اور خلافت کے بعد اصل حقداروں پر جور و ستم کی داستانوں کو دہرانا بھی فرض عین ہے۔ اس سلسلے میں خلافت اول کی تسخیری مہمات کا آغاز جس طرح ہوا اس کو حافظوں میں تازہ کرنا سوتوں کو جگانے کے برابر ہوگا۔

خلافت سازی کی اساس

علیؑ کی دشمنی اور فرمانروائی کی آرزو میں اصحاب رسولؐ کی کارگزاریوں کو نظر انداز کر کے حصول خلافت اور استقرار خلافت کے لئے جو کچھ ہوا اس کے بعض موٹے موٹے نکات اجمالاً بیان کئے جاتے ہیں۔

ایک مکمل اور مضبوط گروہ بندی، تشکیل خلافت کے لئے بعض اصول کی تخلیق اور ان کا وضع جواز، اصل حقداروں کے لئے ایسا ماحول پیدا کرنا کہ وہ اپنے مسائل میں الجھ جائیں اور حصول اقتدار کا حوصلہ کرنے کے لئے قابل نہ رہیں، باقی مخالفین اور صداقت پسندوں پر زر و جواہر کی بارش اور ظلم و تشدد کے ہر حربے کا استعمال۔۔۔!

گروہ بندی اور اس کے اسباب حضورؐ کے مختصر زندگی نامہ میں تحریر کئے جا چکے ہیں۔ خلافت کے جواز میں شوریٰ کی ایک آیت لی گئی کہ تم اپنے معاملات میں باہم مشورہ کر لیا کرو۔ عربوں کا قبائلی نظام سب کے سامنے تھا اور ذہنوں سے ہم آہنگ بھی۔ اس کو بروئے کار لانے کے لئے کہہ دیا گیا کہ آپ نے کسی کو اپنا جانشین نہیں بنایا۔ حضورؐ نے لکھنے کا سامان مانگا تھا تو اسی لئے نہیں دیا گیا کہ جانشین نہ بنانے کی بات کہی نہ جاسکے گی پھر یہ خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں بعد میں لکھ کر نہ دیدیں تو کسی نے گستاخانہ لہجے پر حضورؐ پر ہذیان کی تہمت رکھ دی تا کہ بعد میں لکھیں بھی تو ہوش و حواس میں نہ لکھنے کا بہانہ کر دیا جائے۔

کسی کو جانشین نہ بنانے کے اعلان کو فکر کی میزان پر تولنے سے وہ تمام حدیثیں ابھر کر سامنے آجاتی ہیں جو حضرت ابوبکر اور حضرت عمرؓ کے فضائل میں بیان کی گئی ہیں اور صحیحین کے ابواب کی زینت ہیں۔ حضرت علی کے لئے ارشادات نبوی کو تو نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور کہہ دیا جاتا ہے کہ وہ سب جھوٹی ہیں لیکن حضرت ابوبکر کی امامت نماز کو بہت اچھالا جاتا ہے کہ حضور ان کو نماز پڑھاتے دیکھ کر خوش ہوتے رہے اور کئی حدیثوں میں تو یہ بھی ہادی برحق کی زبان سے کہلوایا گیا ہے کہ مردوں میں سب سے زیادہ ابوبکرؓ کو پھر عمرؓ کو اس کے بعد عثمان و ابوعبیدہ الجراح کو چاہتے تھے اور عورتوں میں عائشہ سے زائد کوئی عزیز نہ تھا۔

حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے ذاتی فضائل میں انھیں اپنے بعد کا درجہ بھی دیا ہے۔ اس کے بعد یہ کہنا بنیادی طور پر غلط تھا کہ کسی کو جانشین نہیں بنایا جبکہ ایک حدیث یہ بھی ملتی ہے کہ ابوبکر اور ان کے بیٹے کو بلواؤ تا کہ انکے حق میں وصیت کر دی جائے۔ ام المومنین عائشہ سے یہ روایت بھی ہے کہ حضرت علی کے لئے کوئی وصیت نہیں کی۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ ان حدیثوں کے باوجود سقیفہ کا التزام کیوں کیا گیا اور آخری وقت میں اپنے نجات دہندہ سے ایسی بے وفائی کیوں کی گئی جس کی نظیر تاریخ عالم میں دوستوں کی طرف

سے نہیں ملتی؟

اس سے اگر یہ نتیجہ اخذ کیا جائے کہ اس وقت تک احادیث کا ایسا کوئی مواد موجود نہیں تھا، سب کچھ خلافت شام میں سامنے آیا جو بھی موجود تھا، وہ علیؑ کے لئے تھا لہذا اس کو جھٹلا دیا گیا اور کہہ دیا گیا کہ کسی کے لئے کوئی وصیت نہیں کی۔

حقائق کو غیر جانبدار ہو کر دیکھا جائے تو بعد رسول حصول اقتدار کے لئے جو بھی عمل میں آیا، وہ کسی بادشاہ کا جانشین بننے کے لئے کیا جاتا ہے۔

خلافت سازی کے لئے ایک معاہدے کا سراغ چھان بین سے ملتا ہے۔ لیکن راستی فتنہ انگیز بن جانے کے خوف سے اسے نظر انداز کرتے ہوئے صرف حضرت معاویہ کا ایک خط بنام محمد بن ابی بکر بالاختصار درج کیا جاتا ہے۔

''رسول اللہ کے بعد تمہارے باپؓ اور فاروقؓ نے علیؑ کا حق چھیننا تھا اور ان کو مصائب میں مبتلا کیا تھا پھر ان کے قتل کا ارادہ بھی کیا تھا اور ہم بھی اس میں شریک رہے تھے۔ اگر یہ بات اچھی نہیں تھی تو پہلے تمہارے باپ ہی نے ایسا اقدام کیا۔ اب تم کو اختیار ہے کہ اپنے باپ پر عیب لگا دیا خاموش رہو۔''

(مروج الذہب مسعودی، برحاشیہ کامل ابن بشر درحال معاویہ کتاب فضائل فی محاسن مصر، قاہرہ مولف ابن حجر عسقلانی)

دوستوں کے عمل کا سرسری تجزیہ کیا جائے تو دوستی کا اعتبار بیوفائی کا ماتم کرتے نظر آتا ہے۔

پیغمبرؐ برحق کی اولاد کو اقتصادی مشکلات میں مبتلا کرنے کے لئے حضرت ابوبکرؓ نے ایک حدیث گھڑ ڈالی کہ آپؐ نے مجھ سے کہا تھا ''ہم انبیاء اپنی میراث نہیں چھوڑتے جو کچھ ہوتا ہے وہ قوم پر صدقہ ہوتا ہے۔'' اس حدیث کی شہادت ام المومنین عائشہؓ نے دی۔ اس طرح خیبر کے یہودیوں نے فدک کی آدھی زمین جو ذاتی طور پر حضورؐ کو نذر کی تھی اور جس کا ہبہ نامہ آپ نے اپنی بیٹی فاطمہ زہراؑ کو لکھ کر دیدیا تھا اور شہادت میں بعض صحابہ کے دستخط بھی کروادئے تھے اس کو ضبط کر لیا گیا اور جب حضرت فاطمہ زہراؑ نے جا کر اس کا مطالبہ کیا تو مبینہ حدیث بیان کردی گئی۔ رسول کی عظیم المرتبت بیٹی نے بھرے دربار میں استدلال کیا تو لاجواب ہو کر حضرت ابو بکر نے لکھ کر دیدیا۔ اہلبیت کو اقتصادی مشکلات میں مبتلا کرنے کے لئے حضرت ابوبکر نے جھوٹی حدیث تو ریث گھڑی تھی اس لئے کہ وہ فدک کو وراثت کا مسئلہ سمجھتے تھے جناب سیدہ نے جو وثیقہ دربار خلافت میں

اپنے مطالبے کے حق میں پیش کیا تھا وہ ہبہ نامہ تھا جو رسول نے بحکم قرآن اور بحکم خدا تحریر کر کے جناب سیدہؑ کو بطور حق ذوالقربیٰ دیا تھا اسی ہبہ نامے سے یہ بھی منکشف ہوا کہ باغ فدک کا مسئلہ وراثت کا نہیں تھا بلکہ ہبہ نامے کی رُو سے وہ جناب سیدہ کی ملکیت میں آ چکا تھا۔ اور تین سال سے جناب سیدہ کے تصرف میں تھا۔ حضرت ابوبکر اس ہبہ نامے کو غور سے پڑھ کر اور اس پر شہادت میں بعض صحابہ کے دستخط دیکھ کر جناب سیدہ کی اس ملکیت کے قائل ہو گئے تھے اور ان کو لکھ کر دینے کے لئے تیار تھے لیکن حضرت ابوبکر کو ایسا کرنے سے روک دیا گیا اور ہبہ نامہ جناب سیدہ سے چھین کر پھاڑ ڈالا گیا۔

وثیقہ اس لئے پھاڑا گیا بہ مکر و ریا
فدک کو سمجھے تھے وہ مسئلہ وراثت کا
پڑھا وثیقہ تو وہ امر ملکیت نکلا
اسی سے پھوٹا ہے جعلی حدیث کا بھانڈا
معاملات کی گہرائی پر نظر ہی نہ تھی
انھیں رسول کے اقدام کی خبر ہی نہ تھی

(شاداںؔ دہلوی)

علامہ حلی نے لکھا ہے۔

''حضرت ابوبکرؓ نے حضرت فاطمہؑ کو فدک کا وثیقہ لکھ دیا تھا اتنے میں حضرت عمرؓ وہاں پہنچ گئے اور پوچھا یہ کیا ہے؟ حضرت ابوبکرؓ نے بتایا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جو میراث فاطمہؑ کو پہنچتی ہے اسی کے بارے میں یہ وثیقہ میں نے انھیں لکھ دیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے کہا پھر تم مسلمانوں پر کس چیز سے خرچ کرو گے؟ کیا تم نہیں دیکھتے کہ عرب اب تک تم سے جنگ پر آمادہ ہیں یہ کہہ کر انہوں نے وہ وثیقہ ان سے چھین کر چاک کر ڈالا،، (۳۲)

سبط ابن الجوزی نے بھی ایسا ہی کچھ لکھا ہے۔ مثال کے طور پر اس واقعہ کا حوالہ دیدیا گیا۔

غور طلب یہ امر ہے کہ حضرت ابوبکرؓ تنہا حدیث توریث کے راوی ہیں۔ وثیقہ لکھ کر انہوں نے اپنی مبینہ حدیث کی تردید کر دی اور یوں بھی آدم سے لیکر عیسیٰ تک کسی نبی کی اولاد وراثت سے محروم نہیں رہی تو محرومی صرف ختم المرسلین کی بیٹی کے لئے کیوں مختص تھی؟ شاید ذہن میں یہ رہا ہو کہ جانشینی کا اطلاق بھی نبوت پر ہوتا ہے جبکہ ہر نبی کی اولاد نبی نہیں ہوئی اور یوں بھی نبوت کوئی دنیاوی شے نہیں

ہوتی اس کا انحصار تو مشیت ایزدی پر ہے دنیا کے معاملات بالکل الگ ہیں۔

ایک آیت بھی ہے جو ترکہ ماں باپ یا رشتہ دار چھوڑ کر مریں تو ہم نے مرنے والے کے وارثوں کے حق مقرر کردیئے ہیں (پارہ ۵ ع ۳)

آنحضرتؐ کا ارشاد اس پر مستزاد ہے۔

''تم اگر اپنے وارثوں کو مالدار چھوڑ کر جاؤ تو انھیں غریب چھوڑنے سے بہتر ہے تا کہ وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے نہ پھریں،، (۳۳)

دوسروں کے لئے تو حضورؐ کا یہ نظریہ تھا مگر اپنی اولاد کے لئے کیا فرما گئے جس کی نظیر سنت پیغمبریؐ میں بھی نہیں ملتی۔ کیا قصور کیا تھا فاطمہ زہراؑ نے کہ باپ کا نام تو خانہ پدری میں ملا لیکن باپ کی وراثت سے محروم رہیں جبکہ ان کا لقب تھا سیدہ النساء عالمین مگر ساری دنیا کی عورتوں کو تو ترکے میں حصہ ملتا ہے، بنت رسولؐ اس کی حقدار بھی نہ رہی تھیں۔ انجام بہرطور یہی ہوا کہ رسولؐ نے محروم کیا ہو یا نہ کیا ہو لیکن آپؐ کے جانشین نے محروم کردیا حالانکہ اتنی تکلیف نہ کی جاتی اور فدک کی جاگیر دے بھی دی جاتی تو علیؑ یا فاطمہ زہراؑ کچھ اپنے لئے رکھنے والے تو نہ تھے جو بھی آتا وہ غرباء و مساکین کو مل جاتا۔ جو لوگ روزہ افطار کرنے بیٹھتے اور کوئی سائل آجاتا تو اپنے اپنے حصے کی روٹی اس کو دیدیتے اور خود پانی سے افطار کرنے پر اکتفاء کرتے، وہ فدک کی آمدنی اپنے لئے کیا رکھتے!

لیکن اقتصادی مار مصلحت خلافت میں داخل تھی جو دی گئی، خود حضرت عمرؓ کا ایک قول اس سلسلے میں پایا جاتا ہے۔

''جب ابوبکرؓ نے اس روایت کو بیان کیا تو علیؑ اور عباس نے ان کو جھوٹا، گنہگار اور خائن ٹھہرایا،، (۳۴)

حقیقت بھی یہ ہے کہ اگر اس روایت کو صحیح مان لیا جائے تو حرمت پیغمبرؐ پر حرف آتا ہے کہ ایک طرف بیٹی کو ہبہ کردیا دوسری طرف حدیث بیان کردی اور کوئی صاحب عصمت تو ایسا کر ہی نہیں سکتا لہذا حضرت علیؑ کو صدیق اکبر سمجھنے والے بعض مورخین اتفاق کرتے ہیں کہ روایت قابل اعتبار نہیں ہے جبکہ حضرت عثمان نے اس کو مال مسلمین رہنے نہ دیا۔ عمرؓ بن عبدالعزیز نے بنی فاطمہؑ کو واپس کردیا۔ یزید بن عبدالملک نے چھین لیا۔ ابوالعباس فتاح نے آل رسول کو دیدیا۔ اس طرح یہ جاگیر آتی جاتی رہی اور آخر میں متوکل نے اپنے خجام کے حوالے کردیا۔ اس طرح رسولؐ کی ہبہ کی ہوئی چیز اعتبار و بے اعتباری کے مرحلوں سے گزرتی رہی مگر حضرت ابوبکرؓ کا جو مقصد تھا وہ تو پورا ہو

ہو گیا اور بنت پیغمبرؐ کو صرف شوہر کی محنت مزدوری سے کمائے ہوئے معاش پر قناعت کرنا پڑی۔۔۔ کیا یار غار ودوستی کا حق یوں ہی ادا کرتے ہیں کہ دوست کے بعد اس کی اولاد پر ستم کی بجلیاں گرادیں۔

دنیا کی ریت ہے کہ ہمسایہ اگر مرجائے تو پاس پڑوس کے لوگ اس کے بچوں کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرتے اور کہتے ہیں کہ مایوس نہ ہو وہ نہیں رہے تو ہم تو موجود ہیں ہمیں مرحوم کی جگہ پر سمجھو۔ کوئی کچھ کرے یا نہ کرے مگر کہا یہی جاتا ہے صادق وامین مکہ کے ساتھیوں کو عرب کی حمیت کا بھی خیال نہیں آیا۔ تالیف قلب کے بجائے دشمنی کا وہ کردار ادا کیا جس کی نظیر تاریخ عالم میں ملنا مشکل ہے۔ کل تک جس دروازے پر حاضری دینا موجب فخر سمجھتے تھے آج اسی پر یلغار کردی۔ شیر زندہ تھا لیکن اس کے پیروں میں مشیت ووصیت کی زنجیریں پڑی ہوئی تھیں لہذا صحرائی بھیڑیے شیروں کی کھالیں اُوڑھ کر حملہ آور ہو گئے۔

مظالم کی داستانوں میں ملیکۃ العرب کی بیٹی کا گھر جلانے کو بہت اہمیت حاصل ہے جس میں ہادی اسلام کا نسلی اثاثہ شعلوں کی زد پر آ گیا تھا مگر صرف سیدہ عالمیان کے پیٹ کا بچہ شہید ہوا۔ باقی سب بچ گئے۔۔اب اس واقعہ کو جھٹلایا جاتا ہے مگر بے شمار تاریخی شہادتوں میں سے کس کس کو جھٹلایا جائے گا۔

فاتح خیبر وخندق کے لئے یہ موقعہ بڑا صبر آزما تھا مگر آپ نے ہر قدم پر کردار پیغمبری ادا کیا اور میزان ضبط وتحمل پر منصب امامت کو تولتے رہے۔ بنت رسول صلواۃ اللہ علیہا کے وقار کا مجروح ہونا عام مسلمان بھی برداشت نہ کرسکتا نہ کہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسلام کی حفاظت کرنے والا اور حضرت ابو طالب کی سیرت کا ورثہ دار لیکن آج انھیں بساط امامت پر سیرت پیغمبریؐ پیش کرنا تھی لہذا ظلم کا ہر وار عیسیٰ مریم کی طرح سہتے رہے اور بزدلوں کے ہاتھوں گلے میں رسی بندھوا کر بھی ابرو پر شکن نہ پڑنے دی۔

حیرت ہوتی ہے رسولؐ کے برگزیدہ صحابیوں پر کہ بازوں میں وہ سکت موجود تھی جس نے آگے چل کر صفین میں منافقین کے پرے کے پرے تہہ وبالا کردیئے مگر نبی ختمی مرتبت کے جانشین کی بے بسی کو دیکھ کر دم بخود رہے۔ قہر کی کوئی نگاہ خونخوار بھیڑیوں کی طرف اٹھ جاتی تو اپنے کو سنبھال کر مشیت کی پابندیوں میں جکڑے ہوئے صنم اسلام کی طرف دیکھنے لگتے اور تشدد کی بساط پر رفعت ایمان کی منزلیں طے کر جاتے۔

قیام حکومت کے لئے صرف اتنا ہی نہیں کیا گیا بلکہ خالد بن ولید نے سواروں کا ایک دستہ مسجد نبوی میں لاکر ٹھہرایا، جس کا اہتمام پہلے سے کرلیا تھا۔ اس کی موجودگی میں اہالیان مدینہ باری باری بلائے گئے اور تلواروں کی چھاؤں میں ان سے بیعت لی گئی۔ دوسری طرف ناپختہ ذہن کے لوگوں پر زر و جواہر کی بارش کی گئی اور علیؑ کی خاموشی نے بے چارگی کی ایسی فضاء پیدا کردی کہ اکثریت نے نہ چاہتے ہوئے بھی بیعت کرلی اور وقت کی تدریجی ترقی کے ساتھ خلافت کا استحکام بڑھتا رہا۔

حضرت ابوبکرؓ نے نظام شوریٰ کا سہارا لے کر استقرار خلافت کیا تھا لیکن اپنے مرنے سے قبل حضرت عمرؓ کو نامزد کردیا۔ ارباب خلافت کے بقول حضورؐ نے کسی کو خلیفہ نہیں بنایا تھا۔ سب کچھ اللہ اور مسلمانوں پر چھوڑ دیا تھا مگر حضرت ابوبکرؓ نے دونوں کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لئے اور وقت آخر سنت رسولؐ کی خلاف ورزی کے مرتکب بھی ہوگئے۔

حضرت عمرؓ کا عہد زریں فاتحین عالم کی تاریخ میں یادگار ہے۔ انہوں نے تسخیر ممالک کے سیلاب میں جہاد فی سبیل اللہ کے معنی ہی بدل دیئے اور اصول اسلام میں اتنی تراش وخراش کی کہ دین کی شریعت میں ماہ صیام کے دوران پیغمبر برحق کے بجائے انھیں کا سکہ چلتے محسوس ہوتا ہے اور اکثر مقامات پر اصول اسلام میں ان کی ترمیم سے اکثر بے چارے اور بے بس لوگوں کی جانیں بچانا مشکل ہوجاتا ہے۔ پھر بھی داغ دھبوں کے باوجود ان کے دور کے اسلام کا چہرہ پہچانا جاسکتا ہے جس کی شکل دمشق پہنچ کر ناقابل شناخت بن گئی۔

حضرت ابوبکرؓ نے شوریٰ کے نام سے تخت خلاف کی تزئین کی تھی مگر مرتے وقت نہ انھیں سورہ شوریٰ یاد رہا اور نہ صحرا کا قبائلی نظام۔ انہوں نے کسی مطلق العنان کی طرح اسلام کا مستقبل جس کو چاہا، اس کے حوالے کردیا، حضرت عمرؓ نے شوریٰ کے نام پر ایسی قیود عائد کردیں کہ خلافت اسی کو ملے جس کو وہ چاہتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ علیؑ نے ہر ظلم وستم برداشت کرلیا لیکن بیعت نہیں کی تو سیرت شیخین پر عمل کرنے کی شرط کیا مانیں گے۔ انجام وہی ہوا سنت شیخین سنت رسول سے اتنی مختلف تھی کہ علیؑ نے صرف سنت رسولؐ پر عمل کرنے کی حامی تو بھری مگر کسی دوسرے کے اصول کو ماننے سے انکار کردیا اور خلافت حضرت عمرؓ کے بعد حضرت عثمانؓ کو مل گئی۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ ممکن اختصار کے ساتھ لکھا جاچکا ہے اور وہ منظر بھی پیش کیا جاچکا ہے جس میں حضرت عثمان کے بعد حضرت علیؑ کی خلافت کا اتار چڑھاؤ نظر آتا ہے اور کوفے پر دمشق

کی یورش کے خاکے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ بنی امیہ کے مایہ ناز بیٹے نے کس طرح بنی ہاشم کے وقار پر ضرب کاری لگائی۔ معاویہ کی سیاست نے کیونکر علیؑ کی صداقت پر پشت سے وار کیا؟ ان سب کے خاکوں سے ایک اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ سقیفہ کی بساط خلافت حضرت علیؑ کے لئے نہ تھی اس کے تسلسل میں تو معاویہ کا نام ہی زیب دیتا تھا۔

اسلام کی اشاعت کے لئے حضورؐ کی حیات طیبہ کی صراط مستقیم مقصدی طور پر پیش کی گئی تھی کہ اس پر منزلت صحابہ کا جائزہ لیا جاسکے لیکن سخت مایوسی ہوئی جب غزوات عظیم کی تسخیر میں اس بوڑھے سامی کی یادگار کے سوا کوئی سر فہرست نظر نہ آیا، جس کے سایہ عاطفیت میں حضور پروان چڑھے تھے اور جس کی سرپرستی میں حضورؐ کے دین کی جڑیں مضبوط ہوئی تھیں اور جس کے جانشین کی قوت کے بل پر اسلام نے مدینے پہنچ کر انگڑائی لی تھی۔ اگر بعض زرخرید مورخین کے بیانات کو تسلیم کرلیا جائے تب بھی غزوات اسلام میں کسی صحابی کا کوئی کارنمایاں ثابت نہ کیا جاسکے گا۔

مکے سے مدینے کی طرف ہجرت بظاہر حضورؐ کی صداقت کا معجزہ ہے جس سے متاثر ہوکر دور کے رہنے والے حضورؐ کی حفاظت کی خاطر کفار قریش کی دشمنی مول لینے کو تیار ہوگئے تھے۔ ابو طالب کے سفر آخرت کے بعد اگر یاران وفادار اور جرات و دلیری کے نام نہاد کرداروں میں ذرا بھی دم خم ہوتا تو بطحیٰ کی وادیوں میں آنکھ کھول کر جوان ہونے والا آبائی وطن کو ہمیشہ کے لئے چھوڑنے پر کیوں تیار ہوتا اور حضورؐ کے پسینے پر خون بہا دینے کے مدعی اور اپنی شجاعت پر کھلے خزانے پہلی نماز ادا کرنے کے دعویدار، قبیلے کے تھوڑے سے آدمی ہی حفاظت پیغمبرؐ کے لئے لا سکتے تو اتنا ہی ہوجاتا کہ انھیں گھر کے اندر محفوظ رہنے کا امکان نظر آتا پھر کسی طرح ترک وطن نہ کرتے مگر صورت حال تو یہ تھی کہ حضرت ابوبکرؓ کے والد ماجد ابوقحافہ ہی فتح مکہ کے بعد ۸ھ میں مجبوری اسلام لائے تھے۔ ان حالات میں فلپ ہٹی اور ابوسفیان کے تبصرے پر عقیدت مندوں کا برہم ہونا حق بجانب معلوم نہیں ہوتا اور عمائدین مکہ کے سامنے ان حضرات اور قبائل کے اعزاز کا تذکرہ کہانی سے زائد سمجھا نہیں جا سکتا۔ حقیقت بہر طور یہی ہے کہ اسلام سے وابستگی کے طفیل یہ حضرات جانے پہچانے گئے۔ بزم رسول میں جگہ پا جانے کے صدقے میں خود اہل مکہ کو ان کے ناموں سے واقفیت ہوئی اور ان کے شرف صحابیت کی بدولت ان کے آباء و اجداد کے نام منظر عام پر آئے۔

یقیناً ان میں سے کسی کے خلوص پر شبہ نہیں کیا جاسکتا مگر علیؑ دشمنی اور مملکت میں بعد رسولؐ جگہ پانے کی آرزو نے اندھا کر دیا لیکن سوال یہ ہے کہ اس میں علیؑ کا قصور کیا تھا۔ خالق مطلق نے

انھیں جو صلاحیت عطا کی تھی، اس کو اگر وہ تحفظ اسلام میں صرف نہ کرتے تو کون کرتا؟ احد میں سب چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ خندق میں عمرو ابن عبدود کی للکار پر جسموں میں لرزہ پیدا ہو گیا تھا۔ خیبر میں لڑ کر دیکھ چکے تھے۔ مقابلہ کسی کے بس کا نہ تھا۔ حنین میں تیروں نے جسموں کو چھلنی کر دیا تھا۔ وادی الرمل میں موت کا اندیشہ تھا اور جان ہے تو جہان ہے اس لئے سب نے جانیں بچالیں۔ اس کے نتیجے میں کیا ان کا علیؑ دشمن بن جانا انسانی زاویہ نگاہ سے بھی رد انہیں ہو سکتا!

رسولؐ نے ان ناکامیوں اور کوتاہیوں پر کسی کو کچھ نہیں کہا البتہ یہ تمام مراحل جس نے سر کیے، اس کو خدا اور رسولؐ کی طرف سے شرف و اعزاز بخشا گیا اور اسی کو دینی فرائض کی انجام دہی میں پیغمبرؐ کی جگہ لینے کا اہل بھی سمجھا گیا لہذا سورہ برات کی تلاوت کا منصب حضرت ابو بکرؓ سے لے کر اس کو عطا کر دیا گیا۔ اس میں مشیت ایزدی بھی تھی اور مرضی رسالت بھی۔ ایسے ان گنت مواقع رسولؐ کی زندگی میں آئے اور دیکھنے والوں نے دیکھ لیا کہ علیؑ ہی ہادی کائنات کے بعد آپ کی جگہ لے سکتے ہیں۔ کل کے بچے کی منزلت آج بزرگوں سے برداشت نہ ہو سکی اور انہوں نے طے کر لیا کہ کچھ ہو جائے، علیؑ کو مملکت اسلامیہ کا سربراہ ہونے نہ دیں گے۔

رسولؐ نے دعوت ذی العشیرہ میں اعلان اسلام کے ساتھ علیؑ کا بازو تھام کر بتا دیا تھا ''یہ میرا بھائی میرا وصی اور میرا خلیفہ ہے،، شب ہجرت سوتے میں بھی اسی کو رسولؐ سمجھا گیا تھا۔ کعبہ کی بت شکنی میں بھی اسی کو شریک کار بنایا گیا۔ ہارون جس طرح نبوت میں موسیٰ کے نائب تھے حضورؐ نے علیؑ کو اسی طرح اپنے سے نسبت دی تھی۔ اس طرح مختلف موقعوں پر کبھی بالا علان کبھی اشاروں کنایوں میں ظاہر کرتے رہے کہ آپ کی جگہ لینے کے لائق علیؑ اور صرف علی ہیں۔ آغاز اسلام میں بھائی وصی اور خلیفہ کہہ دیا لہذا دین کی تکمیل پر بھی کہہ دیا'' میں جس کا مولیٰ ہوں علیؑ بھی اس کے مولیٰ ہیں، اب اور کیا کرتے حجت تمام کرنے کے لئے وقت آخر بھی چاہا تھا کہ لکھ کر دیدیں مگر حضرت عمرؓ نے لکھنے نہیں دیا۔۔۔ حالانکہ لکھ دیدیتے تب بھی نہ ماننے والے ماننے کے نہیں تھے، فدک کی جاگیر کا نوشتہ نوچ کر پھینک ہی دیا گیا تھا۔

رہبر صادق نے اپنی حد تک کوئی بات تصفیہ طلب چھوڑی نہیں تھی لیکن جاہ طلبی کی دیوانگی نے اور فتانت عرب کی کرشمہ سازی نے کچھ چلنے نہ دی اور جو سوچا تھا، وہ کر دکھایا۔۔۔ جھوٹ اس حد تک بولا گیا کہ سچ ماند پڑ گیا اور جب یہ جادہ عمل زمان و مکان کی حدوں کو توڑتا ہوا شام تک پہنچا تو حضرت معاویہ نے اس کو اتنا مزین کر دیا کہ آج اس کی زرق برق ہی کو دین محمدؐ سمجھا جاتا ہے۔

حضورؐ کی حیات طیبہ کے مبینہ خاکے میں صحابہ کی کوئی فضیلت پایہ ثبوت کو نہیں پہنچتی پھر بھی تاریخوں میں مسلسل قصیدہ خوانی کی گئی ہے۔اس کی جو حقیقت ہے اس کو اگلے صفحات میں واضح کیا جائے گا، سر دست نافرمانی بیوفائی اور منزل ایمان کے چند مشہور حوالے پیش کئے جاتے ہیں۔

جنگ احد کا فرار سر فہرست ہے۔ اگر کسی جنگ میں کسی فریق کے کچھ لوگ اچانک بھاگنے لگیں تو باقی دل شکستہ ہو جاتے ہیں، ان کے پاؤں خود بخود اکھڑ جاتے ہیں۔۔۔ اگر دو فریقوں کی میدان داری میں کسی فریق کے ساتھ دوست نما دشمن شامل ہوں تو وہ مخالف فوجوں کے لئے کسی محاذ کو جان بوجھ کر کمزور کر دیتے ہیں یہ دونوں باتیں احد میں وقوع پذیر ہوئیں۔

حضرت ابو بکرؓ اور ابو عبیدہ الجراح نے شہادت رسول کا اعلان سنتے ہی پیٹھ دکھا دی۔ شاید وہ صرف زندگی اور کامیابی کے ساتھی تھے اور اسلام سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا، جس کو بچانے کے لئے بعد رسول بھی ٹھہر جاتے۔۔۔ مگر رسولؐ کے زندہ ہونے کی خبر سن کر فوراً پلٹ پڑے، خبر نہ ملتی تو ممکن تھا، پلٹتے ہی نہیں۔

قتل کی آواز کانوں میں پڑتے ہی حضرت عمرؓ نے تلوار پھینک دی کہ اب لڑنے سے کیا فائدہ! مستقبل کی کامیابی کی ہر امید ختم ہو گئی تھی اور اسلام کو زندہ رکھنے کا فرض ان پر عائد نہیں ہوتا تھا لہذا لڑ کر کیا کرتے۔۔۔ جس کا فرض تھا، وہ اس وقت بھی سینہ تانے کھڑا رہا اور بعد میں بھی بساط صبر پر طوفان مظالم میں اس کے قدم نہیں ڈگمگائے۔

کہا جاتا ہے کہ حضرت عثمان ذوالنورین تھے۔ پیغمبرؐ کے داماد مشہور تھے۔ انہوں نے رشتے کی لاج بھی نہیں رکھی، تین روز بعد واپس آئے، ہمت نہیں پڑتی تھی کہ کیا منہ لیکر جائیں۔

کیا ان واقعات میں ایمان کی کمزوری کی جھلک پائی نہیں جاتی۔۔۔؟

دانشوران اسلام نے تسلیم کیا ہے کہ مسلمانوں میں کالی بھیڑیں ایک نہیں بہت سی تھیں اور کفار قریش میں ابو سفیان کے علاوہ کئی گرگ باراں دیدہ اور بھی تھے۔ان سب نے منافقین مدینہ سے ایک رابطہ قائم رکھا تھا۔احد میں کامیابی کے بعد ابو سفیان نے ایک طرف مدینے کے منافقین کو مرکز میں خلفشار پیدا کرنے پر متعین کیا، دوسری طرف عرب کی مخالف اسلام ممکن طاقتوں کو سمیٹ لایا۔غزوہ خندق سے قبل راستے میں حضورؐ کو مدینے میں اندرونی انتشار کی خبر ملی۔ آپ نے یکے بعد دیگرے حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ اور بعض دوسروں کو بھیجنے کی کوشش کی کہ وہ جا کر روک تھام کریں لیکن ان لوگوں نے انکار کر دیا۔آخر حذیفہ یمانی بھیجے گئے۔اس واقعے کو بعض مورخین نے احد سے

قبل بیان کیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ اس میں ان کے بعض مصلحتیں تھیں۔

جنگ میں جب عمرو ابن عبدود حضورؐ کے خیمے کے پشت پر آ کر للکارا تھا تو صحابہ سر جھکائے بیٹھے تھے وہ بہت خائف تھے۔ جیسے ان کے سروں پر طائر بیٹھے ہوں کہ وہ سر ہلائیں گے تو طائر اڑ جائیں گے۔ آنحضرت بزدلوں کے مجمع میں ایک ایک کو نام لیکر مخاطب کر رہے تھے مگر جواب قبرستان کی سی خاموشی سے مل رہا تھا۔ ایسے میں ایک آواز کان میں پڑی۔ جس نے دیو قامت حریف کا وہ رعب طاری کر دیا کہ رہے سہے حواس جاتے رہے پھر سب ہی حرمت اسلام کی پامالی اور پیغمبرؐ برحق کی بے عزتی اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہے۔

''اس کے سامنے کون جائے، اس نے قزاقوں کے مقابل میں اونٹ کا بچہ ڈھال بنا کر ایک ہاتھ میں لے لیا تھا اور سارے قزاقوں کو تن تنہا مار بھگایا تھا۔۔۔!''

یہ آواز حضرت عمرؓ کی تھی۔۔۔ پیغمبر عرب کی جان و آبرو اور حرمت اسلام داؤں پر لگی ہوئی تھی۔ بڑے بڑے دعویداران شجاعت اور رسولؐ کے پسینے پر خون بہانے والے مگر کوئی خود اپنی عزت نفس پر قربان ہونے کو تیار نہیں ہوا۔ صرف اتنا ہی نہیں کہ اپنے ایمان کو ناپختہ، یقین کو مشتبہ اور اپنی جانوں کو رسولؐ کے مقابلے پر عزیز ثابت کیا بلکہ دوسروں میں بیوفائی کا زہر بھی گھولا۔ بالآخر ہادیٔ برحق نے کل ایمان کو کل کفر کے مقابل بھیج دیا اور اس کی ایک ضربت کو کونین کی عبادت سے بہتر قرار دیا۔

اس موقع پر اگر غار ثور کا واقعہ بھی سامنے رکھ دیا جائے تو بے محل نہ ہوگا جب حضرت ابوبکرؓ رو رہے تھے، جن کے لئے کہا جاتا ہے کہ انھیں اپنی جان کی کوئی پروانہ نہ تھی وہ تو رسول اللہ کو خطرے میں دیکھ کر پریشان ہو رہے تھے، آج تو رسولؐ کے ساتھ اسلام اور مسلمان سب کے سب موت کے دہانے پر تھے۔ حضرت ابوبکرؓ یا وہ تمام لوگ جنہیں رسول اللہ سب سے زیادہ چاہتے تھے، جانیں قربان کر دینے کی جھوٹی پیش کش ہی کر دیتے اور غازی نہ بن سکتے تو درجہ شہادت کی فضیلت ہی حاصل کر لیتے لیکن ہوا یہ کہ ایک نے تو کہہ ہی دیا کہ اس کے سامنے جانا موت کے منہ میں جانے کے برابر ہے یعنی رسولؐ پر کچھ بیت جائے، وہ محفوظ رہیں۔۔۔ نہ ماننے کی بات تو الگ ہے لیکن حقائق کو دیکھا جائے تو ایمان قابل غور ضرور ٹھہرے گا!

اموی مورخین اس جنگ میں آنحضرتؐ کی کئی نمازیں قضا ہو جانے کا ذکر بھی کرتے ہیں، گویا آپ بھی دوسروں کی طرح اتنے ڈرے اور سہمے تھے کہ انھیں تائید الٰہی اور مشیت پر بھی

بھروسہ نہیں رہا تھا۔

صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت عمرؓ کا تبصرہ جذبہ ایمانی کا المیہ ہے۔

''آپ کی نبوت پر اتنا شک اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔۔۔،،یعنی شک کئی بار ہو چکا تھا مگر اتنا نہیں۔

قریش کے سفیر عروہ نے حضورؑ کو بتایا تھا کہ آپ کے صحابہ قریش سے ساز باز رکھتے ہیں۔ اس پر اس سے حضرت ابوبکرؓ کی گالی گلوچ ہو گئی تھی۔۔۔ اتنے متقی اور برگزیدہ صحابی اور گالی گلوچ، آپ کی معاشرتی اور طبقاتی سطح یہ تو نہ تھی!

اصحاب کی روش سے آنحضرتؑ کو ان کی وفاداریوں پر شک ہو گیا تھا لہذا تجدید بیعت کرائی جو بیعت رضوان کہلاتی ہے۔

خیبر میں کوئی بھی کامیابی کا اعزاز حاصل نہ کر سکا بلکہ حضرت عمرؓ جب دوسری بار واپس آئے تو فوج انھیں شکست کا ذمہ دار قرار دے رہی تھی اور وہ فوج کو۔

فتح مکہ میں خالد بن ولید نے ذاتی دشمنی کی بناء پر اسلام کے نام پر بنی حزیمہ کے سو آدمی قتل کر دیئے تھے، جس کے لئے خالد کے عمل سے حضورؑ کو اپنی برائت کا اظہار کرنا پڑا۔

غزوہ حنین میں خالد بن ولید اور دوسرے تمام صحابہ کا فرار جنگ احد کی دوسری نظیر ہے۔ اس کو بھی سرفروشی اور وفا کی میزان پر تولا جا سکتا ہے۔ اب کی بھی سب پلٹ آئے تھے مگر اس وقت جب حضرت عباس کی آواز سے حضورؑ کے بچ جانے کا ثبوت مل گیا۔ پھر ثقیف کے محاصرے میں جب رسولؑ نے حصار ختم کر کے چلنے کو کہا تو سب نافرمانی کے مرتکب ہوئے اور جب لڑائی میں تیروں سے جسم چھلنی ہو گئے تو خود واپسی کے لئے سامان بار کرنے لگے۔ اس کو بھی ایک قسم کے فرار سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

غزوہ تبوک میں صرف منافقین کا نام لیا جاتا ہے کہ انہوں نے حضورؑ کے قتل، اہل بیت کی بربادی اور اسلام کی تباہی کی اندر سے باہر تک سازش کی تھی مگر اس میں ناکامی ہوئی۔

۹ھ کے حج میں سورہ برات کی تلاوت کے لئے خدا کے حکم سے حضرت ابوبکرؓ کو اہل نہیں سمجھا گیا اور اس فرض کو حضرت علیؑ نے انجام دیا۔

حجۃ الوداع کے بعد غدیر کے میدان میں حضرت علیؑ کو سارے صحابہ کا مولیٰ بنایا گیا جن میں مستقبل کے مدعیان خلافت بھی تھے اور حضرت عمرؓ نے علیؑ کو اپنا مولیٰ کہا تھا۔

واقعہ مباہلہ میں واضح طور پر بتایا گیا کہ اہل بیت میں صرف فاطمہؑ، آپ کے شوہر علی اور آپ کے بچے ہیں۔ صحابہ اور ان کے متعلقین میں سے کوئی نہیں ہے۔ یہی اہل بیت اثاثہ اسلام بھی ہیں اور امت میں ہر ایک پر فضیلت بھی رکھتے ہیں۔ ان سے جو سرتابی کرے، وہ دشمن رسولؐ بھی ہے اور دشمن خدا بھی۔

حضورؐ کی وفات کا تذکرہ پچھلے صفحات میں کیا جا چکا ہے جس میں اسامہ کے لشکر کے ساتھ نہ جا کر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ سمیت بہت سے اصحاب رسولؐ کی نافرمانی اور خدا کی لعنت دونوں سے بچ نہ سکے پھر واقعہ قرطاس میں حضرت عمرؓ کی اپنے نجات دہندہ سے گستاخی کی نظیر تلاش کرنے سے بھی کہیں نہ مل سکے گی۔

ان باتوں سے زائد ثبوت ایمان ووفا اور کیا درکار ہوگا۔۔۔!

منافقین: قرآن مجید کی روشنی میں

کون نافرمان تھا اور کون فرماں بردار، کون وفادار تھا اور کون بیوفا، کون منافق تھا اور کون مسلمان؟ اس کا فیصلہ متضاد مواد کی موجودگی میں ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے لیکن اتنا یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ حضرت فاطمہ زہرا، حضرت علی مرتضی اور حضرات حسنین علیہم السلام اور اولاد امجاد کی طرف کسی مسلمان کا خیال بھی نہیں جا سکتا۔ اب یہ فیصلہ اہل نظر خود فرما لیں کہ قرآن مجید میں جن کے لئے بار بار منافقون آیا ہے وہ کون کون ہیں؟ ایک عبداللہ ابن ابی تو نہیں تھا جس کا تذکرہ انتیس مرتبہ ''منافقون،، کہہ کر کیا گیا تھا۔

چند آیات پیغمبر برحق کی فرمانبرداری اور اطاعت کے لئے بطور میزان پیش ہیں:۔

پارہ ۴ ع ۵: اللہ اور اس کے رسول کا کہنا مانو تا کہ تم پر رحم کیا جائے

پارہ ۵ ع ۵: مسلمانو!! اللہ کا حکم مانو اور اس کے رسول کے کہنے پر چلو

پارہ ۴ ع ۱۲: جو لوگ اللہ کے حکم پر چلیں گے، اللہ ان کو جنت عطا کرے گا۔

پارہ ۵ ع ۶: ہم نے رسول کو اسی لئے تو بھیجا ہے کہ اللہ کے حکم سے ان کا کہنا مانو

پارہ ۵ ع ۶: جو اللہ اور رسول کا کہنا مانیں گے وہ جنت میں ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے، جنہیں اللہ نے سرفراز کیا ہے یعنی پیغمبر، صدیق، شہید اور نیکوکاروں کے ساتھ اور ان لوگوں ہی کا ساتھ اچھا ہے۔

پارہ ۹ ع ۱۰ اور اللہ اور اس کے رسول کا کہنا مانو اگر تم میں ایمان ہے۔
پارہ ۲۲ ع ۶ جو اللہ اور رسول کے کہنے پر چلے گا وہ اپنی مراد پائے گا
معلوم ہوتا ہے کہ لوگ قدم قدم پر ٹھوکر کھا رہے تھے لہذا انھیں تنبیہ کی جا رہی تھی۔۔۔
ان احکام میں کہیں اس کی صراحت نہیں ہے کہ رسول بیمار ہوں یا جب تمہاری مصلحت نہ ہو تو امرالٰہی کا اطلاق نہ ہوگا یا جب چاہو تو مانو، نہ چاہو تو نہ مانو۔۔۔رسولؐ تو جاگنے میں بھی رسولؐ تھا اور سوتے میں بھی رسول صحت مندی میں بھی رسولؐ اور بستر مرگ پر بھی رسولؐ۔
اور جب لوگ بار بار جگانے پر بھی نہ جاگے اور مسلسل انتباہ پر بھی نہ سنبھلے تو کہہ دیا گیا۔
''اے رسولؐ! کہہ دو کہ تم لوگ اللہ اور رسول کی اطاعت کرو اور اس پر بھی نہیں مانتے تو اللہ کافروں کو دوست نہیں رکھتا۔(پارہ ۳۔ع ۱۱)
اور پھر قدرے سخت لہجے میں قطعی حکم صادر ہو گیا۔
''جو شخص اللہ اور رسولؐ کی نافرمانی کرے گا اور حدود سے تجاوز کرے جائے گا اللہ اس کو دوزخ میں جھونک دے گا جس میں وہ ہمیشہ مبتلا رہے گا اس کے لئے عذاب علیم ہے،،(پارہ ۳ ع ۱۱)

شاید یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمانوں نے پیغمبرؐ عرب کو مملکت عرب کا حکمران سمجھنا شروع کر دیا تھا اور ان کی نیتیں ڈاواں ڈول ہو رہی تھیں اس لئے قرآنی آواز میں قدرے واضح الفاظ استعمال کئے گئے۔
''اور جو بھی سچی راہ کھل جانے کے بعد رسولؐ کی خلاف ورزی کرے اور مسلمانوں کے راستے سے ہٹ کر دوسرا راستہ اختیار کرے، ہم اس کو اسی راستے پر لے چلیں گے اور دوزخ میں ڈال دیں گے جو اس کے لئے بہت برا ٹھکانہ ہے۔،،(پ ۵ ع ۱۴)
پھر اس کی وضاحت بھی کر دی گئی کہ اس میں خود رسول کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔
''اللہ اور رسول کی اطاعت کرو اور خدا سے ڈرو۔ان دونوں کی مخالفت تم سے نہ ہونے پائے۔تم نہ مانو گے تو یہ سمجھ لو کہ ہمارے رسول کا فرض صرف احکام الٰہی کو کھول کر بیان کر دینا ہے،،
(پارہ ۷ ع ۲)
''اس سزا کے مستوجب وہ صرف اس لئے ہیں کہ انہوں نے اللہ اور رسولؐ کی مخالفت کی ہے۔جو شخص اللہ اور رسول کی مخالفت کرے گا، اللہ اس کو سخت عذاب دینے والا ہے،،۔(پارہ ۷

ع۲)

قران کریم کے مسلمات میں ہے کہ ''رسول اپنی خواہش سے کچھ نہیں کہتے جب تک وحی نہ آئے،،۔اس کا اطلاق زندگی کی آخری سانس تک ہوتا ہے، خواہ اچھے ہوں یا بیمار ہوں۔ باری تعالیٰ کو علم تھا کہ کوئی نافرمانی کا جواز ڈھونڈنے کے لئے دماغ کے متاثر ہونے کا سہارا لے سکتا ہے لہذا پہلے سے کہہ دیا تھا۔

''کسی مسلمان مرد یا عورت کو حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور رسول کسی بات کا حکم دیں تو خود اس کا کوئی اختیار رہ جاتا ہے اور پھر بھی کوئی حکم نہ مانے تو وہ کھلا ہوا گمراہ ہے،، (پارہ۲۱ع ۲)

اس کے بعد رب العزت کی طرف سے بتایا جاتا ہے کہ اب ان کی منافقت ڈھکی چھپی نہیں ہے۔

''اللہ اور رسول کا کہنا مانو، ایمان والوں! رسول کا حکم سن کر اس سے منہ نہ پھیرو اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو زبان سے تو کہہ دیتے ہیں کہ ہم نے سنا لیکن اپنے عمل سے ثابت نہیں کرتے کہ انہوں نے سنا ہے،، (پارہ۹ ع۱۷)

پھر ایک قطعی فیصلہ سنا دیا گیا۔

''جو لوگ اللہ اور رسول کی نافرمانی کریں گے، ان کے لئے دوزخ کی آگ ہے، کسی ایک دن کے لئے نہیں، ہمیشہ کے لئے،،۔ (پارہ۲۹ ع۱۵)

ایسے ہی کتنے احکامات ہیں جو مختلف اوقات میں صادر ہوئے اور قرآن پاک نے انھیں محفوظ کرلیا۔ یہ احکامات کن لوگوں کے لئے ہیں؟ عمائدین علامہ انھیں تاریخ سے نکال کر بتائیں کہ حیات پیغمبرؐ اسلام میں ان کے نام کیا تھے اور اس کے بعد کس کس دور میں کن کن افراد پر ان کا اطلاق ہوتا رہا، ظاہر ہے کہ وہ کوئی ایسے ویسے تو ہوں گے نہیں نمایاں اور ممتاز ہی ہوں گے، بظاہر رحمان اندر سے شیطان۔

ہم اگر کرداروں کو پہچان کر انھیں بے نقاب کرتے ہیں تو حق گوئی میں کبھی دار پر چڑھایا جاتا تھا آج گولیوں کا نشانہ بنا دیا جاتا ہے۔۔۔طریقہ کار وہی ہے جو کبھی رہا تھا بساط بدلنے سے نسلی خون تو بدل نہیں جاتا پھر بھی فصل زمان و مکان سے اتنا فرق تو پڑنا ہی چاہیئے کہ غلط طریقہ کار کی تقلید نہ کی جائے۔

جاہلیت کی ورثہ داری کو علمی دنیا نے کبھی قبول نہیں کیا لہذا دانشمندی یہ ہے کہ قدیم کتب

خانوں کو نذر آتش کرنے کے بجائے اور ماضی کے بچے کھچے تحریری سرمائے کو ترمیم و تحریف کر کے صحیح کو غلط کرنے کی کوشش کی جگہ، الفاظ کا منہ کھلوا کر پوچھا جائے کہ آخر یہ معمہ کیا ہے؟ مخبر صادق کی سیرت دو رخی دکھائی دیتی ہے کہ فدک کی جاگیر بیٹی کو ہبہ بھی کر دیے اور یہ بھی کہہ دے کہ ہم انبیاء اپنی میراث نہیں چھوڑتے اور اگر انہوں نے کوئی ایک ہی بات کہی تھی تو دو مدعیوں میں جھوٹا کون ہے؟ بظاہر تو بیٹی کے ہبہ نامے پر کئی صحابیوں کی گواہی تھی اور حدیث توریث کا راوی صرف ایک ہے اور اس کی بیٹی واحد گواہ اور بوقت وفات رسولؐ اس جاگیر پر رسول کی بیٹی کا قبضہ بھی تھا اور یہ قبضہ اس کا شاہد تھا کہ اس میں آخری لمحات تک رسولؐ کی رضا شامل تھی۔

مثال میں ایک لفظ صدیق کو بھی لیا جاسکتا ہے۔ صدیق حضرت ابو بکرؓ کو بھی کہا اور حضرت ابوذر غفاری کو بھی کہ آسمان نے روئے زمین پر ابوذر سے زیادہ سچا آدمی نہیں دیکھا جس کو تفصیل سے اگلے صفحات میں بیان کیا جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی حضرت علیؑ کو تمام زندگی مختلف مواقع پر صدیقیت کی سند دی جاتی رہی۔ پھر لفظ صدیق کسی فرد واحد سے مختص کیوں ہے؟

متضاد تاریخی مواد کیوں اور کیونکر پیدا ہوا؟ اس کا جائزہ حق پسندی کا تقاضا ہے۔ خلافت مدینہ سے خلافت شام تک تاریخی خط مستقیم کے محور پر گھومتے ہوئے واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ دمشق کی حدیث سازی کو اس میں بڑا دخل ہے۔ اس جائزے سے حقائق بے نقاب ہو سکتے ہیں اور اس کوشش میں اگر مفروضہ عقائد پر کوئی ضرب پڑتی ہے تو عقدہ کشائی کا جواب نوک شمشیر سے دینا جہالت ہوگی جبکہ نوک قلم سے تاریخی گرہوں کو سلجھانا مدینۃ العلم کی پرورش کا اسلامی فریضہ ہے!

اکابر اسلام

صراحت مزید کے لئے تاریخ کے اتار چڑھاؤ اور افراد کے نظریاتی مد و جزر کی داستانوں سے اگر کوئی غیر جانبدار نتیجہ اخذ کیا جائے تو بالاختصار کہا جا سکتا ہے کہ ریگزار کے مرکزی شہر مکہ کی پندرہ بیس ہزار آبادی میں جو قبائل رہتے بستے تھے، ان میں قریش بنی عدی بنی، تیم اور بعض دیگر قبائل کے لوگ شامل تھے۔ قریش اکثریت میں تھے اور دوسرے قبائل کے لوگ تھوڑے تھوڑے۔

قریش میں بنی ہاشم زیادہ ممتاز تھے اس کے بعد بنی امیہ تھے۔ ہاشم اور امیہ نسلی طور پر چچا بھتیجے ہوتے تھے لیکن حقیقتاً ایک دوسرے سے جلتے تھے۔ بنی عدی اور بنی تیم بنی ہاشم کے حریف اور بنی امیہ کے حلیف تھے لیکن بنی ہاشم کی خاندانی وجاہت کو کوئی چھو بھی نہ سکتا۔ بنی امیہ بھی نہیں اور کسی

دوسرے قبیلے کے افراد کا تو سوال ہی نہ تھا۔

ختم المرسلین کی پیدائش کے وقت ابوسفیان کو بنی امیہ کا باوقار نمائندہ کہا جاسکتا تھا، حضرت ابوبکرؓ بنی تمیم سے، حضرت عمرؓ بنی عدی سے تعلق رکھتے مگر عمائدین مکہ کے سامنے ان کے بزرگ کسی گنتی میں نہ آسکتے۔۔۔آنحضرت کی نسلی فضیلت میں صحیح بخاری کی ایک حدیث کا حوالہ محدث دہلوی نے دیا ہے:۔

''رسول خدا نے جبریل سے نقل کیا ہے کہ میں نے زمین کے مغارب ومشارق کو دیکھا ہے مگر کسی کو محمد مصطفیٰؐ سے افضل نہیں پایا اور کسی کی اولاد کو میں نے نہیں دیکھا جو بنی ہاشم سے افضل ہو۔،، (۳۵)

بنی ہاشم کے اسلاف میں بعض نام نہ صرف تاریخ عرب کا امتیاز ہیں بلکہ سطح پیغمبری کو چھوتے نظر آتے ہیں۔ حضورؐ نے اس خاندانی پس منظر کے ساتھ عرب کے خرافاتی عقائد کے خلاف ایک نعرہ لگایا۔ حضرت خدیجہ بنت خویلد، حضرت علی ابن ابی طالب، حضرت زید بن حارثہ اور حضرت ابوبکر بن ابی قحافہ نے آپ کی آواز پر لبیک کہا پھر دوسرے لوگوں نے۔

وہ اکیلے ہی چلے تھے جانب منزل مگر
لوگ آتے ہی گئے اور کارواں بنتا رہا

کاروان اسلام کے ابتدائی اہل قافلہ سب کے سب بڑے مخلص تھے اور کارواں سالار سے ایک رشتہ بھی رکھتے، بنت خویلد رفیقہ حیات تھیں، علی آغوش تربیت میں پلے ہوئے، زید پہلے غلام تھے، اب فرد خاندان اور ابوبکرؓ کو بچپن کا دوست کہا جاسکتا ہے؟ اسکے بعد جو لوگ کارواں میں داخل ہوئے، وہ تمام کے تمام صادق وامین مکہ کی سیرت کے اعجاز سے متاثر ہوکر، روایات عرب کی بندشیں توڑ کر، خدائے واحد کے آخری سفیر کے ہم آواز بن گئے تھے جن کی مشترک آوازیں صنادید عرب کی بھاری بھرکم گرج دار مخالفت میں دب کر رہ جاتیں، اگر ایک بوڑھے سامی کی باجبروت آواز فضا میں نہ گونجتی، جس کی گونج سے ہر طرف ایک سناٹا چھا جاتا۔''میرا بھتیجا جھوٹ نہیں بولتا تم نے جو مقاطعے کا باہمی معاہدہ کیا تھا، اس کو دیمک چاٹ گئی ہے!،،

کسی میں تردید کی ہمت نہ تھی وہ سب مانتے تھے کہ محمدؐ کی صداقت، دیانتداری اور انسانیت کی یہ حمایت غلط نہیں ہے پھر معاہدہ منگوا کر دیکھا گیا تو مخبر صادق کی غیب دانی کا ثبوت بھی مل گیا، تاہم اصنام پرستی کی جبلت کی جڑیں اتنی دور تک گئی تھیں کہ نسلی ذہن نے سر کو جھٹک دیا۔۔۔

ملیکۃ العرب کی دولت اور ابو طالب کی شخصیت اگر چہ پیغام رسالت کے سامنے کوئی اہمیت نہ رکھتی مگر دنیا کی مادیت کے سامنے اس کی ضرورت تھی ۔ یہ دونوں چیزیں اشاعت دین میں بہت معاون ثابت ہوئی تھیں۔

یہ سرتا سر غلط ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے مالی طور پر کوئی احسان کیا تھا یا حضرت عثمان نے مدد کی تھی۔ یہ بھی غلط ہے کہ حضرت ابو بکرؓ ان دنوں خوشحال تھے۔ حضرت بلال کو خرید کر رہا کر دینے کی جو کہانی بیان کی جاتی ہے، اس کی حقیقت یہ تھی کہ حضرت عباس سے حضرت ابو بکر کے تعلقات تھے۔ انہوں نے حضرت عباس سے یہ خواہش اور اپنی مجبوری بیان کی تھی۔ حضرت عباس کے حالات بہت اچھے تھے۔ انہوں نے حضرت بلال پر مظالم کے قصے سن کر پیسے دیدئے تھے اور ابو بکر نے بلال کو خرید کر آزاد کر دیا تھا تب ہی تو جب بلال کے انکار بیعت پر حضرت ابو بکر نے انھیں خریدنے کا طعنہ دیا تو بلال نے کہا ''اگر تم نے مجھے خریدا تھا تو پھر غلام بنالو۔،،ابو بکرؓ کے لئے خاموشی کے سوا کوئی چارہ نہ تھا پھر بلال جب تک مدینے میں رہے، خانہ سیدہ زہراؑ سے وابستہ رہے۔ اس کے بعد مدینہ چھوڑ کر چلے گئے مگر آتے جاتے رہے اور در رسالت پر ہی حاضری دیتے رہے، آخری بار اس دن آئے تھے جب فاطمہ زہراؑ کے کہنے پر اذان دی اور جس کے بعد رسولؐ کی بیٹی نے اس دنیا سے اپنا رشتہ توڑ لیا تھا۔

بات تھی دامن اسلام میں پناہ لینے والوں کی تو یقیناً وہ سب خلوص نیت سے اسلام لائے تھے۔ ان میں حضرت ابو بکر کو فضیلت حاصل تھی لیکن یہ صحیح نہیں ہے کہ انھیں مکے کی سوسائٹی میں کوئی امتیاز حاصل تھا۔ اموی مورخ نے لکھا ہے کہ فلاں اور فلاں ان کے اثر سے مسلمان ہوئے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ مبینہ افراد سے انکی راہ و رسم رہی ہو اور اسلام کی طرف ان کے میلان میں ابو بکرؓ کے کسی بیان سے اضافہ ہوا ہو مگر بنیادی طور پر صادق و امین مکہ کی سیرت ہی ایسے کسی رجحان کو پیدا کرسکتی تھی۔ یہی ہوتا تو حضرت ابو بکر بنی تیم کے تمام لوگوں کو پرچم اسلام کے نیچے جمع کر لیتے مگر ان میں سے تو ایک بھی اسلام نہیں لایا تھا بلکہ خود ان کے والد ابو قحافہ ہی فتح مکہ کے بعد ابو سفیان کو دیکھ کر مسلمان ہوئے تھے، جب ان کی بنیائی بھی جاتی رہی تھی۔

تب ہی طبقات ابن سعد اور بعض دوسرے مورخین کی روایت صحیح معلوم ہوتی ہے کہ جب ابو بکرؓ کے علاوہ بنی تیم کا کوئی آدمی دین قبول کر لینے کے لئے نہیں آیا تو پیغمبرؐ اسلام نے بنی تیم کے لوگوں سے خلا ملا پیدا کرنے کی خاطر ان کی لڑکی داخل حرم کرنے کا فیصلہ کیا، حضرت ابو بکرؓ کو ان کی بیٹی

عائشہ کا پیغام دیدیا اور انہوں نے قبول کرلیا۔۔۔حضورؐ کو اس کی خبر نہیں تھی کہ کچھ روز قبل ہی عائشہؓ جبیر بن مطعم سے بیاہی جاچکی ہیں۔

طبقات الکبیر کا شمار مسلمانوں کی چند ابتدائی تاریخوں میں ہے اس کا بیان ملمع سازی سے مبرا معلوم ہوتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ حضرت عائشہ سترہ اٹھارہ سال کی مطلقہ خاتون تھیں اور بقول مصری مورخ محمود العقاد صورت شکل میں کوئی امتیاز نہ رکھتی تھیں، رنگ سرخی مائل سفید تھا اس لئے حمیرا کہی جاتی تھیں، اور اسی بنا پر انھیں محبوبہ رسولؐ بنا دیا گیا۔ لوگ نہیں مانتے تو تسلیم کرلیا جائے کہ وہ چھ سال کی لڑکی ہی تھیں۔ ام المومنین خدیجہ کی یاد میں مسلسل حضورؐ کا افسردہ رہنا حضرت ابوبکرؓ سے دیکھا نہیں گیا اور انہوں نے نابالغ بیٹی پیش کردی تاکہ وہ دل بہلاتی رہے۔

اس حقیقت کو عام انسان کے تقاضائے جوانی کو سامنے رکھ کر پرکھا جائے تو بے ساختہ ہنسی آجائے گی کہ جو خود گڑیوں سے کھیلتی تھی وہ کسی جوان کا جی کیا بہلاتی۔۔۔اور بالخصوص اس جوان کا جو دل ودماغ پر چھائی ہوئی رفیقہ حیات کی یادوں میں کھویا رہتا تھا۔

بہرحال حضرت ابوبکر نے جو کچھ کیا اس کو خلوص کے علاوہ کوئی اور نام دیا نہیں جاسکتا۔ جہاں تک ام المومنین عائشہؓ کے سن وسال اور نوعیت واقعہ کی بات ہے، وہ کچھ بھی ہو، لیکن اس کے پس پردہ یہ حقیقت ضرور تھی کہ حضورؐ کی افسردگی دور کی جائے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اس مقصد کو پورا کرنے کے قابل کئی سال بعد ہوسکیں۔

مگر یہ حقیقت بھی اپنی جگہ پر ہے اور ان کی دلی خواہش تھی کہ کسی نہ کسی طرح بساط نبوت پر ان کے گھر کے چراغ روشن ہوسکیں۔ ایک روایت صحیح بخاری میں ملتی ہے۔

''حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ مجھے اپنے والد پر غصہ آرہا تھا۔ وہ مجھ سے شب زفاف کے بارے میں پوچھ رہے تھے اور ہاتھ میری کوکھ پر مار رہے تھے لیکن میں نے ذرا بھی حرکت نہ کی کیونکہ رسولؐ کا سر میری ران پر رکھا ہوا تھا اور وہ آرام فرما رہے تھے،،۔(۳۶)

اس کو حضرت ابوبکرؓ کی خوش نیتی ہی کہنا چاہئے کہ عملی طور پر ام المومنین کے زوجہ رسولؐ بننے میں تاخیر ان کے لئے قابل برداشت نہیں تھی کہ انہوں نے بیٹی کو مارنے میں بھی دریغ نہیں کیا حالانکہ شرفائے عرب میں بیٹی سے شب زفاف کے متعلق پوچھنا اور اس کو اس طرح مارنا شاید داخل تہذیب نہیں تھا جس کا اندازہ فاطمہ زہراؑ کے ساتھ حضورؐ کے برتاؤ سے کیا جاسکتا ہے مگر حضرت ابوبکر غالباً مقصد براری کے جذبے میں ایسی ہر بات کو بھول گئے تھے۔

ہوسکتا ہے کہ ان کے دل کے کسی گوشے میں یہ تمنا چھپی ہو کہ حضرت عائشہ کے بطن سے اولاد نرینہ پیدا ہو جائے کیونکہ ام المومنین خدیجہ نے واحد بیٹی اپنی یادگار چھوڑی تھی۔ایسی ہی آرزو کا ابوسفیان کے دل میں ہونا خارج از امکان نہیں ہے، تب ہی تو حضورؐ سے درخواست کی تھی کہ میری بیٹی ام حبیبہ عرب کی حسین ترین عوت ہے، آپ اس سے عقد فرمالیں۔ممکن ہے، آنحضرت کے لئے اس کی یہ رائے بھی ہو کہ آپ حسن و جمال کے معیار پر عورت کو پرکھ کر شادی کرتے ہیں۔یہ خیال ان روایات متواترہ کا ماخذ ہے جن کے بیان سے آگے چل کر حضورؐ کا کردار مشکل کیا گیا۔

دلوں کے راز اور نیتوں کے رموز جاننے والا عالم الغیب ہے پھر بھی حضرت ابوبکرؓ کے بارے میں کسی بدخیالی کو یقین کا درجہ نہیں دیا جاسکتا کیونکہ وہ کاروان اسلام کی تشکیل کے اولین سربراہوں میں سب سے بزرگ تھے۔مانا کہ حضرت ابوطالب اور ام المومنین خدیجۃ الکبریٰؓ کی وفات کے بعد حضورؐ کی حفاظت میں عمائدین قریش کا مقابلہ نہ کرسکے تاہم ان کا ساتھ نہیں چھوڑا اور ہجرت مدینہ میں یار غار ہونے کا شرف بھی حاصل کیا۔۔۔اس مقام پر چند امور کی صراحت کرنا ضرورت ہے کہ:۔

مدینے آکر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عثمانؓ کے کاروباری حالات مقابلتاً کافی بہتر ہوگئے تھے اس لئے دونوں نے اسلام کے لئے خدیجۃ الکبریٰ کا سا نہ سہی پھر بھی بقدر حیثیت فراخدلی کا ثبوت دیا اور اموی مورخین کے الفاظ میں محسن اور غنی بن گئے۔

قیام مکہ میں علیؑ کو ایک بچہ ہی گردانا جاتا تھا حالانکہ دعوت ذی العشیرہ میں بھی وہ گیارہ ساڑے گیارہ سال کے تھے اور اب تو پچیس کی حدود کو چھو رہے تھے لہذا بدیہی طور پر آنحضرت کے بعد حضرت ابوبکر کی بزرگی کا شرف مجروح ہوتا جارہا تھا جس کو باقی رکھنے کے لئے حضرت عائشہ کو حضورؐ کی زوجیت میں دیدیا گیا تھا اور آخری کوشش کے طور پر حضرت فاطمہؑ کے لئے دامن آرزو بھی پھیلا دیا گیا اور جب امید نہ بندھی تو یہی درخواست حضرت عمرؓ کے لئے کردی گئی لیکن فاطمہؑ کا عقد مطابق وحی ہونا تھا اور اس کے ساتھ یہ شرط تھی کہ جس کے گھر میں تارا اترے۔۔۔وحی علیؑ کے لئے آئی اور تارا بھی علی ہی کے گھر میں اترا۔۔۔لوگوں نے ساری رات آسمان کی طرف دیکھ کر گزاری، بالکل اسی طرح جس طرح آگے چل کر خیبر میں آنکھوں آنکھوں میں صبح ہونے کا انتظار کیا تھا لیکن علیؑ و فاطمہؑ وابستگان الٰہی میں تھے ان کے لئے ہر فیصلے کا حق صرف خالق کون و مکان کو تھا۔ساڑھے دس سال کی فاطمہ علیؑ کی رفیقہ حیات بنادی گئیں۔

اب حضرت ابوبکرؓ کی آخری امید ام المومنین عائشہ کے محور پر گھوم رہی تھی کہ اگر وہ رسولؐ کے بیٹے کی ماں بن جائیں تو ان کا خواب پورا ہو جائے۔ بشریت کے تقاضے سے یہ کچھ تعجب خیز بھی نہ تھا اور اسی لئے شاید انہوں نے بیٹی پر تشدد کو بھی روا رکھا تھا جس کا اظہار حضرت عائشہ کی زبان سے مبینہ حدیث میں ہو گیا تھا۔ اگر یہ امید بر آتی تو مستقبل کی تاریخ کچھ اور ہوتی پھر حدیث توریت گڑھنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی اور انعقاد سقیفہ بھی وجود میں نہ آتا لیکن آدمی کچھ چاہتا ہے اور مشیت الٰہی کچھ اور ہوتی ہے بیٹا حضورؐ کو ملا ضرور مگر حضرت عائشہؓ کے بجائے ماریہ قبطیہ کے بطن سے اور اسے بھی قدرت نے سال سوا سال کے بعد اٹھا لیا۔ اب رسولؐ کی عورتوں اور بیٹیوں میں جو کچھ سرمایہ نسل اور اثاثہ نبوت تھا وہ وہی تھا جس کو لے کر آپؐ مباہلے میں گئے تھے اور مستقبل میں اسی اثاثے کو لے کر جناب فاطمہؑ فدک کی جاگیر کا مطالبہ کرنے کے لئے نکلی تھیں گویا باپ نے نصرانیوں سے مباہلہ کیا تھا اور بیٹی نے خود مسلمانوں سے۔ نصرانیوں کی روحانیت منزلت شناس ثابت ہوئی مگر کتنے ناآشنائے حق تھے مسلمان کہ آج بھی انہوں نے ان کے شرف کا اعتراف نہیں کیا۔

حضرت عمر کے دل میں بھی شاید پیغمبرؐ اسلام سے نسلی تقرب کا ارمان تھا تب ہی فاطمہ زہراؑ کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد انہوں نے ام کلثوم بنت علیؑ سے چار پانچ سال کی عمر میں عقد کیا اور اس کو اپنا شرف قرار دیا جو بنیادی طور پر غلط ہے۔ یہ ام کلثوم فاطمہ زہراؑ کی بیٹی ہی نہیں تھی بلکہ ام کلثوم بنت ابی بکر تھی جو حضرت ابوبکر کی وفات کے چار روز بعد اسماء بنت عمیس کے بطن سے پیدا ہوئی تھی اور جب اسماء حضرت علیؑ کی زوجیت میں آئی تو محمد ابن ابوبکرؓ اور ام کلثوم بنت ابی بکر دونوں کو ساتھ لائیں جن کی پرورش حضرت علیؑ نے اپنے بچوں کی طرح کی۔ اس طرح حضرت عمر ابوبکرؓ کے داماد تھے نہ کہ حضرت علیؑ کے!

پھر بھی مدینے کی ہجرت تک مکہ کی زندگی میں صحابہ میں سے کسی کی بدنیتی کا کوئی صریحی ثبوت نہیں ملتا لیکن مدینے میں کچھ ایسا ہوا کہ حالات کھل کر سامنے آ گئے اور ایک چھوٹی سی مملکت کی داغ بیل بھی پڑ گئی۔ اب وراثت پیغمبری کے ساتھ عرب کا تخت و تاج بھی روشنی میں آ جاتا اور غزوات نبوی کے مقتولین کی اولاد بھی پرچم اسلام کے نیچے جمع ہوتی جا رہی تھی جس کی رگوں میں جب صحرائی خون کی جبلت موجزن ہوتی تو آباء و اجداد کے قاتل کا زندہ رہنا ناقابل برداشت بن جاتا مگر سب مل کر بھی علیؑ کا مقابلہ نہ کر سکتے اور علیؑ کے ساتھ مخلص اور برگزیدہ اصحاب نبی بھی تو موجود تھے اس لئے نہ صرف علیؑ بلکہ

عرب کے نجات دہندہ کو بھی راستے سے ہٹا دینے کی کوششیں کی گئیں مگر کامیابی نہیں ہوئی۔

دوسری طرف رسولؐ کی نیابت کے امیدوار بھی علی کی فضیلت کے سبب بالکل مایوس ہو چکے تھے لہذا دو گرہوں کی نظریاتی ہم آہنگی نے ایک باہمی مگر خفیہ اتحاد کا سہارا لے لیا اور جب غدیر خم سے واپسی پر حضور کی طرف سے علیؑ کے مقابلے میں اپنی طرف داری کی امید ختم ہوگئی تو تیزی کے ساتھ منصوبہ بندی کرتے ہوئے انعقاد سقیفہ کا مکمل منصوبہ بنالیا گیا اور اس کا جال پھیلا دیا گیا۔

آنحضرتؐ کی حالت غیر ہونے پر حضرت ابو بکر لوگوں کو اجتماع کی دعوت دینے کے لئے نکل گئے اور حضرت عمر کو چھوڑ گئے کہ بنی ہاشم اور انصار کوئی دوسرا راستہ اختیار نہ کرنے پائیں۔

حالات اجمالی طور پر بیان کئے جا چکے ہیں۔ سقیفہ میں بادشاہ عرب کی جانشینی کے بعد استقرار حکومت کیلئے خالد بن ولید کی تلوار کا استعمال کیا گیا اور وہی سب کچھ ہوا جو کوئی نیا فرمانروا بادشاہت کے مدعیان کے ساتھ کرتا ہے لیکن یہ ایک پیغمبرؐ کی جانشینی تھی اس لئے بعض قبائل نے کہہ دیا۔

''ہمیں یقین ہے کہ اہل عرب ابو بکر کے خاندان یعنی تیم بن مرہ کی اطاعت نہیں کریں گے اور بطحیٰ کے سرداروں یعنی بنی ہاشم کا ساتھ نہ چھوڑیں گے کیونکہ یہی لوگ معدن رسالت اور لائق امامت ہیں،، (۳۷)

اور غلط نہیں کہا تھا ریگزار عرب کے حق شناسوں نے، نبوت کے لئے قدرت کی طرف سے نسل وخون کی طہارت کے التزامات روز اول سے کیے گئے تھے اور خود آنحضرت کے لئے مشیت کی احتیاط قابل ملاحظہ ہے۔

''آپ کا نور پشت ابوالبشر سے جناب شیث میں منتقل ہوا اور حضرت آدم نے اپنے بیٹے شیث سے وصیت کی۔

''اس نور مبارک کو پاک بیبیوں میں منتقل کرنا، بعد میں حضرت شیث نے اپنے فرزند انوش سے یہی وصیت کی۔

اس طرح اس وصیت کا سلسلہ ایک قرن سے دوسرے قرن تک جاری رہا یہاں تک کہ یہ نور مبارک حضرت عبدالمطلب سے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ تک آیا،، (۳۸)

حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی دوسری نسل جو حضرت اسحاق سے چلی اس میں بھی شرافت خون اور نجابت نسل کا بڑا تحفظ ہوا ہے جس کا سلسلہ حضرت عیسیٰ سے جا کر مل جاتا ہے۔

حضرت ابوبکرؓ یا حضرت عمرؓ کے لئے فلپ ہٹی یا ابوسفیان کا جو تبصرہ ہے، اس میں نسل
خون اور سماجی وقار دونوں نظریات شامل ہیں لیکن اس کے معنی ہرگز یہ نہیں ہیں کہ اس لحاظ سے و
لوگ پست تھے بلکہ قبائلی منزلت میں بنی ہاشم کا مقابلہ نہ کر سکتے، اسی کے ساتھ یہ بھی کہا جا سکتا ہے ک
نسلی طور پر وہ کفر کی آلودگی سے پاک بھی نہیں تھے اور بطون طاہرہ سے ان کی تولید بھی نہیں ہوئی تھ
اس لئے بساط نبوت کے لئے کسی طرح موزوں نہیں تھے اس طرح ان حضرات کیلئے جو دو حدیثیں پائ
جاتی ہیں وہ غلط ثابت ہوتی ہیں۔

''ہم اور ابوبکرؓ دو گھوڑے تھے جو ایک ساتھ دوڑ رہے تھے، میں آگے نکل گیا مجھے نبوت مل
گئی وہ پیچھے رہ گئے انھیں خلافت مل گئی!،،

حدیث ساز کو غالباً اس کا علم نہیں تھا کہ پیغمبرؐ کے لئے طہارت نسل اور شرافت خون ضرور
ہوتی ہے۔۔۔!

آنحضرت کے لئے قدرت کے اس نسلی التزام کے بعد ایک کافرہ کا دودھ پینا بھی صح
نہیں ہوسکتا۔ یہ بات یقیناً مسلمات میں ہے۔ آپ نے ابولہب کی آزاد کردہ کنیز ثوبیہ کے دود
سے پرورش پائی جو حضرت عبدالمطلب کی پناہ میں تھی اور عقیدہ توحید رکھتی تھی۔ حضرت حمزہ نے بھ
اسی کا دودھ پیا تھا اس لئے وہ آنحضرت کے رضائی بھائی تھے۔۔۔ حلیمہ سعدیہ کے وہاں وہ روا
کے مطابق بھیجے ضرور گئے لیکن دودھ پینے کی مدت ختم ہونے کے بعد۔

ابوسفیان کا نام اعتبار نسل میں لیا جا سکتا ہے کیونکہ ہاشم اور عبد شمس ہم جدّی تھے جن
سلسلہ نسب ایک تھا لہذا ابوسفیان کے تفاخر قومی کو کسی حد تک جائز کہا جا سکتا ہے۔ یہی صورت معاو
کی ماں ہندہ کی بھی ہے۔ ابوسفیان حرب بن امیہ بن عبد شمس کا بیٹا تھا اور ہندہ عتبہ بن ربیعہ بن ع
شمس کی بیٹی لیکن اکثر مورخین نے اس کو بدکاری سے متہم کیا ہے اور ہندہ کی ماں کا شمار تو عکاظ ۔
میلے میں جھنڈے والیوں میں ہوتا تھا۔ اس طرح معاویہ حسب ونسب میں کسی طرح پاک وطاہر نہی
کہے جا سکتے اور ان مورخین کو جھٹلایا بھی نہیں جا سکتا جن کے رشحات قلم ان حقائق کو بے نقاب کر۔
ہیں لہذا پیغمبرؐ کی نیابت کو ان سے نسبت دینا بھی ظلم ہوگا نہ کہ اسلسلے کی ایک کڑی قرار دینا جس
آغاز حضورؐ کی وفات کے بعد سقیفہ بنی ساعدہ سے ہوا تھا مگر وقت کی ستم ظریفی ہے کہ مسلمانوں
تاریخ اسی طرح وقوع میں آئی۔

رسول کریم نے اپنی دانست میں دعوت ذی العشیرہ سے لے کر خم غدیر تک سب کچھ وا

کر دیا تھا مگر علیؑ دشمنی اور اقتدار کی ہوس نے بڑے بڑوں کے پاؤں ڈگمگا دیے اور وہ سب کچھ عمل میں آ گیا جو رسولؐ کی زندگی میں خواب وخیال میں بھی گزر نہ سکتا۔ لوگوں نے سب کچھ لے لیا تھا مگر کاش سرزمین عرب کے محسن اعظم کی بیٹی پر جور وستم کے وہ پہاڑ توڑ ھائے نہ ہوتے جن کے تصور سے انسانیت کانپ اٹھتی ہے!

رہی سہی کسر رسولؐ کے نسلی دشمن بنی امیہ کے مایہ ناز سپوت نے پوری کر دی۔ اس دور میں شام کے ممالک محروسہ پر نظر ڈالی جائے تو علیؑ پر تبرا کی گونج دور دور تک سنائی دے گی اور نظیریں اس کی بھی ملیں گی کہ اہل بیت کو گالیاں تک دی جاتی تھیں۔ اولاد فاطمہ کا نام ونشان تک مٹ گیا تھا۔ یثرب، بطحیٰ اور چند دوسرے مقامات کے علاوہ وہ جانی پہچانی بھی نہیں جاتی۔

خود اسلام پر جو کچھ گزر رہا تھا وہ یہود ونصاریٰ بھی نہ کرتے۔ انداز کفر اسلوب ایمان میں داخل تھے، حدیث سازی کی اتنی بھر مار تھی کہ مکر وفریب کا نام ہی راست بازی پڑ گیا تھا اور دروغ گوئی کو عین صداقت قرار دیا جاتا تھا۔ اس طرح اسلام کے نام پر اسلام کو قتل کر دیا گیا اور اس کے خون سے بنی امیہ کے تخت خلافت پر نقش ونگار بنائے گئے جو آج اسلام کی زیب وزین ہیں۔

سرمایہ احادیث

اہل سنت والجماعت کے پہلے امام اعظم یعنی ابوحنیفہ کا فتویٰ ہے کہ :۔

''اعمال دین میں داخل نہیں ہیں، اس کا حسن و جمال ہیں،،۔

اس کی تصدیق بخاری کی ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے۔فتویٰ دوسری صدی ہجری کی ساتویں دہائی میں صادر ہوا۔آپ کے شاگرد رشید امام ابو یوسف نے مامون اعظم کے حکم سے حہ آپ کے فتاوے مرتب کیے ہیں، ان میں فتویٰ شامل ہے یعنی خلیفہ شام معاویہ بن ابی سفیان کے انتقال کے ۱۱۵ سال بعد۔

فتویٰ میں نہ کوئی سیاسی تگڑم ہے اور نہ سہ راہے یا چوراہے کی بات بلکہ ایک قطعی اور صریح حکم ہے جس سے ابوسفیان متوفی ۳۰ھ، معاویہ متوفی ۶۰ھ اور یزید ابن معاویہ متوفی ۶۴ھ سب کے ایمان کا تحفظ ہو جاتا ہے۔اس کی رو سے کسی کو دائرہ اسلام سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔

علی کو یوم خندق میں حضورؐ نے کل ایمان قرار دیا تھا، ان کا قاتل یعنی کل ایمان کا قاتل بھی اہل ایمان، فاطمہ کو جگر کا ٹکڑا، حسنین کو بیٹوں کا شرف دیا تھا۔بالفاظ دیگر حضورؐ عین اسلام تھے تو یہ سب اجزائے اسلام تھے، انہیں کاٹ ڈالنے والا بھی مسلمان، دین کے پردے میں دین کو تلوار کے گھاٹ اتار دینے والا بھی دیندار!

یہ ایک سامنے کا تبصرہ تھا ورنہ مسلمانوں کے بڑے گروہ کے امام اول کا فیصلہ اپنی جگہ پر ہے۔غور طلب یہ امر ہے کہ علیؑ، فاطمہؑ اور حسنینؑ کو اگر حضورؐ کے تعلق سے سمجھا جائے تو ان کے قاتلوں سے رسولؐ کا متنفر ہونا مسلم ہے اور جس سے رسولؐ ناخوش ہوں، اس سے خدا بھی ناخوش ہوتا ہے اور جس سے خدا ناخوش ہو، اس کا ایمان ثابت مشکل معلوم ہوتا ہے۔

جبکہ رسولؐ نے بالاتفاق یہ بھی فرمایا تھا کہ ''جس نے فاطمہؑ کو ناراض کیا، اس نے مجھے ناراض کیا اور جس نے مجھے ناراض کیا اس نے خدا کو ناراض کیا۔

صحیح بخاری کی رو سے ام المومنین عائشہ صدیقہ سے مروی ہے کہ فاطمہ نے باغ فدک کو اپنی وراثت میں مانگا تھا جو انہیں نہیں دیا گیا تو وہ حضرت ابوبکر سے ناراض ہوگئیں اور انہوں نے زندگی بھر ان سے بات نہیں کی۔ یعنی ناراض رہیں۔

اس طرح بظاہر یہ فتویٰ احادیث رسولؐ کے خلاف جاتا ہے لیکن فتویٰ بھی احادیث ہی کی روشنی میں صادر کیا گیا ہے۔ خود مفتی نے اپنی طرف سے تو کچھ کہہ نہیں دیا جو ذخیرہ اقوال پیغمبر کا موجود تھا، انہیں کے مطابق دین کی راہیں متعین کیں اور ذخیرہ دور دور تک پھیلے ہوئے راویوں کے بیانات پر مشتمل تھا۔ ان بیانات کے دینے والوں نے بھی بڑی محنت کی تھی۔ انہوں نے جس کسی سے جو کچھ سنا اس سے یہ بھی پوچھا کہ اس تک یہ حدیث کیونکر پہنچی۔ اس نے بتایا کہ فلاں نے فلاں سے سنا تھا اور اس نے فلاں ابن فلاں سے اور اس نے خود حضرت ابوہریرہ یا ام المومنین عائشہ یا عبداللہ ابن عباس یا قتادہ بن دعاۃ وغیرہ وغیرہ سے۔ اس طرح جو احادیث فراہم ہوسکیں ان کی رو سے فتاوے دیئے گئے اور انہیں سے فقہ حنفیہ مرتب ہوئی۔ جس پر امام ابوحنیفہ کے شاگرد رشید امام ابو یوسف کی چھاپ بھی ہے۔

اور صرف انہیں دو پر موقوف نہیں، تمام محدثین کے مجموعے اسی طرح ترتیب پائے جن میں فقہ امامیہ کے محدثین بھی شامل ہیں۔ ان لوگوں نے اپنی حد تک ہر ممکن کوشش کی کہ جو حدیثیں حضرت علی اور منصوص من اللہ جانشینوں کی مبینہ باوثوق ذرائع سے پائی جاتی ہیں، انہیں پر انحصار کریں۔ شیخ ابوجعفر برقی، محمد بن یعقوب کلینی، شیخ صدوق، شیخ مفید سید مرتضی علم الہدیٰ، سید رضی اور اسی تسلسل میں بعد کے علماء شیخ ابوجعفر طوسی، نصیرالدین طوسی، علامہ حلی، علامہ مجلسی، علامہ طبرسی اور شیخ عباس قمی وغیرہ نے بڑی احتیاط کی کہ صرف انہیں احادیث کو لیں جن میں ملاوٹ نہ ہو لیکن مشکل یہ آپڑی تھی کہ بعض روایات میں آئمہ اثنا عشر میں سے کسی کا نام بھی منسلک کر دیا گیا تھا یا وہ نام لے لیے تھے جو فدائیان اہل بیت میں شمار کیے جاتے اس لئے ایسی حدیثوں کو معتبر سمجھ لیا گیا اور الکافی من لایحضر الفقیہ بحارالانوار، مجالس المومنین اور المنتہی الامال وغیرہ کے دامن وضعی احادیث سے یکسر بچ نہ سکے۔

اور یہی صورت دیگر محدثین کی بھی ہوئی۔ محمد بن اسمٰعیل بخاری، مسلم بن حجاج کے مجموعہ

ہائے احادیث کے علاوہ، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور مسند امام احمد بن حنبل وغیرہ کے ساتھ دوسرے مجموعے بھی آلودگی سے پاک نہ رہ سکے۔ کہا جاتا ہے انہیں صحیح مگر وہ صحیح نہیں ہیں کیونکہ ان میں اکثر موضوعات پر متضاد احادیث پائی جاتی ہیں جن کی تاویل میں مفسرین نے یقیناً انتھک مساعی کی ہیں لیکن کسی مسئلہ پر جب دو حکم ایک دوسرے کے خلاف ملتے ہیں تو اس کو کیا کیا جائے۔ نظیر میں فدک کی جاگیر کو لیا جاسکتا ہے۔ رسولؐ کی بیٹی دستاویزی ثبوت پیش کررہی تھی کہ بابا نے مجھے لکھ کر دیا ہے اور میرا اس پر قبضہ بھی ہے۔ حضرت ابوبکر کہہ رہے تھے کہ حضورؐ نے اس کو مال مسلمین قرار دیا ہے، مجھ سے خود کہا تھا۔ نعوذ باللہ اگر صدیقہ طاہرہ کو جھوٹا سمجھ لیا جائے تو ابوبکر صدیق کے بیان کی تردید حضرت عثمان نے کردی اور مال مسلمین کو مروان کی ذاتی جاگیر بنادیا پھر کسی نے اپنے عمل سے فاطمہ زہرا کو سچا ثابت کیا اور یہ جاگیر بنی فاطمہ کو دیدی۔ اس کے بعد کسی خلیفہ نے اس کو بحق سرکار ضبط کرلیا اور عمرؓ بن عبدالعزیز جیسے فقیہ نے حضرت ابوبکرؓ کو جھٹلادیا اور فدک بنی فاطمہ کو دیدیا۔

یہ ایک مثال ہے حقیقی تضاد کی جس کے پس منظر میں وہ دور ہے جب خلیفہ شام نے حدیث سازی کو صنعت کا درجہ دیا تھا اور دمشق کی ٹکسال نے وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے کہ مملکت اسلامیہ میں شام کا خزانہ حدیثوں کے انبار سے ابلنے لگا تھا۔ ان کے ذخیرے ممالک محروسہ کے دوسرے مقامات پر کیے جانے لگے تھے۔ معاویہ کی حیات کے بعد اس صنعت کا زور گھٹ گیا پھر بھی فنکاروں کو روزی تو کمانا ہی تھی مگر مزدوری کم ہوگئی تھی اور اب ایسا کام صرف ضرورت پڑنے ہی پر ملتا تھا۔

کوئی سو سال بعد جب حدیثوں کے مجموعے مرتب ہونا شروع ہوئے تو احادیث دور دور تک جنگل کی آگ کی طرح پھیلی ہوئی تھیں اور ان میں غلط اور صحیح کا امتیاز محال تو نہیں مگر اتنا مشکل ہوگیا تھا کہ کوئی حق بین نظر ہی اصلی سونے اور سونے کا ملمع کئے ہوئے پیتل میں امتیاز کرسکتی تاہم قلم کاروں نے محنت کی اور مورخین نے اپنے فرائض انجام دیئے۔

تدوین احادیث

سرمایہ احادیث بے شمار مجموعوں اور تاریخوں پر مشتمل ہے۔ ان میں صحیح بخاری کو اولیت دی جاتی ہے جو بعد کتاب باری کہی جاتی ہے پھر صحیح مسلم کا درجہ ہے اس کے بعد چار کتابیں اور ہیں

پھر یہ سلسلہ چلتا ہی رہتا ہے۔ تعداد کا تعین قدرے مشکل ہے۔

صحیح بخاری کی تعداد روایات نو ہزار بیاسی ہے لیکن اس میں علماء کا اختلاف ہے پھر بھی بشمول مکررات سات ہزار تین سو ستانوے حدیثیں ضرور ہیں۔ یہ تعداد کتنی روایات سے اخذ کی گئی ہے، اس کا تعین ذرا مشکل ہے کیونکہ محدث اعظم نے ہر راوی کو اپنی میزان اعتبار پر تول کر روایت کو قبول کیا ہے۔ یہ میزان عموماً انتخاب کنندہ کی نظر میں راوی کی سیرت اور خود انتخاب کرنے والے کے زاویہ نگاہ کا امتزاجی معیار ہوتی ہے۔ اسی لئے امام بخاری نے اپنے چار سو تیں راویوں میں سے جن اسی افراد کو ضعیف قرار دیا، امام مسلم نے انہیں منتخب کیا ہے اور امام مسلم نے اپنے چھ سو بیس راویوں میں سے جن ایک سو افراد کو مسترد کیا ہے، ان میں سے ایک تعداد بخاری میں موجود ہے۔ اس اختلاف میں صرف نظر تحقیق کی کارفرمائی ہے ورنہ مقصد دونوں کا یہی رہا کہ جو روایت لی جائے وہ صحیح اور مستند ہو۔۔۔ اب یہ محدث کی بے چارگی ہے کہ وہ انتخاب اسی ذخیرہ احادیث سے ہی کر سکتا تھا جو حافظوں میں پایا جاتا تھا اور جنہیں لوگ بیان کرتے رہے تھے۔

بلاشبہ صحیح بخاری میں بقول ابن حجر عسقلانی ایسے راویوں کی کافی تعداد ہے جو جہمی، قدری، رافضی یا مرجیہ عقائد کے حامل تھے اور ایسے بھی جو منکر حدیث اور وہمی تھے لیکن امام بخاری نے جرح کے بعد انہیں ثقہ قرار دیا تھا۔

ذخیرہ احادیث کا جائزہ لیا جائے تو مسلمانوں کے سب سے بڑے راوی ابو ہریرہ ہیں جن سے ۵۳۷۴ حدیثیں مروی ہیں۔ ان حدیثوں کو آپ کے شاگرد بشیر بن نہیک نے محفوظ کیا تھا۔ عبداللہ بن عباس کی مرویہ ۱۶۶۰ احادیث ہیں جو مختلف شاگردوں کی مبینہ ہیں۔ انس کی ۲۲۸۶ حدیثیں ابان نے لکھ کر محفوظ کی تھیں جن میں سے اکثر کو مسترد کر دیا گیا تھا۔ ام المومنین عائشہ کی ۲۲۱۰ احادیث، عروہ بن زبیر کے حوالے سے اور عبداللہ بن عمر کی ۱۶۳۰ حدیثیں، ابن سعد اور دارمی کے بیان کے مطابق نافع اور جابر ابن عبداللہ انصاری کی ۱۵۴۰ حدیثیں قتادہ بن دعاہ نے لکھ لی تھیں لیکن احادیث کے یہ صحائف اور نوشتے کسی نقطہ مشترک پر اور کسی ایک جہت سے مجتمع نہ تھے وہ علوم سینہ اور قوت حافظہ کی گزرگاہوں سے نسل بعد نسل ایک سے دوسرے تک پہنچے تھے۔ تعداد کا تعین ممکن ہی نہ تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ امام مسلم نے جب اپنی صحیح کے لئے حدیثیں جمع کرنا شروع کیں تو وہ بارہ ہزار تک پہنچ گئیں۔ کوشش کی جاتی تو تعداد اور بھی بڑھ سکتی تھی مگر امام مسلم، نے راویوں کو غیر معتبر قرار دے کر اتنے ہی پر اکتفاء کی۔

مجموعی طور پر صحیح مسلم میں ۷۲۷۵ حدیثیں بیان کی گئی ہیں جن میں سے چار ہزار ایسی ہیں جو بخاری میں نہیں ملتیں۔ یہی صورت راویوں کی بھی ہے۔ مسلم نے ۶۲۰ ایسے لوگوں سے روایت کی ہے جن سے بخاری نے نہیں کی۔ اس کے برعکس بخاری نے چار سو تیئیس ایسے راویوں سے احادیث لی ہیں جن سے مسلم نے نہیں لیں۔

اس اختلاف سے یہ فیصلہ کچھ دشوار نہیں کہ احادیث اور راویوں کا پھیلاؤ اتنا وسیع تھا جس کا احاطہ ناممکن تھا۔ اس کا اندازہ بعد کی جامعات کو دیکھ کر بھی کیا جا سکتا ہے پھر بھی خلفائے ماسبق کے فضائل میں ایک ہم آہنگی ضرور پائی جاتی ہے البتہ واقعات کے بیانات میں بہت اختلاف ہے اور یہی اختلاف آگے چل کر دین کی مختلف سمتوں کا موجب بنا۔

سطحی نظر سے دیکھا جائے تو یہ کرشمہ سازی فصل زمانی اور بعد مکانی کی معلوم ہوتی ہے کیونکہ امام بخاری کا زمانہ ۱۹۴ھ۔ ۲۵۶ھ اور امام مسلم کا دور ۲۰۶ھ۔ ۲۶۱ھ تک ہے جبکہ حضورؐ کی وفات کو دو ڈھائی سو برس گزر چکے تھے اور عرب و شام کی زمین خون کے طوفان سے گزر چکی تھی لیکن عقیدے کی عینک اتار کر کھلی آنکھوں سے تاریخ کا جائزہ لیا جائے اور مدینے سے کوفہ اور کوفے سے شام تک تحقیق کی ایک شاہراہ کھولی جائے تو وقت کا مدوجزر موجوں کے ہوشربا شور میں سب کچھ اگل دے گا اور کانوں کو عبرت کی ایسی داستانیں سنائی دیں گی جنہیں سننے کو جی تو نہ چاہے گا مگر چارو ناچار سننا پڑیں گی۔۔۔ فتح مکہ کے بعد لشکر اسلام کی سطوت و جبروت دیکھ کر ابوسفیان نے کہا تھا "اچھا ہوا کہ خدا نے عتبہ بن ربیعہ کو یہ منظر دیکھنے کو زندہ نہیں رکھا۔ صحیح حالات کی تصویر کشی کی جائے تو ممکن ہے، آج کے ابوسفیان دیکھنے کی تاب نہ لا سکیں اور ہاتھوں سے اپنی آنکھیں بند کر لیں لیکن حقیقت تو بہر طور حقیقت ہی ہوتی ہے اور تحقیق کا دھارا کسی کے روکنے سے رک نہیں سکتا، وہ چلتا ہی رہتا ہے اور چلتا ہی رہے گا۔

تخلیق احادیث کا پس منظر

مسجد کوفہ میں حضرت علیؑ کی شہادت اور امام حسن کی خلافت سے دست برداری کے بعد سے ملوکیت شام میں محبان علی کی حالت زار کو کم و بیش ہر مورخ نے لکھا ہے لیکن ظلم و ستم کی ایسی داستانیں استقرار حکومت کے لئے ہر زمانے اور دنیا کے ہر حصہ میں دہرائی جاتی رہی ہیں، معاویہ کا کار عظیم تو یہ تھا کہ حضرت عثمان کی مظلومیت کی ان گنت کہانیاں مشتہر کرا کے صاحبان ایمان کو جادہ

حق سے ہٹا دیا اور اسلام کے خلیفہ برحق سے بغاوت کا ایک جواز پیدا کرلیا۔۔۔ مسلمانو کا ایک بڑا حلقہ اس بغاوت کو جائز تو نہیں کہہ سکتا مگر جانبداری کے ایک پہلو کا سہارا لے کر خطائے اجتہادی سے تعبیر کرتا ہے۔

سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ جس شخصیت کو وہ مجتہد ہونے کا اعزاز عطا فرماتے ہیں، اس نے صرف دو پونے دو سال تک کبھی کبھی رسول کی صحبت میں بیٹھنے کا شرف حاصل کیا تھا اور کاتب وحی ہونے کا مرتبہ عطا فرماتے ہیں اس کو جس نے اپنے طور پر شاید کوئی آیت لکھ لی ہو کیونکہ حضورؐ تو صرف وحی کا بیان فرماتے تھے اور اصحاب اس کو حافظوں میں محفوظ کر لیتے تھے۔۔۔ابوسفیان کے ساتھ اسلام لانے کے وقت معاویہ کی عمر اٹھائیس سال تھی۔ یقیناً وہ باپ کے ساتھ اسلام کی ہر جنگ میں شریک رہے ہوں گے۔ مانا کہ دین میں داخل ہونے کے بعد پچھلے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں مگر اٹھائیس سال بتوں کی رفاقت میں گزرنے اور آغوش مادر سے جوانی کی بھرپور منزلوں تک پہنچنے کے بعد کفر کے گہرے نقوش جو دل پر مرتسم ہوئے ہوں گے، وہ چند روز میں تو ماند نہیں پڑ گئے ہوں گے اس کا ثبوت ان کے کارناموں سے قدم قدم پر ملتا ہے۔

آنخضرت کا طریقہ تھا کہ جب کسی لشکر کو بھیجتے تو قائدین لشکر کو لشکر سمیت بلاتے اور ان کو ہدایت فرماتے:

''اللہ کے نام پر جاؤ اور اسی سے استقامت مانگو، اپنے رسولؐ کی ملت پر رہتے ہوئے خدا کے واسطے جہاد کرو۔ لوگو! مکر نہ کرنا، مال غنیمت میں سے کچھ نہ چرانا، کفار کو قتل کرنے کے بعد ان کی آنکھ، کان اور دوسرے اعضاء نہ کاٹنا، بوڑھوں بچوں اور عورتوں کو قتل نہ کرنا، راہب جو غاروں میں رہتے ہیں ان کا خون نہ بہانا، درختوں کی بیخ کنی نہ کرنا تاوقتیکہ مجبور نہ ہو جاؤ، نخلستان کو نہ جلانا، پانی میں غرق نہ کرنا، میوہ دار درختوں کو نہ اکھاڑنا، کھیتی اور زراعت کو نہ جلانا، ہوسکتا ہے کہ خود تمہیں ہی اس کی ضرورت پڑ جائے، حلال گوشت کے جانوروں کو ختم نہ کرنا، شاید وہ تمہارے کام آسکیں، کفار کے پانی کو کبھی زہر آلودہ نہ کرنا، مکر و فریب نہ کرنا، دشمن پر شب خوں نہ مارنا جہاد بالنفس کو جہاد سے بڑا سمجھتے رہنا''۔

حضرت ابوبکر کے دور میں خالد بن ولید نے کس جنگ میں اس کی احتیاط کی جواب اثبات میں نہیں مل سکتا بلکہ اگر صحیح واقعات بے کم وکاست بیان کر دیئے جائیں تو حقیقت برداشت نہ ہوگی۔

حضرت عمر فتاح ممالک تھے۔ ان کے لشکری چنگیز و ہلاکو کی طرح دشمن پر ٹوٹ نہ پڑتے تو

منظم فوجوں کو پسپا کرنا آسان ہوتا اور فتح کے بعد تو عربوں کے دور جاہلیت کا ذہن خود حضرت عمر کے الفاظ میں اسلام کے لئے خام مال فراہم کرتا رہا۔

حضرت عثمان جب بزم میں محتاط نہیں رہے اور تعلیمات رسول کی خلاف ورزی کرتے رہے تو رزم میں ان کے جرنیلوں سے اصول اسلام کی پیروی کی توقعات ہی بیکار تھیں اور ایسی ہی بدعنوانیوں کے نتیجے میں تو انہوں نے نفرت کے آتش فشاں تیار کر لئے تھے۔

حضرت معاویہ کا تو کہنا کیا، آپ ابوسفیان کے فرزند سعید تھے۔ ان کے اسلحہ خانے میں روم کا زہر قاتل اور ایسی تلواریں موجود تھیں جن کی کاٹ زہر اور تلوار دونوں کا کام کرتی تھیں۔ زہر کی گواہ مالک اشتر اور امام حسن کی شہادت ہے اور تلوار کی گواہی مسجد کوفہ میں مسلمانوں کے خلیفہ چہارم کا سر دیتا رہے گا۔۔۔۔ اسلحہ خانے کی تیسری چیز حدیث ساز انسان تھے جنہوں نے ایسے اخباری نمائندوں کا کام دیا جو سو سال پہلے کی پھڑکتی ہوئی خبریں لا کر دیدیتے تھے اور اسلحہ خانے کا پریس انہیں بغیر چھاپے ہوئے مشتہر کر دیتا تھا پھر یہ خبریں تلواروں کی چھاؤں میں جڑ پکڑ لیتیں اور ان سے کونپلیں پھوٹتی رہتی تھیں۔

حضرت علیؑ کے خلیفہ بن جانے کی خبر سننے کے بعد سے حضرت عثمان کی مظلومیت کی داستانیں مملکت شام کے گلی کوچوں میں عام ہوگئی تھیں اور اس کے ساتھ ہی علیؑ پر دشنام طرازی اور لعنت کی گونج بھی سنائی دیتی تھی۔ بعض مورخین کے بقول ستر ہزار منبروں کے خطبات میں علیؑ پر تبرا کیا جاتا تھا بلکہ بیعت لینے کے الفاظ میں علیؑ پر تبرا بھی شامل تھا۔

شام کے خلیفہ کا مقصد آل فاطمہ کا استیصال کلی تھا لہذا اس کے اعمال شیعان علی کو تقیہ کی پناہ گاہوں سے ڈھونڈ نکالنے پر ہی اکتفاء نہ کرتے بلکہ ان علمی ذخائر کو بھی تلاش کرتے جو محبان علی نے دینی سرمایے کے طور پر محفوظ کیا تھا کہ اگلی نسلوں کے کام آئے۔ یہ سرمایہ علمی افراد سے زیادہ خطرناک تھا اور مقصد حدیث سازی پر ضرب لگاتا تھا لہذا اس کو تلاش کر کے تلف کر دیا جاتا تھا۔ ان مساعی میں مستقبل کے اموی دور میں بھی بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے گئے۔ حجاج بن یوسف ایسی خدمات کے لئے ایک تاریخی علامت ہے۔۔۔ ایک طرف علیؑ کے دیوانے پارہ ہائے خردمندی قلم بند کرتے دوسری طرف دشمنان ایمان انہیں نذر آتش کر دیتے۔۔۔ تاریخ مابعد میں بعض ترک فرمانروا، صلاح الدین ایوبی اور محمود غزنوی نے آتش زنی کے اس جہاد میں امتیاز حاصل کیا۔

شیعوں کی چار سو کتابوں میں سے پہلے صرف چالیس رہیں پھر چالیس سے چار رہ گئیں۔ یہ چار بھی وضعی احادیث کی دھول سے مبرا نہ رہ سکیں۔

اس ماحول میں اکثریت اہل بیت سے واقف ہی نہیں رہی بلکہ دور دراز کے لوگ سوچنے لگتے کتنے برے ہوں گے وہ لوگ جنہیں اس طرح برا کہا جاتا ہے۔ شام کی فضا تو صرف بنی امیہ کو ہی رسولؐ اسلام کا قریبی رشتہ دار سمجھتی تھی اور آج بھی ویسے ہی ذہن کے لوگ اکثر کہہ گزرتے ہیں کہ بنی امیہ اور بنی ہاشم میں کوئی تنازعہ ہی نہیں تھا، تھے تو دونوں ایک جد کی اولاد۔

حدیث سازی کا عمل شدومد سے جاری تھا مگر اب تک صرف حضرت عثمان کی فضیلت میں راوی اپنے ذہنوں کی طبع آزمائی کرتے رہے تھے اور انہیں غنی اور ذوالنورین بسند احادیث ثابت کیا جاتا تھا مگر اب ان کے ساتھ کبھی کبھی ابوسفیان کی قصیدہ خوانی بھی کر لی جاتی تھی۔ خود معاویہ کے بارے میں تو اتنی حدیثیں مروج ہو گئی تھیں کہ اکثر انہیں خود محسوس ہونے لگتا کہ شاید وہ اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت نہ کر سکیں لہذا فنکاروں کو ہدایات دی گئیں کہ اب علیؑ کی کمزوریوں اور صحابہ کے شرف پر توجہ دی جائے۔

معاویہ کی علی سے عداوت کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ محمدؐ بن عبداللہ کے جائز وارث تھے اور محمدؐ پیغمبر ہونے سے زائد معاویہ کی نظر میں اس سلطنت کے بانی تھے جو عرب، شام و عراق اور مصر پر پھیلی ہوئی تھی۔ ابوسفیان نے اسلام کے پرچم تلے پناہ بھی اسی لئے تو لی تھی کہ اب مخالف بن کر تو زندہ رہ سکنا ممکن نہیں لہذا اسلام قبول کر لیا جائے اور اقتدار میں حصہ لینے کی خاطر جو سیاسی تدابیر ممکن ہو سکیں، وہ کی جائیں، اس لئے اس نے پہلے تو جائز وارث کو شیشے میں اتارنے کی کوشش کی اور جب علیؑ کی طرف سے روکھا جواب مل گیا تو خلافت کی گود میں جا بیٹھا۔ معاویہ ذہنی طور پر بھی ابوسفیان کے بیٹے تھے۔ انھیں اپنے مقصد میں کامیابی ہوئی اور انہوں نے باپ کی روح سے سرخروی حاصل کی۔

تخت پیغمبرؐ اسلام کا تھا لہذا حکومت اسلام کے نام ہی سے کرنا تھی۔ یہی سقیفہ کی سنت بھی رہی تھی۔ اس کو فرمانروائے شام نے سقیفہ سازوں کے جانشین کی حیثیت سے فراموش نہیں کیا اور ارباب سقیفہ کی تقلید میں اسلامی کرداروں کے ساتھ خود اسلام کے ڈھانچے میں بھی تراش خراش شروع کرا دی تاکہ مدینے سے کوفہ ہوتی ہوئی دمشق تک جو ڈگر بنائی گئی تھی، اس پر سے کوفہ یکسر کالعدم ہو جائے۔

اسی تسلسل میں ایک حکم اور گشت کرایا گیا کہ علیؑ اور دوسرے افراد اہل بیت کے لئے جو فرمودات رسولؐ ہیں ان سے بہتر احادیث حضرت ابو بکر، حضرت عمرؓ اور ام المومنین عائشہ کے لئے بھی تصنیف کی جائیں اور راویوں میں خانوادہ رسالت کے لوگوں کو بھی شامل کیا جائے مگر ان کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہونے پائے۔ اجرت ایک دینار فی حدیث پہلے ہی مقرر تھی۔ اس میں اضافہ کے ساتھ یہ اعلان بھی کیا گیا کہ اگر حدیث سیاق وسباق کے لحاظ سے مکمل ہوگی تو غیر معمولی انعام بھی دیا جائے گا۔

فنکاران حدیث اتنے دنوں میں کہنہ مشق ہو گئے تھے۔ انہوں نے ذہانت کے اتنے جوہر دکھائے کہ جھوٹی حدیثوں کے بوجھ میں اصلی حدیثیں دب کر رہ گئیں اور اس محنت کے صلے میں وہ مالا مال ہو گئے۔ پھر اس صنعت میں ایک اور گرانقدر خدمت شامل کی گئی کہ آیت کی تفسیریں شارع عام پر اس طرح بیان کی جائیں کہ لوگ اس کے معنی وہی سمجھنے لگیں پھر اس کے بعد کوئی صحیح تفسیر بیان کرے تو وہ غلط معلوم ہو۔ یہ کام اس خوبی سے انجام دیا گیا کہ آج تک اس کی تقلید کی جاتی ہے۔

بزرگ ترین عالم اور محدث ابن عرفہ المعروف بہ نطفویہ اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں:۔

''صحابہ کے فضائل میں جھوٹی احادیث بنی امیہ کا تقرب اور خوشنودی حاصل کرنے کے لئے گڑھی اور بنائی جاتی تھیں اور واقعی بنی امیہ ان سے یہی سمجھتے تھے کہ اس سے بنی ہاشم کی توہین اور تذلیل ہوتی ہے''۔

ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ راویوں میں آئمہ اثنا عشر میں سے بھی کوئی نام شامل کیا جانے لگا جس سے روایت کا وزن بڑھنے کے بجائے مخالفین میں وہ نا معتبر بن گئی اور اکثر مجموعہ ہائے احادیث میں اس کو شامل نہیں کیا گیا مگر علمائے امامیہ نے اس کو منتخب کر لیا جو ان کے بنیادی اصول کی نقیض کرتی ہے۔

ان احادیث کے مصنفین میں یوں تو صدہا نام لیے جاتے ہیں لیکن کچھ لوگ ایسے تھے جنہیں اس فن میں مہارت تامہ حاصل تھی۔ احمد بن محمد عمر حدیثیں مسخ کرنے کے فن کار تھے۔ بعض بدیہہ گوئی میں ممتاز تھے جیسے حسن بن عمر نخعی، سعید بن طریق، زید بن رفاع کذاب، محمد بن عمرو اقدی۔ حقیقتاً یہ صنعت اس زمانے میں عروج پر پہنچ گئی تھی۔ اصل حدیث کے الفاظ اس روانی سے بدلے جاتے کہ صبح کو جو حدیث بیان کی جاتی، شام کو اس کے الفاظ اور راوی کے نام بدل جاتے۔ مثال میں حدیث ثقلین کو لیا جا سکتا ہے۔ کہیں کتاب اللہ اور عترتی سننے میں آتا، کہیں عترتی اور اہل

بیتی کہا جاتا، کہیں صرف سنتی اور کہیں سنتی اور عترتی۔

ان حالات نے بعد کے جامعین کو بڑی الجھن میں ڈال دیا۔ کسی نے انتخاب میں صرف وضعی احادیث کو لے لیا اور کسی نے وضعی کے ساتھ بعض اصلی احادیث کو بھی لیکن ایسے ذخائر کے پھیلاؤ سے ایک فائدہ بھی ہوا کہ انتخاب کرنے والے کو اپنے زاویہ نگاہ کے مطابق احادیث یکجا کرنے کی سہولت بھی میسر آ گئی، صنعت حدیث سازی کے بانیان اور فروغ دہندگان کا مقصد بھی پورا ہو گیا اور اسلام اور بانی اسلام دونوں حدیثوں کے مطابق ایسے سانچوں میں ڈھال لیے گئے جن سے وہ خود مطابقت رکھتے تھے۔

یہ ہے مسلمانوں کے نظریاتی اختلاف کی اساس جس کی تخلیق کا سہرا بنی امیہ کے پہلے خلیفہ کے سر بندھتا ہے۔

ہادیانہ قیادت

''جس کی لاٹھی اس کی بھینس'' ایک عالمگیر کہاوت ہے جو ہر زبان میں پائی جاتی ہے اور دنیا کے ہر حصے کے اقتدار پر صادق بھی آتی ہے۔ اس کا دورانیہ تخلیق کائنات کے پہلے دن سے آخری لمحات تک ہے یعنی بقا سے فنا تک۔

خود فطرت فیاض اس کی خالق ہے۔ مخلوق کی ہر نوع میں اس نے قائد اور بالا دست پیدا کیے۔ جنگل کے جانوروں میں شیر، شہد کی مکھیوں میں بڑا مکھا، حتیٰ کہ چیونٹیوں میں ایک بڑی چیونٹی جو تاجدار ہوتی ہے اور اس میں عام چیونٹی سے زائد صلاحیت پائی جاتی ہے جو قدرت پیدائشی طور پر اس کو عطا کرتی ہے۔

ان فطری سربراہوں کی قائدانہ اہلیت اور بالادستی کی قوت خداداد ہوتی ہے۔۔۔ انسان کو حیوان ناطق کہا جاتا ہے لہذا اس میں درندگی کو دور کر کے انسانیت کا عنصر بڑھانے کی خاطر، انھیں انسانوں میں سے کسی انسان کو قدرت اصلاح کی غیر معمولی صلاحیتیں ودیعت کر کے بھیجتی ہے جو عام انسانوں کے شعور کو بیدار کر کے متمدن جاندار کہے جانے کے قابل بنا دیتا ہے۔ انہیں کے لئے قرآن مجید میں کہا گیا ہے۔

''ہم نے دنیا کے ہر حصے میں اور ہر دور میں ہادی بھیجے ہیں۔۔۔''

تخلیق کائنات کے بعد آدم اول کی تاریخ صرف عقیدے کے پس منظر میں نظر آ سکتی

ہے۔ایک شخص نے صاحب منبر سلونی سے سوال کیا تھا:۔

''یا امیر المومنین! آدم سے تین ہزار سال پہلے کون تھا؟،،

آپ نے فرمایا'' آدم۔۔۔!،، اس نے پھر پوچھا! اس سے پہلے؟ آپ نے جواب دیا ۔۔۔آدم!

پوچھنے والا سر جھکا کر کچھ ساکت سا ہوا تو آپ نے کہا:۔

''اگر تو تیس ہزار مرتبہ بھی یہی سوال کرتا تو جواب ایک ہی ملتا کہ آدم!(۳۹)

مخبر صادق کے شاگرد رشید نے اس طرح انسان اور قدامت عالم کے لاتناہی زمانے کا تعین کیا ہے جس سے اہل ہنود کے جگوں کی صحت ثابت ہوتی ہے اور ہادیوں کے مبعوث ہونے کی صداقت بھی۔

ہندوستان میں بندرابن کے کرشن کنہیا اور اجودھیا کے راجہ رام چندر جی کا وجود سلسلہ ہدایت کو ظاہر کرتا ہے اور عقیدے کی روشنی میں سورج ونشی اور چندرونشی خاندانوں میں ان کی پیدائش جادہ ہدایت میں نسلی طہارت پر دلالت کرتی ہے۔اسلام میں فرشتوں کا تصور دیوی دیوتاؤں کے متوازن ہے جو نظم کائنات میں جداگانہ قدرت کے حامل بتائے گئے تھے۔فرق ہے اوتاروں کی تعریف کا جو نبوت سے کچھ زائد اور مختلف نوعیت رکھتے ہیں اور جسم انسانی میں صفات خداوندی کے حلول کا خیالیہ پیش کرتے ہیں۔یہ اختلاف اور بعض دوسری باتیں کسی نامعلوم زمانے سے دور حاضر تک کے فصل سے پیدا ہو جانا ناممکن تو نہیں ہے جبکہ یہودیت،نصرانیت کے نظریات میں تبدیلی اور صرف چودہ سو سال کے اندر حلقہ اسلام میں عقائد کا تضاد محیر العقول ہے اور برا نہ لگے تو کہا جا سکتا ہے کہ خود پیغمبرؐ اسلام کے حین حیات مسلمانوں میں دشمنان اسلام کا موجودہ ہونا ناقابل یقین نہیں ہے،تاہم حقیقت تو حقیقت ہی ہوتی ہے۔

ہادیان ہندوستان کی شخصیتوں پر سطحی نظر ہی ڈالی جائے تو یہ بات بھی مسلم ہو جاتی ہے کہ دینی اور دنیاوی قیادت ایک ہی نقطے پر مرتکز تھی اور یہ دونوں فرائض عطیات خداوندی تھے۔راجہ رام چندر جی اور کرشن کنہیا دونوں دینی رہنما بھی تھے اور دنیاوی بادشاہ بھی۔ انسان کو انسان بنانا اور انسانوں سے انسانیت کا برتاؤ کرنا ان کے مذہب میں داخل تھا۔یہی صورت ایران وچین اور مصر و سندھ کی بھی تھی۔

اس طرح ہر دور عالم کا نظام خدائے بخشندہ کے بخشے ہوئے عناصر کے ہاتھوں میں تھا اور

حیوان بے شعور اور حیوان باشعور ایک ہی اصول فطرت پر چل رہے تھے پھر باشعور حیوان میں بغاوت نے انگڑائی لی اور وہ بالا دستی کے لئے جا و بے جا حیوان بے شعور کا کردار ادا کرنے لگا۔۔۔ یہیں سے طاقت کے غلط استعمال کی تاریخ شروع ہوتی ہے اور کمزور و شہ زور کے تصادم کا آغاز بھی۔ پھر بھی نظام فطرت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ وہ حیوان صامت اور حیوان ناطق دونوں میں اسی طرح نافذ رہا اور نسل بعد نسل وراثت میں ایک سے دوسرے کو ملتا رہا۔

حیوان صامت بے شعور تھے۔ ان میں کسی تبدیلی کا امکان تھا ہی نہیں لہذا شیر کی نسل جہاں جہاں خالص رہی وہاں شیر سے شیر کا بچہ ہی وجود میں آیا اور آج بھی گھنے جنگلوں میں اسی نسل کا شیر جنگل کا راجہ کہلاتا ہے البتہ حیوان ناطق میں اصول فطرت سے بغاوت کے نتیجے میں طاقت کا غلط استعمال شروع ہو گیا جس کو اقتدار کی جنگ کا نام دیا جاتا ہے۔۔۔ اس کی ابتداء کب سے ہوئی؟ کہا نہیں جا سکتا مگر انسان کی شعوری بیداری کے ساتھ کرہ ارض کے مختلف حصوں میں چھوٹی چھوٹی حکومتیں پیدا ہوتی رہیں جو کبھی کسی بڑی سلطنت کے ڈھانچے میں ڈھل گئیں پھر باہمی تصادم میں پارہ پارہ ہوتی رہیں۔ اس کے بعد کسی دوسرے زور آزمانے اپنی تلوار کا استعمال کیا اور دوسری حکومت بن گئی۔ سلطنتیں بننے اور بگڑنے کا یہ تسلسل آج تک باقی ہے اور قیام قیامت تک باقی رہے گا۔

لیکن خلاق مطلق نے انسان کی ہدایت کے لئے جو نور اول خلق کیا تھا، وہ حضرت آدم سے نسل انبیاء میں پاک و طاہر اصلاب سے گزرتا ہوا حضرت ابراہیم تک پہنچا پھر حضرت اسمٰعیل کی نسل میں منتقل ہوا اور تولید کی التزامی پاکیزگی کے ساتھ محمدؐ بن عبداللہ کی شکل میں خلقت پذیر ہوا۔ دوسری طرف نسل کا سلسلہ مطہر حضرت اسحٰق سے چل کر پاکیزہ بطون میں منازل وجود طے کرتا ہوا عیسیٰ مریم پر مختتم ہو گیا۔

صفحات ماسبق میں اس کا اختصاریہ پیش کیا جا چکا ہے۔ نبوت منصوص من اللہ ہوتی ہے جو بنی نوع انسان کے ہر شعبہ حیات کا احاطہ کرتی ہے۔ فقر کا بوریہ اور شاہی کا تخت دونوں اس کی بساط میں آتے ہیں۔ خلاق کائنات نے خلقت آدم کے ساتھ اس کا التزام کیا تھا۔ آدم پہلے نبی تھے اور پہلے انسان بھی۔ انسان کو ایک لمحہ کے لئے بھی بغیر رہبر کے چھوڑا نہیں گیا۔ پروردگار عالم نے کہنے کا موقع نہیں دیا۔ کوئی گنہگار کہہ سکتا تھا کہ ہدایت کرنے والا موجود ہی نہیں تھا ہم ہدایت کیونکر پاتے؟ لہذا بدیہی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہادیان برحق اور وجود عالم لازم و ملزوم ہیں۔

امام مہدیؑ کے بارے میں تو مسلمانوں کا متفقہ یقین ہے کہ وہ آئیں گے لیکن ختم المرسلین

کی وفات کے بعد سے مہدی مدعُود تک کا زمانہ کیا بغیر کسی قائد الہی کے چھوڑ دیا گیا؟ یہ ایک سوال ہے ملت مسلمہ سے جو امامت منصوص اللہ کی قائل نہیں ہے۔ اگر اس کا بدل سقیفہ کی خلافت کو کہا جائے تو وہ اللہ کی بنائی ہوئی خلافت تو نہیں تھی اور نہ مبرا من الخطاء۔۔۔؟

اور مشیت الہی میں نسل کی پاکیزگی خدائی سفارت کے لئے بنیادی شرط ہوتی ہے ایک ایسی نسل، کفر کی سیاہی جس کو چھو کر بھی نہ گئی ہو اور توحید جس کی گھٹی میں پڑی ہو۔ یہ شرف تو صرف حضرت ابراہیم کو حاصل تھا جن کا تسلسل بنی ہاشم تک گیا تھا۔۔۔خود اس سے ہٹ کر کوئی دعویٰ بھی نہ کرسکتا کہ وہ اپنے حسب ونسب میں از اول تا آخر طاہر و مطہر ہے، اس لئے کوئی منصب الہی کسی اور کو ملنے کا امکان ہی نہ تھا۔۔۔عجیب بات ہے کہ نبوت ختم ہونے کے بعد ختمی مرتبت کے نسب میں امام مہدیؑ کو تو تسلیم کیا جاتا ہے لیکن ان کے جد امجد کو نہیں۔۔۔اس طرح درمیانی مدت کی ہدایت الہیہ عدل الہی کو نعوذ باللہ مطعون کرتی ہے کیونکہ سقیفہ سے خلافت ترکیہ تک کوئی منصوص من اللہ نہیں تھا اور بعض تو ان میں بد اعمال بھی تھے۔

حضرت امام مہدی اللہ کے بھیجے ہوئے ہادی بھی ہوں گے اور ختمی مرتبت کی طرح اقتدار کامل کے علم بردار بھی۔ یہی اصول فطرت ہے مگر بعد ختم نبوت امت مسلمہ نے امامت کے نقطہ آغاز سے بغاوت کی اور حکومت کے حصول کی خاطر وہ سب کچھ کر گزری جو کرنا نہ چاہیئے تھی۔۔۔مہدی مدعود سے قبل و بعد مہدیت کے دعویدار بھی پیدا ہوں گے مگر وہ کچل دیئے جائیں گے کیونکہ حضرت مہدی کے لئے نہ کسی وصیت رسولؐ کی پابندی ہوگی اور نہ نام نہاد امت مسلمہ کو قتل نہ کرنے کی کوشش کی شرعی پابندی۔ دشمنان دین کو تہہ تیغ کرنا ہی آپ کو منصب ہوگا، وہ جو بھی ہوں۔ آپ ہی کی ذات سفارت الہیہ کا آخری نشان ہوگی۔ اس کو بین الفریقین تسلیم کیا جاتا ہے۔

پیغمبرؐ کا یہ آخری جانشین ثابت کرے گا کہ امت نے جو فیصلے کیے تھے، ان میں سے اکثر غلط تھے لیکن یہ مستقبل بعید کی باتیں ہیں جن کو تسلیم کرنے سے حدیث سازی کا مقصد فوت ہو جاتا ہے اور واضح ہو جاتا ہے کہ حدیث تو ریث وضعی تھی۔۔۔امام مہدیؑ اک فرقے کے عقیدے میں موجود ہیں اور حضرت خضرؑ والیاسؑ کی طرح زندہ ہیں۔ دوسرا کہتا ہے کہ پیدا ہوں گے، حسن و حسین کے مشترک نسب میں یعنی حضور ختمی مرتبت کے سلسلے میں، اصلاب طاہرہ اور بطون پاکیزہ سے گزر کر، آپ کی ولادت ہوگی، ~~حضرت ابراہیم کے سلسلہ انبیاء میں آخری وارث کی حیثیت سے~~ آپ تشریف لائیں گے۔ اس طرح رسول کے آخری جانشین کے لئے نسلی طہارت و وراثت کا اصول بھی

مان لیا جاتا ہے۔

عقیدے کی یہ صراط مستقیم ذخیرہ احادیث کی چند حدیثوں سے مرتب کی گئی ہے جن سے اسلام اور بانی اسلام کی سیرتیں مجروح کی گئی ہیں لیکن بعض حقائق بھی خود بخود سامنے آ گئے ہیں جو حضرت آخر زمان کے وارث ختم المرسلین ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ ان سے کسی کا یہ کہنا بھی غلط ثابت ہوتا ہے کہ انبیاء اپنی میراث نہیں چھوڑتے، جو ہوتا ہے وہ ان کی امت کا ہوتا ہے۔

اس حدیث کے غلط اور صحیح ہونے کا فیصلہ قارئین خود کریں۔ تاریخ انبیاء میں ابتدائے آفرینش سے اکثر مقامات پر پیغمبری کی میراث ثابت ہوتی ہے۔ محدث دہلوی نے حضرت آدم کے بیٹے کا نام شیث لکھا ہے اور شیث کے بیٹے کا نام انوش۔ تینوں نبی تھے۔ پھر اسی نسل سے حضرت ادریس پیدا ہوئے۔

تاریخ ابن خلدون کے حوالے سے نوح کا جو بیٹا طوفان میں ہلاک ہوا، اس کا نام کنعان تھا۔ تین بیٹوں حام، سام اور یافث سے نسل چلی۔ یہ تینوں نبوت سے سرفراز ہوئے۔ دنیاوی اثاثے میں کیا تھا؟ اس کی تفصیل معلوم ہونا ممکن ہی نہ تھا لیکن عقلی طور پر جو کچھ ہوگا وہ ملا انہیں لوگوں کو ہوگا۔۔۔ ارفخشد ابن سام انبیاء و مرسلین کے جد اعلی تھے۔ ارفخشد کی نسل میں شالخ اور شالخ سے عابر پیدا ہوئے۔ عابر کے دو بیٹے فالغ اور قحطان پیدا ہوئے پھر فالغ سے ابراہیم۔

حضرت ابراہیم کے دو بیٹے اسمٰعیل اور اسحٰق، دونوں شہرہ آفاق ہیں ابراہیم کی نسل حضرت محمدؐ بن عبداللہ تک پہنچی، جن کے بارے میں مسلمانوں کو سب کچھ معلوم ہے۔ حضرت اسحٰق انبیائے بنی اسرائیل کے جد اعلی ہیں۔ آپ سے حضرت یعقوب یعنی اسرائیل اور اسرائیل سے حضرت یوسف پیدا ہوئے۔ اس طرح حضرت ابراہیم کی توریث پیغمبری تین نسلوں تک چلی۔ انبیاء کے لئے مال دنیا کی اہمیت نہیں ہوتی مگر اولاد کو اس سے محروم کرنے کی کوئی کہانی بھی کہیں نظر نہیں آتی۔

نظیر میں آتے ہیں حضرت شعیب، حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون حضرت موسیٰ، حضرت شعیب کے داماد بھی تھے۔ حضرت شعیب کی لاٹھی حضرت موسیٰ کو وراثت میں ملی تھی جو عصاء موسوی کے نام سے ضرب المثل ہے اور حضرت موسیٰ کے بھائی حضرت ہارون کو وصی موسیٰ ہونے کا شرف بھی حاصل تھا۔

مسلک نبوت میں ایک مثال جناب سلیمان کی بھی ہے جنہیں حضرت داؤد کا تخت سلطنت باپ سے وراثت میں ملا تھا۔ (۴۰)

پھر نہ جانے کیوں حضور ختمی مرتب نے اپنی عظیم بیٹی، یگانہ روزگار بھائی اور داماد اور نوجوانان جنت کے سردار حسن و حسین یعنی اپنے بیٹوں کو میراث سے محروم کر دیا تھا۔۔۔افضل الانبیاء کی عصمت کسی اور خیال کی اجازت بھی نہیں دیتی، دوسری طرف حضرت ابوبکر کی صدیقیت پاس ادب کی مہر ہونٹوں پر لگا دیتی ہے۔

معاصرینِ صدیقیت

صدیقیت پر معاً خیال حضرت یوسف کی طرف جاتا ہے پھر خیال میں حضرت علی اور حضرت ابوذر غفاری کے نام روشن ہو جاتے ہیں۔ حضرت علی کے نام سے بحث کا موضوع چھڑ سکتا ہے اور یوں بھی آپ منصوص من اللہ تھے۔ اس سطح پر آپ کا ذکر برمحل نہ ہوگا لیکن حضرت ابوذر صحابیت کا ایک روشن ستارہ ہیں جن کی کرنیں شام کے بعض علاقوں میں آج بھی آل محمدؐ کی روشنی پھیلا رہی ہیں۔

شیعوں کے بچے کھچے سرمایہ احادیث سے دو حدیثیں پیش کی جاتی ہیں۔ ایک حضرت سلمان فارسی کے بارے میں، دوسری ربذہ کے شہید حضرت ابوذر غفاری کے لئے۔ ان حضرات کی منزل صحابیت محتاج تعارف نہیں بلکہ ناقابل انکار ہے۔

سلمان فارسی کی فضیلت میں سرور کائنات نے فرمایا۔

سلمان وہ سمندر ہے جو تمام نہیں ہوتا، وہ خزانہ ہے جو ختم نہیں ہوتا۔

سلمان کو حکمت بخشی گئی، برہان عطا کیا گیا۔

روایات متواترہ سے ثابت ہوتا ہے کہ سلمان اسم اعظم جانتے تھے۔ انہیں ثقہ محدثین میں شمار کیا جاتا تھا۔

سلمان عالم غیب و بدایا تھے، بہشت کے تحفے انہیں دنیا میں ملتے تھے۔

ایمان کے دس درجے ہیں، سلمان دسویں درجے پر فائز تھے۔

جنت ان کی مشتاق تھی۔ خدا و رسولؐ انہیں دوست رکھتے تھے۔

انہیں حضورؐ سے خلوت میں مشاورت کا شرف حاصل تھا۔ ان کی موجودگی میں جبرئیل کا نزول ثابت ہے۔ خداوند عالم نے جبرئیل کے ذریعہ انہیں سلام بھی کہلوایا حضورؐ نے انہیں منجملہ اہل بیت ہونے کا شرف دیا تھا۔ رسولؐ کے اس عظیم صحابی کے کئی معجزات بیان کئے جاتے ہیں۔

جندب بن جنادہ المعروف بہ ابوذر کے لئے چند احادیث قابل ملاحظہ ہیں ۔ ماخوذ از الاستیعاب

آسمان نے کسی پر سایہ نہیں کیا اور زمین نے کسی کو اٹھایا نہیں جو ابوذر سے زیادہ سچا ہو۔

میری امت میں ابوذر کا زہد عیسٰی بن مریم جیسا ہے۔

ابوذر زہد میں عیسٰی ابن مریم کی شبیہ ہیں۔

معصومین کے بعد صحابہ میں کوئی شخص جلالت قدر اور رفعت شان میں سلمان فارسی، ابوذر اور مقداد کے برابر نہیں گزرا۔

قیامت کے دن رب العزت کی طرف سے منادی ندا دے گا، کہاں ہیں محمدؐ بن عبداللہ کے حواری اور مخلص جو آپ کے طریقے پر مستقیم رہے اور جنہوں نے عہد و پیمان کو نہیں توڑا؟ تو سلمان، ابوذر اور مقداد اٹھ کھڑے ہوں گے۔

امام جعفر صادقؑ سے روایت ہے کہ ہمارے جد نے فرمایا: خدا نے چار آدمیوں کی محبت اور دوستی کا خصوصی حکم دیا ہے علی ابن ابی طالب، مقداد، سلمان اور ابوذر۔

ابن بابویہ نے عبداللہ بن عباس سے روایت کی ہے کہ ایک دن آنحضرتؐ مسجد قبا میں صحابہ کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے تو آپ نے فرمایا: پہلا شخص جو اس دروازے سے آئے گا وہ اہل بہشت میں سے ہے۔

یہ سنتے ہی کچھ لوگ باہر جانے کے لئے اٹھے کہ وہ پہلے داخل ہو جائیں۔ اس پر آپؐ نے فرمایا، کچھ لوگ داخل ہونے میں ایک دوسرے پر سبقت کریں گے لیکن ان میں سے جو مجھے نام آذر (شمسی مہینے) کی بشارت دے گا، وہ جنتی لوگوں میں سے ہوگا۔ عین اسی وقت ابوذر ان لوگوں کے ساتھ داخل ہوئے۔ آپ نے دریافت فرمایا: رومی مہینوں کے حساب سے کون سا مہینہ ہے ابوذر؟ ابوذر نے جواب دیا: ماہ آذر ختم ہو چکا ہے۔

آنحضرتؐ نے فرمایا: مجھے معلوم تھا، پوچھا صرف اس لئے تھا کہ دوسروں کو بھی معلوم ہو جائے کہ تم اہل جنت میں ہو۔ اسی تسلسل میں آنحضرت نے بتایا: تمہیں میرے اہل بیت کی محبت میں شہر بدر کیا جائے گا اور جلا وطنی میں وفات پاؤ گے، اہل عراق کا ایک گروہ تمہاری تجہیز و تکفین کرے گا۔

یہ بات حضرت عثمان کے عہد میں سچ ثابت ہوئی۔

اس سلسلے میں ایک نام خود بخود تاریخ کے صفحات میں روشن ہو جاتا ہے خزیمہ ابن ثابت حضورؐ کے عظیم المرتبت صحابی، مخبر صادق نے آپ کی گواہی کو دو آدمیوں کے برابر قرار دیا تھا لہذا ذوالشہادتین کہے جاتے تھے۔ یہ ارشاد گرامی دلیل ہے کہ آپ جھوٹ بول ہی نہ سکتے تھے، یعنی صدیق مکرر تھے۔ اس طرح صدق میں آپ کی منزلت توازن وتقابل سے بالاتر نظر آتی ہے۔ جنگ صفین میں آپ نے حضرت عمار یاسر کے دوش بدوش تلوار سونت کر حملہ کیا تو دو طرفہ خون کی لکیریں بناتے چلے گئے اور خلیفہ برحق کی تاریخ صداقت کے خطوط بناتے ہوئے درجہ شہادت پر فائز ہو گئے ۔۔۔ آپ کا نام صفحات تاریخ میں مسلمانوں کے خطا کار اجتہاد کو آج بھی یزید کا باپ ثابت کر رہا ہے۔

اس کے بعد صدیقیت کسی فرد واحد سے مختص نہیں رہتی لیکن ابوذر نے شام کے قیام میں فضائل اہل بیت کے چراغ جلائے اس لئے حضرت عثمان نے مدینے طلب کر کے ربذہ کے بے آب و گیاہ ریگستان کی طرف جلاوطن کیا، جہاں عالم غربت میں انہوں نے وفات پائی۔

کوئی آنحضرت کے ارشادات کا لحاظ کرتا تو وہ جلاوطن ہی کیوں کیے جاتے اور کسی کا ذکر کیا کیا جائے، جب خود حضرت علی پر تہمتوں کی بھرمار کر دی گئی تو سلمان اور ابوذر کس گنتی میں ہیں۔ اُم المومنین خدیجۃ الکبریٰ کے لئے موتیوں کے محل کی ایک روایت ہے۔ ویسی ہی صحیح بخاری میں دوسروں کے لئے موجود ہے بلکہ کچھ بہتر ہے اور ابوذر سے افضل حدیث ابوبکر صدیق، عمر فاروق اور حضرت عثمان تینوں کے لئے ہے۔ یہ حدیث ابوموسیٰ الاشعری کی مبینہ ہے اور کئی مرحلوں سے گزر کر یحییٰ نے سن کر بیان کی ہے۔

''میں ایک باغ میں نبی کریم کے ہمراہ تھا جو مدینے کے باغوں میں سے ایک باغ تھا۔ آپ ایک لکڑی پانی اور مٹی پر مار رہے تھے کہ ایک شخص آیا۔ اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ آپ نے کہا، کھول دو اور آنے والے کو جنت کی بشارت دو۔ میں نے دیکھا تو وہ ابوبکر تھے۔

پھر کسی اور نے دروازہ کھولنے کے لئے کہا۔ آپؐ نے فرمایا؟ کھول دو اور اسے جنت کی بشارت دو۔ میں نے دیکھا تو وہ عمر تھے۔ اس کے بعد پھر ایک اور شخص نے اندر آنے کی اجازت مانگی۔ آپ ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے تھے، اٹھ کر بیٹھ گئے اور فرمایا، اسے بھی جنت کی بشارت دو لیکن اس مصیبت کے ساتھ جو اسے پہنچے گی۔ میں نے دروازہ کھول کر دیکھا تو وہ عثمان تھے۔،، (۴۱)

اساس خلافت

سلسلہ بیان کو آگے بڑھانے سے قبل اس نکتے کی تصریح ضروری ہے جس کو کاروان خلافت کا نقطہ آغاز کہا جاسکتا ہے اور جس کا سہارا لے کر انعقاد سقیفہ کا جواز پیدا کیا گیا تھا یعنی سورہ شوریٰ کی ایک آیت۔،،تم اپنے معاملات میں باہم مشورہ کرلیا کرو۔،، حکم اپنے مسائل کے لئے تھا یہ تو نہیں کہا گیا تھا کہ دینی مسائل کو آپس کے مشورے سے ہاتھ میں لے لیا کرو۔ دین خدا کا، لے کر آنے والا افضل الانبیاء اور اس کے نفاذ اور بقا کے لئے قبائلی نظام کا طریقہ اکیا اس کو مداخلت فی الدین نہیں کہتے؟ جواب یہ دیا گیا ہوگا کہ جب نبی مطلق نے اپنے بعد کے لئے کسی کو نامزد نہیں کیا تو کیا کیا جاتا اور اس کے لئے ایک روایت بھی گڑھ لی گئی کہ آنحضرت نے کسی کو اپنا خلیفہ نہیں بنایا، جبکہ اسی صحیح بخاری میں حضرت عائشہ سے مروی ایک حدیث ملتی ہے کہ آپ نے آخری دنوں میں ام المومنین سے کہا تھا کہ ابوبکر اور ان کے بیٹے کو بلوالو تاکہ میں ابوبکر کے لئے اپنی جانشینی لکھ دوں، حالانکہ میں جانتا ہوں کہ کسی اور کو نہ مسلمان مانیں گے اور نہ خدا۔

اتنے صریحی فرمان کے بعد یہ کہنے کی ضرورت کیا تھی کہ کسی کو اپنے بعد کے لئے نامزد نہیں کیا اور اس کے بعد بھی روایت متواترہ کی رو سے امامت نماز کے لئے حیات کے آخری تین دنوں میں خود حضورؐ نے اپنی جگہ پر حضرت ابوبکر کو بھیج دیا یعنی عملی طور پر بھی جانشین بنادیا۔ باالفاظ دیگر جب حضور بقید حیات تھے تو ابوبکر خلیفہ بن چکے تھے اور لوگ انہیں جانشین پیغمبر تسلیم بھی کر چکے تھے۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ جو بات عملاً ہو رہی تھی اسکو لکھ کر دینے کے لئے جب حضورؐ نے لکھنے کا سامان طلب کیا تو حضرت عمرؓ مانع کیوں ہوئے اور ایسی گستاخی کے مرتکب ہوگئے جو کبھی کسی نبی کے امتی نے اپنے ہادی برحق کے ساتھ نہیں کی اس پر مستزاد مرنے کے بعد ایسی بیوفائی کی جس کی نظیر تاریخ انبیاء میں کسی نبی کے مقلدین کی طرف سے نہیں ملتی کہ میت کو چھوڑ کر جانشینی کو عوامی شکل دینے کے لئے چلے گئے۔

ان حالات سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کچھ غلط نہ ہوگا کہ حضرت ابوبکر یا کسی اور کے لئے کچھ نہیں کہا تھا شریعت الہیہ کے آخری علم بردار نے، جو کچھ کہا تھا، وہ صرف ابوطالب کے بیٹے کے لئے

جس کو دعوت ذی العشیرہ سے غدیر خم تک مسلسل دہراتے آئے تھے اور مباہلے میں جس پر مہر دوام ثبت کردی تھی۔ دنیا نے دیکھا تھا کہ ابن ابی طالب پوری حیات طیبہ میں باپ کا کردار ادا کرتا رہا تھا۔ رزم و بزم ہر جگہ اسلام کے اٹھان سے تکمیل دین تک اس نے جو خدمات انجام دی تھیں۔ گویا وہ پیدا ہی دین برحق کے لئے ہوا تھا اور اس کی شخصیت اور تلوار نے جبین اسلام پر اپنا نام لکھ دیا تھا۔ کاروان اسلام کے سفر میں حضرت ابو بکر بلاشبہ اپنے سن و سال کی بزرگی کے ساتھ کاروان سالار کے ہمراہ رہے تھے لیکن جواں سال علی تو ہر منزل پر اپنے عمل اور سیرت سے روح کارواں کا کردار ادا کرتے رہے۔ ابو طالب نے گہوارہ تربیت سے جس سرفروشی کا آغاز کیا تھا علی نے گوشہ قبر تک اس کو اختتام پر پہنچایا لہذا بعد کے فرائض آنحضرت کسی اور کو کس طرح سونپ سکتے تھے!

دوست دشمن سب جانتے تھے کہ علی قوت بازوئے پیغمبرؐ، بزم میں مرضی داور اور رزم میں سر سے پیر تک حیدر رہے تھے۔۔۔ حضورؐ کی زندگی میں ہر دعویٰ ہمسری باطل ہوتا اس لئے بعد وفات ایسے وقت میں سقیفہ کا التزام کیا گیا، جب علی تجہیز و تکفین میں لگے ہوئے تھے ابو بکر کی نامزدگی کی حدیث اس لئے نہیں پیش کی گئی کہ اصحاب کبار پیغمبرؐ برحق کی طرف سے خلافت علی کے مسلسل ارشادات کے شاہد تھے۔

خردمندان عرب اس منصوبے میں کامیاب ہوئے اور حضرت ابو بکرؓ خلیفہ رسولؐ بن گئے لیکن اپنے بعد کے لئے حضرت عمر کا نام لے لیا۔۔۔ حضورؐ نے ان کے بقول کسی کو خلیفہ نہیں بنایا تھا اور خود مسلمانوں پر چھوڑ دیا تھا تو انہیں امت مسلمہ کا حق غصب کر لینے کا کیا حق تھا جو سنت رسول کے بھی خلاف تھا اور ان کی دیانت پر ایک دھبہ بھی تھا اس کے بعد بھی صدیق رہے، بلکہ صدیق اکبر! حضرت عمرؓ نے اتنا تو کیا کہ چھ آدمیوں کی ایک مجلس مشاورت بنا دی مگر قیود ایسی عائد کر دیں کہ سارے اختیارات عبدالرحمٰن کے ہاتھ میں رہے۔ وہ جانتے تھے کہ علیؑ نے جب اتنے جبر و تشدد کے باوجود بیعت نہیں کی تو سیرت شیخین پر عمل کرنے کی حامی کیا بھریں گے اور وہی ہوا، حضرت عمر نے جو سوچا تھا کہ حضرت عثمان خلیفہ بن گئے۔ انھیں بجا طور پر فاروق کہا جاتا ہے کہ انہوں نے حضرت ابو بکرؓ کی مبینہ اساس اور بعد کے عمل میں فرق کو پہچانا تھا اور ایک ایسا راستہ اختیار کیا تھا کہ رند کے رند رہے، ہاتھ سے جنت نہ گئی!

بیعت علی کے لئے کہا جاتا ہے کہ جناب فاطمہ کے مرنے کے چھ ماہ بعد بیعت کر لی تھی۔ رسولؐ کی بیٹی جس کی صورت دیکھنا پسند نہ کرتی، علی اس کی بیعت کر لیتے! لوگوں نے علی کو اپنا جیسا سمجھ

لیا تھا۔۔۔اور اگر بیعت کر لی تھی تو ان کی سیرت پر عمل کرنے کی حامی کیوں نہیں بھری، خلافت چھوڑ دی اور سیرت شیخین پر عمل نہیں کیا۔۔۔ کہنے والوں کو تو بس اپنی سی کہنا ہے ان سے تو خلیفہ شام اچھا تھا کہ بیٹے سے کہہ دیا تھا کہ خبردار علی کے بیٹے سے بیعت کا سوال نہ کرنا مگر یزید نے باپ کا کہنا نہیں مانا اور حسین نے اپنا سر دے کر بتا دیا کہ ہم وارثان پیغمبرؐ ہیں، ہم سے جب کبھی سوال بیعت ہوگا تو کربلا کی نظیر دہرائی جائے گی!

حضرت عثمان کے بعد علی کی خلافت میں جو کچھ ہوا، وہ عرض کیا جا چکا ہے۔۔۔اب پچھلے تمام کرداروں کا تحفظ حضرت معاویہ کو کرنا تھا۔ اس فرض کو انہوں نے اس خوبی سے نبھایا کہ اسلام میں اتنی قلب ماہیت پیدا کر دی کہ حضرت ابوبکر سے خود معاویہ کی ذات تک اور ان سے مستقبل کے ہر جانشین کفر و ایمان تک کوئی دائرہ اسلام سے خارج نہ ہو سکے۔۔۔ مسلمانوں کے امام اعظم کا فتویٰ اسی کی میزان ہے۔

کثرت احادیث کی اس بساط میں کفر ساز ایمان یا ایمان کفر ساز کی خصوصیات بھی پائی جاتی ہیں اور منافقت کے کرداروں کو ظاہر کرنے کا مواد بھی مل جاتا ہے ایک فائدہ بدیہی طور پر یہ تو ہوا ہی کہ حنفیت، مالکیت، شافعیت اور حنبلیت سب کو اپنے حق بجانب ہونے کی حدیثیں میسر آ گئیں۔

ان کے مابین آپس میں کچھ زیادہ فرق نہیں تھا۔ آج سے ساڑھے تین سو سال پہلے وہابیت کا ایک مسلک تازہ پیدا ہوا تو اس کو بھی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی سب سے الگ بنی ہوئی مسجد میں آویزاں کرنے کے لئے طغرے بھی مل گئے اور حدیث کے ایسے جواہر پارے بھی جن سے اجتہادی نظریات کی زیب و زین بھی ہو جاتی ہے۔

ضرب کاری لگی تو ماضی کے سید بطحیٰ ابو طالب کے فرزند عظیم پر جو بعد رسولؐ، اسلام کی عظمت کا علامیہ بھی تھا اور آج ہادیان عالم کی روحانی بساط پر جس کے چراغ جلتے ہیں اور ایک بدنصیب گروہ پر جو رسولؐ کی محبت میں ان کی برگزیدہ بیٹی کے در کا گدا بنا رہا پھر بھی یہ گدائی اس کو دولت کونین ملنے کے برابر ہے جس کو ہمیشہ اس نے اپنی خوش بختی کی علامت قرار دیا ہے۔

حدیث ساز بلکہ اسلام ساز معاویہ ابن ابی سفیان کا مقصد بھی شاید یہی تھا کہ سقیفہ بنی ساعدہ سے جو اسلام کے نام پر اسلام کو قتل کرنے کی ریت قائم ہوئی تھی، اس پر وہ مہر ثبات لگا دے۔۔۔ حصول خلافت کے لئے خلیفہ شام نے جو ہتھکنڈے استعمال کئے تھے، ان سے وقتی طور پر یہ

مقصد تو پورا ہو گیا تھا لیکن ایک خدشہ لاحق تھا کہ شاید فاطمہ زہرا کا جلی نام کبھی اتنی تابندگی دکھا دے کہ مسلمانوں کو اسلام کی صحیح ڈگر نظر آ جائے، کثرت احادیث نے اس خطرے کو بھی ہمیشہ کے لئے ٹال دیا اور سن وسال کی دس بارہ دہائیاں گزرنے کے بعد ایسے مسالک فقہ پیدا ہو گئے جن کا اختلاف کبھی ختم ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔ اس میں حدیث سازی کے ان زاویوں کو بڑا دخل ہے جن کے پیش نظر ان کی تراش کی گئی تھی۔ عمل کو ایک دن عدل کی میزان پر تولا جائے گا۔

راویان حدیث

شام کے فرمانراو نے یہ عمل صرف علیؑ کے وقار کو مجروح کرنے کے لئے اور ان کی منزلت ختم کرنے کی خاطر شروع کیا تھا اس کے ساتھ ساتھ حدیث کی جہتیں متعین کرنے کے لئے راویوں کے ناموں میں ایک خاص التزام بھی کیا تھا۔ بعض ایسے نام شامل کرائے تھے جو رسولؐ کی ثقہ احادیث کے راوی تھے۔ اس طرح سچی حدیثوں کو یا تو غیر معتبر بنایا یا جھوٹی حدیثوں کو سچا ثابت کیا۔ بعض ایسے ناموں کے حوالے بھی سلک روایات میں داخل کئے جو خانوادہ رسالت کے مقرب تھے۔ اول الذکر میں تھے عمر ابن ابی سلمہ، معاذ ابن جبل اور براہ بن عاذب وغیرہ، آخر میں عبداللہ ابن عباس اور عبداللہ ابن مسعود وغیرہ جن کے نام خطیب منبر سلونی کے ارشد تلامذہ میں لئے جاتے ہیں۔

عبداللہ ابن عباس کا مکالمہ خلیفہ شام کے ورود مدینہ میں لکھا جا چکا ہے۔ قیس بن سعد نے اگر شام کے مطلق العنان خلیفہ کو دندان شکن جواب دیا تھا تو کچھ تعجب خیز نہیں، انصار کی تلواریں ان کی پشت پر تھیں مگر عبداللہ ابن عباس کی حق گوئی جان کی پرواہ کئے بغیر صرف مودت اہل بیت کی ترجمان ہو سکتی ہے۔۔۔ جو شخص علیؑ پر الزام تراشی کا منہ توڑ جواب دے سکتا تھا، وہ اور علی کے فیصلوں میں غلطیاں نکالے؟ عقل تو باور نہیں کرتی۔ صحیح مسلم کی چند روایات ملاحظہ ہوں۔

"پھر انہوں نے (عبداللہ بن عباس نے) حضرت علی کے فیصلوں کو منگوایا۔ ان میں سے کچھ باتیں لکھنے لگے۔ بعض فیصلوں کو دیکھ کر کہا خدا کی قسم، حضرت علی نے ایسا فیصلہ نہیں کیا۔ اگر کیا ہے تو وہ بہک گئے۔"

"طاؤس سے روایت ہے کہ ابن عباس کے پاس حضرت علی کے فیصلوں کی کتاب آئی تو انہوں نے سب کو مٹا دیا مگر ایک ہاتھ کے برابر رہنے دیا۔ شاید ان کے نزدیک روایت اس کی صحیح نہیں تھی۔

''ابو اسحٰق نے کہا۔،،حضرت علیؑ کے بعد جو لوگوں نے ان کی روایات بیان کیں تو حضرت علیؑ کے ایک رفیق نے کہا۔ خدا غارت کرے ان کو جنہوں نے علم کو بگاڑ دیا۔،،

''ابو بکر بن عیاش سے روایت ہے کہ میں نے منیزہ سے سنا، وہ کہتے تھے کہ حضرت علی سے جو لوگ روایت کرتے تھے، روایت مانی نہ جاتی جب تک عبداللہ بن مسعود کے ساتھی ان کی تصدیق نہ کر دیتے۔،، (۴۲)

ان روایات کے حاشیے پر امام نوؤی کا نوٹ ہے۔

حضرت علی خلفائے راشدین میں سے تھے اور رسولؐ کے عزیز ساتھی، رفیق اور علم کے دریا تھے۔ جب ان کے فیصلوں میں غلطی ہو تو اور عالموں اور مولویوں کے سب حکم کیونکر صحیح ہو سکتے ہیں!

اس تبصرے میں نہ قصور امام نوؤی کا ہے اور نہ امام مسلم بن حجاج کا بلکہ کارنامہ ہے مسلمانوں کے اس بطل عظیم کا جس نے وضعی احادیث کا اتنا بڑا ذخیرہ کرا دیا کہ غلط اور صحیح احادیث کا امتیاز ہی ختم ہو گیا۔ امام مسلم نے تو اپنی دانست میں صحیح احادیث ہی کو لیا ہو گا مگر وہ کرتے کیا؟ صحیح احادیث ہوں گی بھی تو مسخ کر دی گئی ہوں گی۔ جو کچھ تھا، اسی میں سے تو مجموعے کو مرتب کرنا تھا اور بات تھی کم سے کم ڈیڑھ سو سال پہلے کی۔ تصدیق کس سے کرائی جاتی لہذا تاریخ اسلام بھی مرتب ہوئی۔ اسلام کے سارے کردار بھی اور خود اسلام بھی۔۔۔اب مسلمان اسی کو سب کچھ سمجھتے ہیں اور یہی ان کا موروثی عقیدہ بھی ہے۔

شیعان علی کا راستہ پہلے ہی دن سے مختلف تھا۔ وہ درِ زہرا کو آستانہ نبوی قرار دیتے اور علی کو سجادہ نبوت پر امامت کا علامیہ اول۔ خلافت نما شاہی کا تشدد بھی انہوں نے برداشت کیا اور مسجد کوفہ میں شہادت امیر المومنین کے بعد صبر کی منزل سے گردش زمانہ کی نیرنگی بھی دیکھی پھر منظر عام سے ناپید ہو کر سخت جانی میں دولت ایمان کا تحفظ کیا اور اس کے بعد ان دنوں سے دوچار ہوئے جب انہیں کفر و نفاق کی آلودگی سے متہم کیا گیا حتیٰ کہ خم غدیر کے مولیٰ کو جادہ اسلام سے بھٹک جانے کا مرتکب بھی قرار دیا جانے لگا۔۔۔اب بھی ایک گروہ کا یہی عقیدہ ہے۔ علیؑ کا نام تاریخ سے نکلوا دینے پر قدرت نہیں ہے کیونکہ غزوات اسلام میں علی کی جگہ لینے والا کوئی بنا نہیں۔ خالد بن ولید کا نام لے لیا جاتا مگر وہ حلقہ اسلام میں بہت دیر سے داخل ہوئے۔

اکتفا صرف اسی پر نہیں کی گئی بلکہ علیؑ کے ہر معتقد کی روایت کو غلط ٹھہرا دیا گیا۔ معاویہ نے

ان کی شہادت کو بے اعتباری کا درجہ دیا تھا، احادیث کے ذخیرے نے یہ سند بھی دیدی کہ نسلین گزر جانے کے بعد بھی انہیں اسلام میں برداشت نہیں کیا جاتا۔ امام ابن سیرین نے کہا تھا کہ علیؑ کے بارے میں جو حدیثیں ہیں، ان میں سے اکثر جھوٹی ہیں، امام نودی نے اس کی تصدیق بھی کردی اور اس کے ساتھ ہی شیعان علی کو دین پر ایک دھبہ قرار دیا۔

''اسی وجہ سے محدثین نے جابر بن یزید کو ضعیف کہا ہے کیونکہ وہ رافضی تھا۔ رجعت سے مراد یہ ہے کہ رافضیوں کا اعتقاد ہے کہ حضرت علی زندہ ہیں اور ابر میں رہتے ہیں۔ جب ان کی اولاد میں امام برحق پیدا ہوں گے تو وہ ابر میں سے اپنے شیعوں کو آواز دیں گے کہ اس کے ساتھ شریک ہو جائیں جس کو کوئی عاقل قبول نہ کرے گا۔،، (۴۳)

امام نودی نے صحیح مسلم کی ایک روایت ف ۴۴ ص ۴۳ کے سلسلے میں شیعوں کا جو عقیدہ تحریر فرمایا ہے وہ نہ جانے کس زمانے کے شیعوں کا تھا کیونکہ عقیدہ تو ان کا ایک ہی ہے جو شروع سے چلا آرہا ہے۔ معلومات کا جب یہی عالم ہے تو ان کی دینی رہنمائی کیا ہوگی ـ ـ ـ اطلاع عام کے لئے عرض ہے کہ امام مہدیؑ ظہور فرمائیں گے تو جبریل آسمان سے آواز دیں گے، نہ کہ ابر سے حضرت علی پکاریں گے اور جہاں تک حضرت علی کا تعلق ہے، ان کے زندہ ہونے کی حقیقت امام نودی کو معلوم ہوگی شیعوں نے تو ان کے جسد خاکی کو نجف میں سپرد لحد کیا تھا جہاں ان کا مشہد مقدس آج بھی زیارت گاہ انس و ملک ہے، البتہ جس طرح وہ تخلیق سے پہلے عالم نور میں تھے، اسی طرح آج بھی ہیں۔ امام نودی کو اتنا تو علم ہوگا ہی کہ احناف کے اعتقاد میں خاتم المرسلین کا نور تخلیق اول ہے شیعہ اس نور کے مشتقات میں انوار علی و فاطمہ و حسنین کو بھی مانتے ہیں جو حیثیت حضورؐ کے نور کی ہے، اسی کے ذیل میں علی کا نور بھی آتا ہے۔ علی خلقت میں بھی جزو نور اول، دنیا میں بھی سایہ رسالت اور مرنے کے بعد بھی اپنے مرشد کامل کے ساتھ۔ علیؑ نے آخری دنوں میں آپ سے پوچھا تھا کہ امت اہل بیت سے منحرف ہو جائے تو مجھے کیا کرنا ہے؟ آپ نے فرمایا تھا کہ حوض کوثر پر میرے پاس پہنچنے تک صبر کرنا۔ علی نے اس وصیت پر عمل کیا اور شدید مصیبتیں جھیلتے جھیلتے حضورؐ سے جا ملے۔ اب اگر حضور زندہ ہیں تو علی بھی ان کے ساتھ زندہ ہیں۔

یہ شیعوں کے نصیب کی بات ہے کہ ان کے لئے حقائق کو مسخ کر کے الزام تراشی کر لی جاتی ہے اور مفروضات نسل بعد نسل بدخیالی کا ماحول پیدا کرتے رہتے ہیں۔ اس جادہ عمل میں علماء اور عوام کا مسلک ایک ہی ہے۔ علماء بھی بے گناہوں کو مطعون کر کے خوش ہوتے ہیں اور عوام بھی۔

شاید یہی ان کا تقاضائے ایمان ہے۔

ماضی اور حال کا اس سلسلے میں ایک ہی عالم ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شیعہ عاشور کو سنی بچوں کی قربانی کرتے ہیں۔ سنیوں کو پانی بھی دیتے ہیں تو تھوک تھکر علی کو خدا کہتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ پچھلے دنوں کی بات ہے کہ ایک بڑے عالم نے اپنے بیٹے سے میری گہری دوستی دیکھ کر مجھے سنی سمجھ لیا اور ایک نشست میں مخولہ باتوں کے ساتھ ساتھ کہنے لگے کہ یہ ناہنجار طبقہ عید غدیر کو مردوں کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر عورتوں کے ساتھ جشن غدیر مناتا ہے اور جو عورت جس مرد کے سامنے پڑ جاتی ہے، وہ اس دن کے لئے اس کی بیوی بن جاتی ہے۔ مولانا کے بیٹے نے شاید میری مروت میں اس کی تردید کی اور کہا کہ وہ شیعوں میں مسلسل اٹھتا بیٹھتا ہے۔ اس نے ایسی کوئی بات نہیں دیکھی، عاشور کے دن اور غدیر کی خوشی میں بھی شریک ہوا۔ اس پر مولانا بیٹے پر بہت ناراض ہوئے اور کہا۔ تم ان بے دینوں سے تعلقات کیوں رکھتے ہو۔ وہ نہ جانے کیا کیا کرتے ہیں مگر دوسروں کے سامنے منکر ہو جاتے ہیں۔ باپ بیٹے میں دیر تک ردوقدح ہوتی رہی لیکن مولانا اپنے مفروضات میں یقین کی منزل سے پیچھے نہیں ہٹے۔

یہی صورت ماضی میں بھی رہی ہوگی۔ بنی امیہ جہم بن صفوان کے فلسفے کو عین ایمان سمجھتے تھے۔ جہم کا کہنا تھا کہ خدا پہلے بادلوں کو اڑاتا پھرتا تھا اور بنی امیہ اس کو مانتے تھے۔ علی کو ید اللہ کہا جاتا ہے۔ امام نودی نے ید کو اڑا کر صرف اللہ رہنے دیا اور انہیں زندہ قرار دے کر ابر کو ان کا مستقر بنا دیا۔

اتنے بڑے بڑے اہل علم سے ایسی نسبتیں حد ادب سے باہر ہو جاتی ہیں مگر حقیقتوں کا اظہار بھی ضروری ہے۔

صحیح مسلم میں کئی راویوں کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ رافضی تھے اس لئے معتبر نہیں سمجھے جا سکتے۔ ان میں ابونعمان حارث بن حصیرہ بھی ہے جو کوفے کا رہنے والا یعنی راست گو تھا مگر خطا کار کہا جاتا۔ اس کی نسبت رفض کی طرف دی جاتی تھی۔ یعنی سیرت کتنی اچھی کیوں نہ ہو لیکن علیؑ کا دوست ہو تو قابل اعتبار نہیں۔ آخر میں ایک نام پیش کیا جاتا ہے۔ ابان بن ابی عیاش کا۔ روایت ہے:۔

''خلیفہ بن موسیٰ نے کہا، میں غالب بن عبیدہ اللہ کے پاس گیا۔ وہ مجھ کو لکھوانے لگا حدیث بیان کی مجھ سے مکحول نے۔ اتنے میں اس کو پیشاب لگا اور وہ اٹھ کر چلا گیا۔ میں نے اس کی کتاب کو کھول کر دیکھا تو اس میں لکھا تھا: حدیث بیان کی انس سے سن کر ابان نے، انس نے فلاں

سے سنی تھی۔ یہ دیکھ کر میں نے اس سے روایت کرنا چھوڑ دیا اور اٹھ کر چلا آیا۔،، (۴۴)

ایک شیعہ محدث

'' ابان ابن ابی عیاش سے حدیث لینا اس جرم میں ترک کر دیا گیا کہ وہ علیؑ کے طرفدار تھے اور یہ اصول غلط بھی نہیں تھا کہ جب آقا ہی کو قابل اعتبار گردانا نہیں جاتا تھا تو وفادار غلاموں پر بھروسا کیسے کیا جا سکتا۔۔۔ بلاشبہ ابان محب اہل بیت تھے اور انہوں نے اقوال رسولؐ کے تحفظ کا حق ادا کیا۔

'' ابان کا زمانہ سن ہجری کی آٹھویں دہائی کا ہے۔ معاویہ بن ابی سفیان کو گزرے ہوئے پندرہ بیس سال گزر چکے تھے۔ حدیث سازی کی رفتار کافی سست پڑ چکی تھی لیکن ایک کار عظیم شدت کے ساتھ جاری تھی۔ شیعان علی اور ارشادات نبوی کا استیصال کلی، کیونکہ ان دونوں کی موجودگی غاصبوں کو بے نقاب کرتی تھی اور آل محمدؐ کے فضائل بیان ہونے سے ان افراد کی شخصیتیں مجروح ہوتی تھیں جو پیغمبر برحق کی آنکھ بند ہونے کے بعد سے سریر آرائے خلافت ہوتی آئی تھیں لہذا ان دونوں کو جڑ سے اکھاڑنا تھا۔ بنی امیہ کے پہلے خلیفہ کی حدیث سازی نے ایک طرف تو اصل حق داروں کی کردار کشی کی، دوسری طرف سربراہان مملکت اسلامیہ کی سیرتوں کو زمین سے آسمان پر پہنچایا، ان مساعی میں ہر لحاظ سے کامیابی ہوئی۔

اور اب تو امویوں کو اس جادہ ناہموار پر چلتے چلتے نصف صدی گزرنے والی تھی لہذا کل کے کچے راستے پکی پکڈنڈیوں کی صورت اختیار کر گئے تھے اور نئی نسل کے ایمان میں تحفظ اسلام کے نام پر نسل رسولؐ اور ارشادات رسول کی بیخ کنی بھی رچ بس گئی تھی۔ عمال حکومت کو بھنک بھی مل جاتی کہ شیعوں کی احادیث کسی مقام پر پائی جاتی ہیں تو وہ ان کے پیچھے لگ جاتے اور انہیں برآمد کر کے نذر آتش کیے بغیر نہ رہتے۔

دوسری طرف بچے کھچے فدائیان اہل بیت اپنی جانیں داؤں پر لگا کر ان کی حفاظت کرتے رہتے۔۔۔ چھوٹا سا ایک مجموعہ سلیم بن قیس ہلالی کے پاس تھا جس کی اطلاع عبدالملک کے عالموں کو مل گئی تھی لہذا حجاج بن یوسف عامل عراق نے ایک گشتی فرمان جاری کر دیا کہ سلیم کو تلاش کر کے وہ مجموعہ حاصل کیا جائے اور اس کو تلف کر دیا جائے۔ یہ مجموعہ اگرچہ بہت بڑا نہیں تھا لیکن آج اس کا شمار ان چار کتابوں میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتا ہے جو چار سو میں سے کسی حد تک اصل اسلام

کی علامت ہیں ۔سلیم نے جو حدیثیں لکھی تھیں، وہ ان کی دانست میں حضرت علی، سلمان فارسی اور ابوذر غفاری کی مصدقہ تھیں ۔ زمانے کے ایمان دشمن ماحول نے ان کو بتا دیا تھا کہ ان فرمودات کی حیثیت طوفانی تاریکیوں میں ڈوبتے ہوئے آفتاب کی آخر کرنوں سے کم نہیں ہے لہذا وہ ان کو بچانے کے لئے ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف چل پڑتے تھے۔

حجاج بن یوسف کے سپاہی شکاری کتوں کی طرح سلیم کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ نوے سال کی عمر میں وہ دیوبند جا پہنچے تو ان کی ملاقات چودہ سال کے ایک نوجوان سے ہوئی جس کا نام ابان بن ابی عیاش تھا۔علیؑ کے کسی چاہنے والے نے اس کا پتہ دیا تھا۔سلیم ابان سے مل کر بہت خوش ہوئے اور ابان نے بھی ایک مومن کی حیثیت سے حق میزبانی ادا کیا۔ سلیم کو جب اس کی طرف سے اطمینان ہو گیا اور بیماری میں وقت آخر ہونے کا یقین بھی تو انہوں نے ابان کو بتایا کہ ان کے پاس احادیث صحیحہ کی ایک کتاب ہے جس میں بعض احادیث عمر ابن ابی سلمہ، معاذ بن جبل اور براء ابن عاذب کی بیان کی ہوئی بھی ہیں اور ان کی تصدیق امیر المومنین اور سلمان وابوذر سے بھی کرائی گئی ہے۔ان کی صحت میں کوئی شک نہیں ہے۔ میں اپنے بعد تمہیں اس کا امانت دار بناتا ہوں ۔اس کی حفاظت کرنا۔شاید کبھی وقت سازگار ہو تو یہ حدیثیں اندھوں کو مسلک آل محمد دکھانے کا کام دیں گی۔ ابان نے اس خزانہ ایمان کو دونوں ہاتھ پھیلا کر قبول کیا اور سلیم کے انتقال کے بعد اس کی حفاظت اس طرح کرتے رہے جس طرح خود سلیم کرتے آئے تھے۔

حسن بصری جنگ جمل میں ام المومنین عائشہ کے ساتھ تھے۔اس کے بعد انہیں اپنے عمل پر پچھتاوا ہوا تھا۔ابان نے وہ مجموعہ انہیں بھی دکھایا تھا اور حسن بصری اس کو دیکھ کر اتنا روئے تھے کہ ان کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔

ابان نے یہ مجموعہ امام زین العابدین کو حج کے زمانے میں دکھایا تھا، عمر ابن ابی سلمہ، ابو الطفیل عامر بن واثلہ نے ایک مرتبہ محمد باقر نے بھی احادیث کی سند لی تھی اور مرنے سے قبل عمر بن اذینہ کے حوالے کر دی تھی، جنہوں نے ابان کی طرح اس کی حفاظت کی یہ مجموعہ آج ایک یادگار شکل میں باقی ہے۔" (۴۵)

ابان نے کچھ حدیثیں آئمہ کرام اور ان کے اصحاب عظام سے سن کر ان میں شامل کر دی تھیں لیکن ایسے کسی مجموعے کو وضعی اور اصلی حدیث صحیح کے لئے سیرت آئمہ پر پورا اترنا ضروری ہے اس کی کئی حدیثوں کو پورے اعتماد کے ساتھ مستند نہیں کہا جا سکتا۔ یہ حدیث بھی دوسرے مجموعوں کی

طرح ہے۔ حدیثوں کی مماثلت کے سبب خس وخاشاک سے پاک قرار دیا نہیں جا سکتا۔

حیرت ہوتی ہے بنی امیہ کے فرزند عظیم کی ذہانت اور فطانت پر کہ اسلام، ہادی اسلام اور علامات اسلام کی سیرتیں تبدیل کرنے کے لئے اتنی متضاد حدیثیں تصنیف کرائیں، راویون کے ناموں کا استعمال کچھ اس طرح کیا کہ معتبر کو غیر معتبر اور غیر معتبر کو معتبر بنا دیا، احادیث کو پھیلایا بھی اور یکجا بھی کر دیا پھر تدوین حدیث و تاریخ کا وقت آیا تو ایک ایک بات کے کئی کئی بیان پائے گئے اور راویوں میں ایک طرف تو علیؑ، شیعان علی اور رفقائے علی نا قابل اعتبار قرار دیئے گئے، دوسری طرف عامر ابن واثلہ، عمر بن ابی سلمہ اور عمر بن اذینہ وغیرہ کے نام راویوں میں شامل کروائے لہٰذا فیصلہ کرنے والوں نے جو بھی فیصلہ کیا، وہ غلط بھی ٹھہرا اور صحیح بھی۔

اس کے بعد کوئی صحیح کہے تو غلط اور کوئی غلط کہے تو صحیح اور بات بڑھے تو کہنے والوں میں خون خچر ہو جائے۔ غلط نہیں کہا تھا مدبر اعظم نے کہ تو سہی جوان لوگوں کو اونٹ اور اونٹنی کی تمیز ختم نہ کرا دوں!

اور آج تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ ہر دور میں مختلف نظریات کے فریق کبھی خون کی ہولی کھیلتے ہیں اور کبھی ہر سال کے محرم میں خون سے نوروز کا جشن منا کر نئے سال کا افتتاح کرتے ہیں۔۔۔ احسان عظیم ہے یہ اس دور جاہلیت کے ورثہ کا جس نے خنجر دونوں کے ہاتھوں میں تھما دیئے ہیں، لیکن خود اس کے ہاتھوں پر کوئی چھینٹ نہیں اور دامن پر کسی داغ کے آثار تک پائے نہیں جاتے۔ کوئی دوربین بتاتی بھی ہے کہ وہ کھڑا ہے آگ لگانے والا تو لوگ اس کی آنکھیں پھوڑ دینے پر تیار ہو جاتے ہیں اور ان کی آواز کی گرج دور دور تک سنائی دیتی ہے کہ خبردار صحابی رسول اور کاتب وحی کو ایک بات بھی نہ کہنا، حالانکہ نہ وہ کاتب وحی تھے اور نہ صحابی بلکہ محافظ تھے عرب کی روایات قدیمہ کے اور بانی تھے مسلمانوں میں تفرقہ پردازی کے۔

بنگاہ غائر دیکھا جائے تو بعد رسولؐ جو کچھ ہوا تھا، وہ اگرچہ کسی طرح جائز نہیں تھا مگر مرشد کامل کی وصیت کے مطابق علیؑ کے صبر و تحمل نے اس کو تاریخ اسلام بننے سے نہیں روکا۔ وہ دور کسی بہت بڑے اختلاف کے بغیر گزر گیا اور پیغمبرؐ برحق کی اولاد کو چوتھی منزل پر اس کا حق بھی مل گیا۔ اس کے بعد ممکن تھا کہ عمارت کی خشت اول کی کجی امتداد زمانہ سے سیدھی ہو جاتی لیکن ماضی کے ابوسفیان کا کردار پس منظر سے پیش منظر میں آ گیا اور بنا بنایا کھیل اس طرح بگڑا کہ اس کا بن سکنا اب دائرہ ممکنات سے باہر ہے۔

اسلام کا نظام اگرچہ ملوکیت کے راستے پر جا پڑا تھا لیکن اس سے افادیت دین کے پہلو بھی برآمد ہوئے تھے۔ جانبین کی فقہ کی رو سے جانشین رسول سے بغاوت خود رسولؐ سے بغاوت کے مترادف تھی۔ یہ بغاوت جس نے کی وہ مجرم اور ارشاد پیغمبرؐ کی رو سے عمار یاسر کا قاتل باغی تھا۔۔۔ لیکن باغی کی برش شمشیر نے ہر حق پسند کی زبان کاٹ دی اور کم ظرفوں کے منہ زور جواہر سے بھر دیئے تو انہوں نے ایسا کچھ کر دکھایا کہ ایک اسلام کے بجائے کتنے ہی اسلام پیدا ہو گئے اور ہر فقہ کا علم بردار داعی ہے کہ اسلام ہمارا ہے۔۔۔ خود اسلام مسلمانوں سے پوچھتا ہے کہ یہ کس کا کیا دھرا ہے؟ آل محمدؐ کا تو ہو نہیں سکتا، وہ تو اتنے مصائب میں مبتلا تھے کہ زبان بھی ہلا نہ سکتے۔۔۔ پھر کس نے کیا؟ مسلمان سوچ سمجھ کر جواب دیں!

بنی امیہ کا نصیب العین

حضرت عثمان کے آغاز خلافت میں اک روز ابوسفیان نے سوق مکہ میں نعرہ لگایا تھا۔

''باشمیو! حکومت ہمارا حق تھی، ہم نے لے لی، دیکھ لو ہمارے بچے خلافت سے کھیل رہے ہیں۔''

ابوسفیان کے الفاظ نسلی ذہن کے ترجمان ہیں اور حکومت اور خلافت کے آہنگ کو بھی ظاہر کرتے ہیں۔ بنی ہاشم سے بنی امیہ کی چشمک کو اگر اہمیت نہ دی جائے تب بھی اسلام سے ابوسفیان کا تعلق مخلصانہ قرار نہیں دیا جا سکتا اور اس کے لئے تو حضرت عباس کے بھتیجے میں جو بھی کشش تھی، وہ حکومت کی تھی پھر اس کے سعادت مند بیٹے کی جانشین پیغمبر اسلام سے بغاوت کی توجیہ حصول اقتدار کے علاوہ کچھ نہیں ہو سکتی۔ اس کے بعد حکومت کو موروثی بنانے کے لئے یہ ضروری تھا کہ خانوادہ رسالت کے افراد کی سیرتوں کو اتنا مجروح کر دیا جائے کہ مسلم عامہ میں ان کی قدر و قیمت باقی نہ رہے۔ اس کام کو اس نے بڑی خوش اسلوبی سے کیا اور یہ اسی کا نتیجہ تھا جو علیؑ کے لئے کہا گیا۔

''ان کی کوئی روایت مانی نہ جاتی جب تک عبداللہ ابن مسعود کے ساتھی اس کی تصدیق نہ کر دیتے!''

''غضب خدا کا، عبداللہ ابن مسعود بھی نہیں، ان کے ساتھی! خود امام بخاری یا امام نووی کی بھی یہ سطح نہیں کہ علیؑ کے ساتھ ان کا نام لیا جا سکتا تو عبداللہ ابن مسعود کے ساتھی کس شمار و قطار میں تھے۔ جھوٹی حدیثوں کے سہارے چاند پر خاک ڈالنے سے اس کی آب و تاب بظاہر کم معلوم ہو سکتی

ہے مگر اصلی چمک میں تو فرق نہیں پڑتا۔۔۔رہ گئی بات محبان علی کی دروغ گوئی کی تو آج تک صرف دعوے ہی دعوے کئے گئے ہیں، کوئی بات کبھی ثابت نہیں کی جاسکی۔۔۔اور اب بھی ہر بات ممکن ہے، کوئی تاریخ سے اتنا ہی ثبوت ڈھونڈ نکالے کہ کسی زمانے میں شیعان علی ایسے حالات میں تھے کہ اہل سنت کے مجموعہ ہائے احادیث میں اپنی کوئی حدیث شامل کر سکتے۔

آسمان پر تھوکنے کا انجام اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ تھوکنے والے کا تھوک اس کے منہ پر خود آگرے!

علی یا شیعان علی پر الزام تراشی پر بشریت کے تقاضے سے غم و غصہ ہونا غیر متوقع نہیں ہے، حالانکہ ہمیں خود احساس کرنا چاہیے کہ جن لوگوں نے اپنے ہادی برحق کو نہیں بخشا وہ علی کو کیا بخشتے علیؑ کا درجہ جو کچھ ہے وہ ان کے فیض ہی سے تو ہے۔ آئینہ دکھانے کے انداز پر صحیح بخاری کی ایک حدیث ملاحظہ فرمائیں۔

''ایوب نے عکرمہ سے، عکرمہ نے ابن عباس سے سن کر، عبداللہ وارث سے اور عبداللہ وارث نے ابومعمر سے بیان کیا۔

نبی کریم نے سورہ النجم پڑھ کر سجدہ تلاوت کیا اور آپ کے ساتھ مسلمانوں، مشرکوں، جنوں اور انسانوں نے سجدہ کیا۔

ابن طہمان نے بھی ابوایوب کو سنا تھا لیکن ابن علیہ نے ابن عباس کا نام نہیں لیا۔،، (۴۶)

حدیث میں مسلمانوں کے ''ساتھ مشرکوں،، بھی آیا ہے لہذا یہ سوال خود بخود پیدا ہوا کہ حضورؐ کے اتباع میں مشرکین سجدہ گزاروں میں کہاں سے داخل ہو گئے؟ شاید کسی ایسا جگہ سجدہ کیا گیا تھا جہاں مسلمان، مشرک اور جن وانس سب موجود تھے۔ آخر فتح الباری شرح بخاری نے اس معمے کو حل کر دیا۔ متاخرین میں حافظ ابن حجر عسقلانی سب سے بڑے محدث و مفسر گزرے ہیں۔ انہوں نے بخاری کی شرح فتح الباری کے پارہ ۱۹ میں اس کی صراحت کی ہے۔

''ایک روز رسول اللہ نے مکے میں سورۂ النجم کی تلاوت فرمائی۔ وہاں مشرکین مکہ بھی موجود تھے۔ حضرت جب افرایتم الات والعزیٰ تک پہنچے تو شیطان نے آپؐ پر غلبہ کر کے زبان سے جاری کرادیا ''یہ بت (لات وعزیٰ) بڑی عظمت و بزرگی والے ہیں (روز قیامت) ان کی شفاعت کی امید کی جاتی ہے۔ یہ سن کر مشرکین بہت خوش ہوئے اور کہا کہ آج سے قبل انہوں نے ہمارے بتوں کی ایسی مدح کبھی نہیں کی تھی۔ پھر رسولؐ سجدے میں گئے تو مشرکین نے بھی آپ کے ساتھ

سجدہ کیا۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔

وما ارسلنا من قبلک من رسول ولا نبی الا اذا تمنیٰ القی الشیطان فی امنیۃ۔

''جب شیطان نے آنحضرت کے منہ سے یہ الفاظ نکلوا دیئے تو جبریل نازل ہوئے انہوں نے شکایت کی کہ یہ الفاظ تو میں نے آپ کو نہیں سکھائے تھے، آپ نے کہاں سے پڑھ دیئے؟

ابن حجر عسقلانی کے بعض موید ین قاضی عیاض اور ابو بکر بیہقی وغیرہ اس حدیث سے متفق نہیں لیکن محدثین کا ایک بڑا گروہ متفق ہے اور مولف سیرۃ النعمان ایسے ثقہ مفسر پر شبہ کرنے کو روا نہیں رکھتے۔

ایک خیال یہ بھی ہوتا ہے کہ حدیث مبینہ بخاری کے پس منظر میں اگر یہ واقعہ نہیں ہے تو کون سا واقعہ ہے، جس میں آنحضرت کے ساتھ مشرکین اور جن وانس سب نے سجدہ کیا ہو اور جس کے بعد یہ حدیث قلم بند کی گئی؟

واقعے کی نوعیت جو بھی ہو مگر حضورؐ کے سجدے میں اصنام کا حوالہ ضرور تھا جس سے خوش ہو کر مشرک آنحضرت کے اتباع میں آداب سجود بجالائے تھے۔

اس کے بعد اس حقیقت میں نعوذ باللہ شک نہیں رہتا کہ ختم المرسلین شیطان سے مغلوب ہو کر قرآن میں تحریف کر دیتے تھے۔ جادو میں مبتلا ہو جانے کا ذکر احادیث کی اکثر کتابوں میں ہے، جو نبوت کی بے چارگی میں ہمارے رسولؐ کا امتیاز ہے یعنی پیغمبری کی صداقت اور سفارت الہیہ کا اعجاز بھی آپ کو باطل قوتوں سے محفوظ نہ رکھ سکتا تھا۔۔۔ موسیٰ کا عصا جادوگروں کی سحر سازی پر ضرب کاری لگا سکتا ہے مگر ہمارے پیغمبرؐ کا سراپا شیطان کو بھی بھگا نہ سکتا۔۔۔ اللہ اللہ کس قدر عظیم تھا ہمارا نبی!

عقل انسانی تحیر میں ہے کہ جب افضل الانبیاء کا یہ عالم ہے تو دوسرے نبیوں کا کیا حال ہوگا جنہوں نے دنیا کے ہر حصے اور ہر زمانے میں نسل آدم کی رہنمائی کی ہے۔

دعوت فکر ہے تمام مسلمانوں کے لئے کہ جو جادوگروں اور شیطان سے خود مغلوب ہو جاتا تھا اور اس حد تک کہ لات وعزیٰ کی مدح سرائی کرنے لگتا اور خود اپنے دین کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیتا، وہ دوسروں کو سحر وساحری کے حربوں اور شیطانی تسلط سے کیونکر محفوظ رکھ سکتا تھا۔

~~کیا اس کے بعد ملت مسلمہ کو خیر الامم اور اسلام کو افضل ادیان عالم کہنا حق بجانب ہوگا؟~~

معاً یاد آجاتی ہیں حضرت عمر کے بارے میں بعض احادیث۔

''فرمایا رسول اللہ نے: عمر! قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، شیطان تمہیں کسی راستے پر جاتے دیکھتا ہے تو تمہارا راستہ چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کر لیتا ہے۔،، (۴۷)

ام المومنین عائشہؓ سے روایت ہے۔

''خطاب کے بیٹے! خدا کی قسم، جب بھی شیطان تم کو کسی راستے پر چلتے دیکھتا ہے تو وہ راہ چھوڑ کر دوسری راہ اختیار کر لیتا ہے۔''

علامہ جلال الدین سیوطی کی تاریخ الخلفاء میں ایسی ہی بعض احادیث اور بھی ملتی ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ شیطان حضرت عمر سے ڈرتا تھا۔۔۔کیا منزلت تھی رسول کے دوسرے خلیفہ کی اور ایک خود رسولؐ تھے کہ جادو اور شیطان دونوں ان پر حاوی ہو جاتے! خود ان سے اپنے دین کے خلاف باتیں کہلوا لیتے اور کلام اللہ میں تحریف بھی کرا لیتے!

اس نظیر کے بعد اگر خلیفہ شام نے آیات قرآنی کی غلط تفسیریں کرا کے شارع عام پر بیان کرائیں یا بعد کے مفسرین نے ان کی تقلید میں پسندیدہ افراد کی بے راہ روی کا جواز پیدا کرنے کی خاطر احکام قرآنی کو احادیث کے سہارے بدلنے کی سعی کی تو اس کو کسی شیطانی غلبے کے مترادف قرار دے کر قابل معافی کہا جا سکتا ہے۔

کتنی صحیح ہے یہ کہاوت کہ خدا جب دینے پر آتا ہے تو اس کی دینے کی کوئی حد نہیں رہتی۔ کسی کو دیتا ہے تو عزت و ثروت اور دولت سب کچھ دے ڈالتا ہے۔ ابھی تھوڑے ہی دنوں کی بات ہے کہ عہد عبدالمطلب میں ابوسفیان، عتبہ، شیبہ، ولید اور کتنے ہی ناموران مکہ تھے جو دور دور تک عرب میں جانے پہچانے جاتے تھے۔ اہل مکہ میں کسی کو معلوم بھی نہ تھا کہ ابوقحافہ اور خطاب نام کے لوگ بھی انہیں حدود میں پائے جاتے ہیں۔ آج خدا نے بیٹے کو نوازا تھا تو وہ باپ کی نسبت سے پکارا جا رہا تھا: ابن الخطاب! اور کوئی چونکتا بھی نہیں تھا۔

علیؑ نے عمر ابن عبدود کو اپنا نام بتایا تھا: ابن ابی طالب! تو اس کو پہچاننے میں کوئی تکلف نہ ہوا، موجب حیرت نہیں تھا کیونکہ کلید بردار کعبہ ریگزار میں، دور دور تک معروف تھا۔

نیرنگی زمانہ ہے کہ معروف باپ کا ہر اعتبار سے اہل بیٹا نا معتبر ٹھہرایا گیا اور ایک غیر معروف باپ کے بیٹے کو خود مرشد کامل یہ شرف دے رہا تھا کہ شیطان اس کو دیکھ کر بھاگتا ہے۔۔۔اس شرف کو عطائے خداوندی کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ آج شیطان حضرت عمر سے ڈرتا تھا، ابھی کل ہی مکے کے

بھرے بازار میں وہ خالد بن ولید کے ہاتھوں مجروح ہوئے تھے اور اسی عناد میں انہوں نے حضرت ابو بکر کے بعد خالد کو اس طرح معزول کیا کہ پھر ان کا نام تاریخ میں نظر نہیں آتا۔

تواتر احادیث میں حضرت عمر کا جبروت صرف اتنا ہی نہیں تھا کہ وہ اپنے مرشد کامل سے آگے بڑھ گئے تھے، بلکہ حدیث یہ بھی پائی جاتی ہے کہ نبوت ختم نہ ہو جاتی تو حضرت عمرؓ کو ملتی۔ آنحضرتؐ پر حضرت عمر کی برتری دیکھتے ہوئے حدیث ساز کی فروگزاشت قابل رحم ہے، اس کو لکھنا تو یہ چاہیے تھا کہ نبوت مجھے نہ مل جاتی تو حضرت عمر کو ملتی۔

رسولؐ برحق کی اس حیثیت کا تعین عقائد کو آئینہ کر دیتا ہے۔ علیؑ اور شیعان علی کا کم از کم وہ رسول تو ہرگز نہیں تھا جس کی تصویر کشی ان احادیث میں کی گئی ہے۔ قیاساً کہا جا سکتا ہے کہ یہ تذکرہ حضرت محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نہیں ہے بلکہ اس رسولؐ کا ہے جس کو خلیفہ شام نے اپنی گڑھی ہوئی احادیث سے زیب و زین دے کر نگار خانہ خلافت میں سجایا تھا اور صحیحین کے محدثین نے غلط فہمی میں وضعی کو اصلی سمجھ کر اس کو اپنی کتابوں میں جگہ دیدی۔

خلیفہ شام: ایک اسلام ساز

مسلمانوں میں اختلاف کی بنیاد جب بھی پڑی ہو لیکن انتخاب سقیفہ کے بعد وہ کھل کر سامنے آئی اور تضاد نظریات کے باعث دو گروہ پیدا ہو گئے لیکن علیؑ اور ان کے پیرو خلیفہ اول کے مد مقابل بن کر میدان میں نہیں آئے۔۔۔کوئی کہتا ہے کہ مسلمان علیؑ کے ساتھ نہیں تھے۔ ہمارے نزدیک یہ غلط ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مخبر صادق نے علیؑ کو وصیت کی تھی کہ اگر ایسی صورت حال ہو تو امت میں اپنی ذات سے خون خرابے کی نوبت نہ آنے دینا۔۔۔ حقائق پہلے بھی متنازعہ تھے اور آج بھی غیر منفصلہ لیکن استقرار خلافت شام کے بعد سے خلیج گہری ہوتی چلی گئی۔

علیؑ نے بیعت کی یا نہیں کی؟ یہ بھی طے نہ ہو سکا، تاہم جب مسلمانوں کو علیؑ کے تعاون کی ضرورت محسوس ہوئی تو علیؑ نے تعاون کیا، دست و بازو سے نہیں بلکہ دینی مشوروں سے، امت مسلمہ کے مفاد کی خاطر۔۔۔حتی کہ حضرت عثمانؓ کے بعد پھر جب اہل اسلام نے مملکت کا نظام سنبھالنے کی استدعا کی تب بھی آپ نے انہیں مایوس نہیں کیا۔ جانتے تھے کہ ان میں وہ لوگ بھی ہیں جنہوں نے بعد رسول خود رسولؐ سے روگردانی کی تھی مگر آج ان کو اسلام کے نام پر علیؑ کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی لہذا علیؑ نے پیغمبر اسلام کے نائب ازلی کا کردار ادا کیا اور اسلام کے دنیاوی نظام کو سدھارنے کے لئے ہاتھ آگے بڑھا دیئے۔

علیؑ اقتدار دنیاوی کے لئے پیدا نہیں ہوئے تھے۔ آپ حضورؐ کے بعد اسلام کے رکھوالے تھے۔ مملکت جس طرح انبیاء کے لئے ذیلی چیز ہوتی ہے، علیؑ کی نظر میں بھی اس کی حیثیت انبیاء سے مختلف نہ تھی۔ اسی لئے انہوں نے نظم مملکت پر دوسروں کے قبضے پر تلوار بے نیام نہیں کی مگر جب کل کے بیوفاؤں نے اسلام کے باغی کا ساتھ دینے کے لئے حق و باطل کا امتیاز نہیں کیا تو اسلام کے

ساتھ اس سے ہم رشتہ ہر چیز کا تحفظ علی کی ذمہ داری بن گیا اور پھر جو کچھ ہوا، وہ اختصار کے ساتھ قلم بند کیا جا چکا ہے۔

انتقام خون عثمان صرف کہنے کے لئے تھا ورنہ نظریہ فرمانروائی کا تھا جو پیغمبر اسلام کی زندگی یا بعد میں بن گیا تھا، اب اس کے وارث طلحہ و زبیر، عبداللہ ابن عمر، بعض دوسرے اور آخر میں معاویہ ابن ابی سفیان تھے۔ حضرت عثمان کے بعد مدینے کی پوری فضاء، عوام و خواص سب کا رجحان خانوادہ رسالت کی طرف یک طرفہ ہوگیا تھا۔ شاید پچھلے تجربات کے تحت یا اولاد رسولؐ کی مظلومیت نے پتھروں کو موم کر دیا ہو اور وہ سابقہ محرومیوں کی تلافی کرنا چاہتے ہوں لہذا پورے ماحول کے غلبے میں لوگوں نے اپنے دلوں کی ہوس اقتدار کو دبائے رکھا اور بیعت علی کرنے کے لئے مصلحتاً ایک دوسرے پر سبقت کرنے لگے۔

ان میں طلحہ و زبیر پیش پیش تھے لیکن ماحول کا تلاطم سکون پذیر ہوتے ہی سب سے پہلے طلحہ نے زبیر کو ہموار کر کے ام المومنین عائشہ کو ابھارنے کی خاطر مکے کا راستہ اختیار کر لیا۔۔۔ قتل عثمانؓ میں پہلا نام محمد بن ابی بکر کا لیا جاتا ہے جس کے قتل کے پروانے پر مروان نے اموی مورخین کے بقول مہر خلافت لگا کر انھیں موت کے منہ میں جھونک دیا تھا اور محمد بن ابی بکر نے اشتعال میں حضرت عثمانؓ کے گھر کا احاطہ کر لیا تھا۔ انہیں مورخوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ خلیفہ کی ڈاڑھی پکڑ کر اور ان کی سخت توہین کر کے پلٹ گئے تھے۔ ان کی واپسی پر کمیں گاہ میں چھپے ہوئے آدمی نے حضرت عثمانؓ کو قتل کر دیا۔ اکثر مورخین نے لکھ دیا ہے کہ وہ طلحہ تھے۔۔۔ علیؑ کے خلیفہ بن جانے پر طلحہ کا یہ تاثر بے محل نہ تھا کہ جس مقصد کے لئے انہوں نے خلیفہ کو موت کے گھاٹ اتارا تھا، وہ پورا نہ ہوا، ہاتھ انہوں نے خون میں رنگے اور خلافت مل گئی علی کو ا

انہیں خیال بھی نہ تھا کہ ہوا کا رخ اچانک اس طرح بدل جائے گا۔ اب ایک یہی راستہ رہ گیا تھا کہ علیؑ کو ہٹا کر پھر تخت خلافت خالی کرایا جائے۔ اس کے لئے انہوں نے ایک مضبوط ستون کا سہارا لیا۔ بیعت سے روگرداں ہو کر وہ ام المومنین کی خدمت میں حاضر ہو گئے اور ام المومنین سے مطالبہ کرا دیا کہ عثمانؓ کا قاتل قصاص کے لئے ان کے حوالے کر دیا جائے۔ علی قاتل عثمانؓ کو کہاں سے لاتے! طلحہ کو قتل کرتے کسی نے نہیں دیکھا تھا، البتہ جاتے اور واپس آتے لوگوں کی نظر ان پر پڑی تھی۔ قتل کرنے کا عینی شاہد کوئی نہیں تھا۔ نام لیا جا رہا تھا محمد بن ابی بکر کا جن کے بارے میں علیؑ جانتے تھے کہ انہوں نے قتل نہیں کیا پھر اس کا مطالبہ کرنے والے طلحہ و زبیر کون ہوتے تھے۔ علی

مسلمانوں کے خلیفہ وقت تھے۔ یہ منصب تو خود ان کا تھا، ام المومنین کا بھی نہیں تھا۔

بہر حال جنگ جمل وقوع میں آئی۔ زبیر کو میدان جنگ میں اپنے غلط ہونے کا احساس ہوا۔ انہوں نے تلوار نیام میں کر لی۔ طلحہ اور عبداللہ ابن زبیر نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔ وہ حصول اقتدار کی خاطر لڑتے رہے انجام کار طلحہ مارے گئے، عبداللہ ابن زبیر بچ نکلنے میں کامیاب ہوگئے۔ ام المومنین اپنی غلطی پر بہت شرمندہ ہوئیں۔ انہیں رسول کا کہنا یاد آتا رہا اور وہ اکثر شدت احساس میں روتی رہیں۔۔۔

آگے چل کر عبداللہ ابن زبیر نے دعویٰ خلافت کیا اور مارے گئے۔ مسلمانوں کا ایک گروہ انہیں پانچواں خلیفہ راشد مانتا ہے۔

اس کے بعد بساط سیاست پر قصاص قتل عثمان کے دوسرے داعی معاویہ بن ابی سفیان تھے۔ خون کے رشتے سے بظاہر انہیں حق پہنچتا تھا لیکن یہ ان کا کام نہ تھا کیونکہ خلیفہ رسول کے ہوتے ہوئے صرف معاویہ ہی نہیں کوئی بھی اس کا مطالبہ نہیں کر سکتا تھا اور مطالبہ بھی کیسا کہ قاتل اس کے حوالے کر دیا جائے۔ قاتل کو علی کہاں سے لاتے، وہ تو رزم گاہ جمل میں زندگی سے اپنا رشتہ توڑ چکا تھا اور جس کا نام لیا جا رہا تھا وہ قاتل نہیں تھا۔ علی ایک بے گناہ کو جان بوجھ کر گنہگار قرار دے کر دشمنوں کے حوالے کیونکر کر دیتے اور اگر وہ قاتل ہوتے تو علی کا منصب تھا کہ خود ان کو سزا دیں۔

بغاوت کی خاطر ان مفروضات کو اختلافات کا دوسرا اساسی پتھر کہا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد بنی امیہ کے مدعی خلافت، ابن ابی سفیان کے، راست بازوں کے خلاف، غیر شرعی ہتھکنڈے اضافی حیثیت رکھتے ہیں اور زمام خلافت ہاتھ میں لینے کے بعد سے افراد اہلبیت کی کردار کشی اور ارباب خلافت کی شخصیتوں کے فضائل میں وضعی احادیث کی تخلیق سے، خود اسلام اور پیغمبر اسلام کی جو صورتیں سامنے آئیں، اس کے لئے وہ قابل معافی نہیں ہیں۔ اس سے سب کچھ بدل کر رہ گیا۔ احادیث کے اس سمندر سے ارشادات پیغمبرؐ کے جو مجموعے تیار ہوئے اور جو تاریخیں لکھی گئیں، ان سے ان گنت مکاتیب فقہ وجود میں آگئے اور آتے رہیں گے۔

حال سے مستقبل کی طرف

شروع میں مسلمانوں کے درمیان صرف دو گروہ تھے شیعان معاویہ اور شیعان علی۔ شیعان علی آہستہ آہستہ مظالم کے طوفان میں شام و عراق وغیرہ سے لگ بھگ ناپید ہوگئے، صرف مدینے کی حد تک باقی رہے۔ دوسرے مقامات پر صرف شعیان معاویہ رہ گئے۔ اس طرح ماضی کے

دو طبقے جو بنی ہاشم اور بنی امیہ کے حامی کہے جاتے تھے، ان میں کوئی توازن وتقابل نہ رہ سکا، ایک طاقتور تھا، دوسرا ناطاقت اور اتنا ناطاقت کہ اس کو زندہ کہنا بھی زندگی کی توہین کے مترادف تھا۔

اب اسلام پوری طرح جہانبانی کے راستے پر پڑ چکا تھا اور تسخیری مہمات سے اس کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جارہا تھا۔ اسلام کے نت نئے سانچے ڈھلتے جارہے تھے جو بدعوائے خود اس مظروف کے مطابق تھے، جو پیغمبرؐ برحق امت کو سونپ کر گئے تھے۔ اس پر تبصرہ کیا جائے تو ہر گروہ برا مانے گا کیونکہ ہر ایک اپنے اسلام کو صحیح کہتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی سانچہ اسلامی نہیں تھا۔

بنی امیہ کے بعد جب بنی عباس نے مملکت اسلامیہ پر قبضہ کیا تو غاصبین کے خلاف ''حقوق آل محمد،، کا نعرہ لگایا تھا مگر اقتدار کے مصالح اور اصول اہل بیت میں اتنا تضاد پیدا ہو گیا تھا کہ اقتدار کو اسلام کی پرانی ڈگر پر لانا ممکن نہ رہا تھا اور خلافت اور امامت کے دوراہے پر کھڑے ہو کر حکومت کرنا محال تھا۔

ابوالعباس فتاح اور ابوجعفر منصور امام جعفر صادق کے ہم نشین رہے تھے۔ وقت کے مدوجزر کو دیکھ کر انہوں نے امام کو اٹھ کھڑے ہونے کی دعوت دی تھی اور ان کا تعاون حاصل نہ کر سکنے کے بعد خود ان کا نام لے کر میدان میں آ گئے تھے۔ تاج وتخت کے ان دیوانوں میں ابوالعباس فتاح علیؑ کی خلافت کو زندہ کرنا چاہتا تھا لیکن اس کی دوررس نگاہ یہ دیکھ رہی تھی کہ اگر اس نے خانوادہ رسالت کا سہارا لیا تو مسلمان جس ڈگر پر پڑ چکے ہیں، اس سے انھیں واپس لانا ناممکن ہے اور خود امام اس کو دنیاوی حکومت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے جادہ حق سے قطعاً ہٹنے نہ دیں گے لہذا اس نے دین کے نام پر دنیاوی حکومت کو باقی رکھنے کی خاطر خود بھی، سقیفہ کی مبینہ خلافت کو اپنا لیا، جس کے لئے مسلک امامت کو بے اثر بنانا ضروری تھا اس لئے اس کے جانشین ابوجعفر منصور نے ایک دارالفتاوی قائم کیا اور اس کی سربراہی کے لئے مدرسہ امامت کے ایک متعلم ابوحنیفہ کو چن لیا۔ ہارون رشید نے شیعوں کی امامت پر پہلی ضرب کاری لگائی، شرعی مسائل کا امتیاز اولاد رسول کی اجارہ داری سے نکال لیا اور ابوحنیفہ کو پہلا امام اعظم بنا کر آئمہ اثنا عشر کا مدمقابل بنا دیا۔ اس سے بڑا کام مامون نے یہ کیا کہ امام ابوحنیفہ کے شاگرد رشید امام ابویوسف سے استاد کے فتاوے مرتب کرا کے ان کی فقہ کو فقہ حنفیہ کا نام دیدیا۔۔۔ اس طرح فقہ امامیہ کو فقہ جعفریہ اور دوسری فقہ کو فقہ حنفیہ کہلوایا گیا۔

~~اب تک مسلمانوں کا بڑا گروہ شیعان معاویہ کا تھا اور برائے نام ایک گروہ شیعان علی کا~~ رہ گیا تھا۔ بنی امیہ کو تو عباسیوں نے لگ بھگ ناپید کر دیا تھا اور سارے مسلمان اپنے کو عباسی کہہ نہ

سکتے لہذا امامون نے شیعان معاویہ کی جگہ پر کرنے کے لئے مسلمانوں کی ایک نئی جماعت تشکیل کی جس کو اہل السنّت والجماعت کا نام دیا لیکن خود مسلک معتزلہ پر قائم رہا اور متوکل کے زمانے تک سرکاری مذہب اعتزال ہی رہا۔ متوکل نے پہلے پہل اہل السنّت والجماعت ہونے کا اعلان کیا اور حنفیت کو سرکاری مذہب قرار دیا۔

اب شیعہ اور سنی مسلمانوں کے دو گروہ بن گئے۔ شیعوں کی حالت عباسی دور میں عہد امویہ سے بھی زیادہ خراب تھی پھر بھی حکومت نے اس میں مزید تفرقہ ڈالا۔ امام جعفر صادق کے بڑے بیٹے اسمٰعیل امام کی زندگی میں فوت ہو گئے تھے۔ عباسی فرمانروا نے محمد بن اسمٰعیل سے دعویٰ امامت کرایا اور فرقہ اسمٰعیلیہ وجود میں آیا جس نے مصر میں اپنی خلافت قائم کی، جس کی اک شاخ آغا خانی خوجے کہلاتی ہے۔ قدیم اسمٰعیلی بوہرے کہے جاتے ہیں۔

مسالک فقہ

اہل السنّت والجماعت میں پہلے چار سجادہ ہائے امامت تھے: حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی۔ اب سے کوئی چار سو سال پہلے انگریزوں کی سرپرستی میں نجد کا سجادہ وہابیت بچھایا گیا اور اماموں کی تو کوئی گنتی ہی نہیں رہی۔ امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام زہری، امام ابن تیمیہ، امام غزالی، امام فخر الدین رازی وغیرہ وغیرہ۔ یہ سارے امام حکومت ساز یا خود ساختہ ہیں لیکن تابع خلافت!

شیعوں کے امام منصوص من اللہ ہوتے ہیں۔ ان کی تعداد صرف بارہ ہے۔ بارہویں امام، امام مہدی ہیں جو قیامت سے پہلے ظہور فرمائیں گے۔۔۔ یہ سارے امام ہر زمانے میں نگاہ خلافت میں کھٹکتے رہے اور نشانہ ستم بنتے رہے۔ ان کا سلسلہ احادیث حضور ختمی مرتبت کی نسل میں سرمایہ وراثت کی طرح ایک دوسرے سے منتقل ہوتا رہا اور بعد کے علماء اثناء عشر کے توسط سے منضبط ہوا۔ چار کتابیں دشمنوں کی دست برد سے بچی ہیں۔ انہیں پر پوری فقہ کا انحصار ہے۔

اہل السنّت والجماعت کی ساری فقہیں اس خزانہ احادیث کی مرتبہ ہیں جنہیں زر و جواہر کی بارش کرکے بنی امیہ کے پہلے خلیفہ نے یکجا کرایا تھا اور مرتبین احادیث نے کھوٹے کھرے کی پہچان کرکے جن کا انتخاب کیا تھا۔ اس میں راویوں کی سیرت کو معیار بنایا تھا لیکن اس کو کیا کیا جاتا کہ جن جن راویوں کے حوالے دیئے گئے تھے، خود انہیں خبر بھی نہ ہوگی کہ انہوں نے ایسی حدیثیں بیان کی ہیں، جس کی تفاصیل حتمکنہ اختصار سے بیان کی جا چکی ہیں۔

خود مرتبین کی نیتوں میں کجی ہو تو اس کو وہ خود یا عالم الغیب جانتا ہو گا مگر بظاہر وہ محتاط نظر آتے ہیں۔ حدیثیں وفات معاویہؓ کے سوسوا سو برس بعد کاغذ پر لکھی گئیں۔ ممکن ہے کہ امتداد زمانہ کی گرد بھی ان پر جم گئی ہو یا بعد کے اموی حکمرانوں نے بھی کوئی کارہائے نمایاں انجام دیئے ہوں پھر بھی امر مسلم یہ ہے کہ عقائد سینہ بسینہ چلے آرہے تھے اور ہر دور کے تحت ملوکیت کی چھاپ ان پر لگتی جا رہی تھی۔ بالفاظ دیگر عقائد سازی خاندان شاہی کی رضا کی پابند تھی۔ کتنی ستم ظریفی ہے کہ کل کے دشمنوں کی اولاد آج عقائد اسلامیہ کی اجارہ دار تھی اور خود محمدؐ کی اولاد پر تخریب کی تہمتیں رکھی جاری تھیں۔

کچھ تذکرے اموی دور کے پائے جاتے ہیں مگر کام جو کچھ ہوا وہ عہد عباسیہ میں اور صحیح معنی میں ان کے زمانے کو یہ شرف حاصل رہے گا کہ مسلمانوں میں عقائد کی جتنی جہتیں متعین ہوئیں، وہ خلافت عباسیہ کے وجود میں آنے کے بعد لیکن ان کا سہرا خلافت شام کے منارہ عظمت کے سر بندھتا ہے جس میں احادیث کی ذخیرہ اندوزی کے لئے کسی بخل سے کام نہیں لیا گیا۔ بلکہ اس کے بالکل برعکس اتنی فراخدلی دکھائی گئی کہ اگلی نسلوں کو جس قسم کی حدیث درکار ہوئی، وہ اس کے خزانے سے مل گئی پھر بھی خزانہ خالی نہیں ہوا اور سیکڑوں برس بعد بھی لوگوں کو ایسے جواہر پارے ملتے رہے کہ پیغمبرؐ اسلام کو بعینہ اپنا سا بشر ثابت کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی اور دعوی نبوت کے دروازے بھی کھلے رہے۔

متضاد احادیث

یہ نتائج ہیں کثرت احادیث کے جن سے خرد کو جنون اور جنون کو خرد، گنہگار کو پاک باز اور پاک باز کو گناہگار ثابت کیا جا سکتا ہے اور صنم پرستی میں توحید کے پہلو نکالے جا سکتے ہیں۔ سنگ اسود بھی پتھر ہے اور وہ ٹکڑے بھی پتھر جن پر اہل ہنود صبح کو مہادیو (بڑے دیوتا) کی علامت قرار دے کر پانی ڈالتے ہیں، جو بلاشبہ شرک ہے کیونکہ دیوتا میں کسی طاقت کے حلول کا نظریہ موجود ہے۔ شرک کی یہ بات سنے تلے الفاظ میں کہنے سے ختم اور قطعی ہو جاتی ہے لیکن یہی بات اگر مختلف لوگوں سے کہلوائی جائے تو بیان کرنے والے کی قوت ارادی بھی الفاظ میں شامل ہو جاتی ہے اور بیانات کے الفاظ بدل جانے سے شبہات پیدا ہو جاتے ہیں ایک حدیث جب مختلف لوگوں نے بیان کی تو ایسا ہی کچھ ہوا اور یہی غالباً سیاست کار شام کا مطمح نظر تھا۔ مثال کے لئے کئی حدیثوں میں سے دو حدیثیں

منتخب کر کے پیش کی جاتی ہیں۔

''حضرت اسامہ بن زید سے مروی ہے کہ نبی کریم کی ایک صاحبزادی نے پیغام بھیجا کہ اس کا بیٹا قریب المرگ ہے۔آپ نے جواب دیا کہ اللہ دیتا ہے وہی لے لیتا ہے۔ ہر ایک کا وقت مقرر ہے لہذا صبر کرو اور ثواب کی امید رکھو۔

اس نے پھر پیغام بھیجا اور قسم دی کہ ضرور تشریف لائیے۔آپ کھڑے ہوگئے آپ کے ساتھ سعد بن عبادہ، معاذ ابن جبل، ابی بن کعب، زید بن ثابت اور کئی آدمی تھے۔۔۔میرے خیال میں صاحبزادی نے کچھ کہا پھر گویا مشک تھی جو آنکھوں سے بہنے لگی، تو اس پر سعد نے کہا یارسول اللہ ا یہ کیا ہے؟ فرمایا کہ یہ رحمت ہے جو اللہ اپنے بندوں کے دلوں میں ڈالتا ہے۔،، (باب ۸۱۵، حدیث ۱۲۰۳ صفحہ ۵۲۷)

''آپ کی مبارک آنکھوں سے آنسو جاری تھے،،۔(باب ۸۱۵، حدیث ۱۲۰۸ صفحہ ۵۲۷)

عبداللہ بن عبید اللہ بن ابوملیکہ سے روایت ہے۔

''حضرت عثمان کا ایک بیٹا فوت ہوگیا۔۔۔حضرت عبداللہ بن عمر نے عثمانؓ سے کہا۔ آپ رونے سے کیوں نہیں روکتے، رسول اللہ نے فرمایا کہ میت کو گھر والوں کے رونے سے عذاب دیا جاتا ہے۔حضرت ابن عباس نے بھی کہا کہ حضرت عمر یہی کہتے تھے۔۔۔جب حضرت عمر فوت ہوگئے تو حضرت عباس نے اس کا ذکر حضرت عائشہ سے کیا تو حضرت عائشہ نے فرمایا خدا عمر پر رحم کرے، خدا کی قسم رسول نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ اللہ مومن کو اس کے گھر والوں کے رونے سے عذاب ہوگیا بلکہ کہا تھا کہ اللہ کافر کے عذاب کو اس کے گھر والوں کے رونے کی وجہ سے بڑھا دیتا ہے۔۔۔ اور فرمایا، تمہارے لئے قرآن کافی ہے۔کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔،،

(باب ۸۱۵، حدیث ۱۲۰۵ صفحہ ۵۲۸)

کوئی کسی پر نوحہ کرے تو اس کو عذاب دیا جاتا ہے جس پر نوحہ کیا گیا۔

(باب ۸۱۶ حدیث ۱۲۰۸ صفحہ ۵۲۹)

یہ حدیث آیت محولہ بالا مبینہ حضرت عائشہ کے خلاف جاتی ہے ا کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔(۴۸)

صحیح بخاری کی ان احادیث میں سے بعض کو امام مسلم ابن حجاج نے بھی لیا ہے اور حضورؑ کے رونے اور سعد کے اعتراض کے جواب میں فرمایا۔'' یہ رحمت ہے۔اللہ نے اپنے بندوں کے

دلوں میں اس کو رکھا ہے اور اللہ اپنے بندوں میں سے ان ہی پر رحمت کرتا ہے جو دوسروں پر رحمت کرتے ہیں،،۔

''امام نووی نے تبصرہ کیا ہے :معلوم ہوا کہ آنکھوں سے رونا صبر کے خلاف نہیں البتہ چیخنا چلانا وغیرہ شیوہ ایمان کے خلاف ہے۔۔۔یعنی مردے پر عذاب ہونے کا بیان غلط ہے،،۔(۴۹)

امام نووی نے ایک درمیانی راستہ نکال کر دونوں حدیثوں کو صحیح ثابت کرنے کی سعی لاحاصل کی تھی مگر عملی زندگی میں ہوتا یہ ہے کہ اگر کسی کی آنکھ سے ایک آنسو بھی نکل آتا ہے تو مولوی کسی جلاد کی طرح چیخ اٹھتا ہے :خبردار، مردہ معذب کیا جائے گا۔

''گھٹ کے مر جاؤں ، یہ مرضی مرے صیاد کی ہے،،۔

ان احادیث کے پس منظر میں بعض تاریخی واقعات ذہن میں گردش کرنے لگتے ہیں :۔

جنگ احد کے بعد مدینے کے گھروں میں کہرام مچا ہوا تھا۔ حضرت حمزہ کی بہن اکیلی اپنے گھر میں رو رہی تھیں۔ حضورؐ شہیدوں کی تعزیت کرتے ہوئے گزرے تو حضرت حمزہ کی بہن صفیہ کو اکیلے بھائی پر روتے دیکھا۔ آپ نے اصحاب کی طرف دیکھ کر فرمایا۔ کوئی صفیہ کے غم میں شریک ہونے والا نہیں ہے؟ اس کے بعد اصحاب نے اپنی عورتوں کو روانہ کیا اور حمزہ کی شہادت پر گریہ و زاری کی گئی۔ کامل ابن اثیر اور کئی مورخین اس کی تصدیق کرتے ہیں۔

آنحضرتؐ کی وفات کے بعد غم نصیب بیٹی شب و روز روتی رہتی ، شدت ماتم میں اکثر آپ کی چیخیں بھی نکل جاتیں۔ وقت بدل گیا تھا پھر بھی رسول کے نام لیوا اکثر اتنے متاثر ہو جاتے کہ وہ خود رو پڑتے لہذا سیدہ عالمیان سے کہلوایا گیا کہ دن کو رولیا کریں یا رات کو، شب و روز کے بین سننے سے ان کے کاروبار پر اثر پڑتا ہے۔

تاریخی بیانات کی روشنی میں ایک بہت اہم واقعہ قابل توجہ ہے۔ کربلا کا لٹا ہوا قافلہ جب زندان شام سے رہا ہو کر مدینے پہنچا تو مدینے میں قیامت بپا ہو گئی۔ بنی ہاشم کے گھروں میں رونے پیٹنے کے سوا کوئی کام ہی نہ رہ گیا تھا۔ صرف عورتیں اور چند بچے پلٹ کر آئے تھے۔ مدینے کی عورتیں، مرد اور بچے آتے رہتے۔ بیان کرنے والیاں واقعات کو دہراتی رہتیں تو چیخیں نکل جانا فطری تھا۔ اس کا نتیجہ جو نکلنا تھا، وہ نکلا کہ بنی امیہ کے خلاف نفرت پیدا ہو گئی اور بغاوت کے آثار نمودار ہونے لگے۔ اس پر عامل مدینہ نے کہلوایا کہ رونا دھونا اور حالات کا بیان بند کیا جائے یا مدینہ چھوڑ دیا جائے۔

حضرت ام کلثوم تو چالیس روز بعد رحلت فرما گئیں ۔ حضرت زینب کوئی چھ ماہ بعد شام روانہ ہوگئیں اور امام زین العابدین دیہات میں منتقل ہو گئے ۔

رونے کے سلسلے میں متضاد احادیث شاید ان مظالم کا جواز پیدا کرنے کے لئے تصنیف فرمائی گئی ہیں اور ہوسکتا ہے کہ بعض حدیثیں یزید ابن معاویہ کے عہد میں بھی گڑھی گئی ہوں ۔

فقہ امامیہ میں اپنے مُردوں پر چیخ چیخ کر بین کرنا شاید مکروہ ہے مگر واقعات کربلا بیان کر کے رونا داخل ثواب ہے ۔ سننے والوں کے دلوں میں ایسے بین سے مظلوم کی حمایت اور ظالم سے نفرت کا جذبہ پیدا ہوتا تھا، اس کو بنی امیہ کس طرح برداشت کرتے لہذا اس کے انسداد کے لئے قول رسول پیش کر دیا ۔۔۔ اور یوں بھی دل پر چوٹ لگے تو آنسو نکل آنا بشریت ہے اور چوٹ گہری ہو تو کراہ کا چیخ میں بدل جانا عین فطرت انسانی ہے جس سے غم کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے ۔ یقین نہ آئے تو تجربہ کر کے دیکھ لیں ۔

سلسلہ استدلال میں سماع اموات کے بارے میں دو حدیثیں اور پیش کی جاتی ہیں ۔

حضرت عمر سے روایت ہے کہ رسول کریم نے آپ کے دریافت کرنے پر فرمایا ۔

"یعنی وہ تم سے زیادہ سنتے ہیں لیکن جواب نہیں دے سکتے ۔۔۔"

"حضرت عائشہ نے اس روایت کو سنا تو فرمایا کہ رسول اللہ کا یہ ارشاد نہیں تھا کیونکہ اس کے خلاف نص قطعی موجود ہے ۔

"اے رسول! تو نہ مردوں کو اپنی بات سنا سکتا ہے اور نہ قبر میں مدفون ہونے والوں کو،"
(بخاری، غزوہ بدر)

ان دونوں روایتوں کی تصدیق صحیحین کی بعض دوسری روایتوں سے بھی ہوتی ہے ۔ اس لئے دونوں مستند ہیں مگر صحیح کون ہے؟ اس کا فیصلہ کس طرح کیا جائے؟ مفسرین میں سے بعض ایک کی تاویل کرتے ہیں بعض دوسری روایت کی ۔ خود حضورؐ کے نزدیک صحیح کون ہوگی، اس کو کس طرح طے کیا جائے؟ اور اگر یہ کہا جائے کہ دونوں باتیں کہی گئی تھیں تو مخبر صادق کی سیرت کیا رہ جائے گی اور تضاد صرف دس بیس مقامات پر ہی نہیں ہے، سیکڑوں احادیث فیصلہ طلب پائی جاتی ہیں جو مسالک مختلف کی بنیاد بن جاتی ہیں ۔

شیعوں کا راستہ زیر بحث نہیں آتا ۔ ان کا سرمایہ احادیث اگرچہ غارت گری اور لوٹ مار کی نذر ہو چکا ہے پھر بھی بچے کھچے اقوال پیغمبرؐ جو امامت کی صراط مستقیم سے ان تک پہنچے ہیں، انہیں

سے ان کی شاہراہ متعین ہوئی ہے، اس میں کوئی تبدیلی یا تغیر ممکن ہی نہیں ہے۔ کسی کی نظر میں وہ کتنا ہی غلط کیوں نہ ہو، انہیں اس سے کوئی سروکار نہیں، خود ان کے مابین کبھی اختلاف پایا نہیں گیا اور نہ پایا جائے گا۔ مسلمان اکثریت اسے برحق نہیں سمجھتی تو سمجھانے کا کوئی راستہ نظر بھی نہیں آتا کیونکہ وفات ہادی اسلام کے بعد سے وہ بے اعتباری کی ڈگر پر لائے گئے تو کبھی قابل اعتبار قرار نہیں دیئے گئے۔۔۔ اور اس کی شکایت بھی کی نہیں جا سکتی کیونکہ ان کے مولیٰ کے بارے میں جب کہا جاتا ہے کہ جتنی حدیثیں منقبت میں ہیں، ان میں سے اکثر جھوٹی ہیں تو غلاموں کو سچا کیونکر ٹھہرایا جائے گا!

خلفیہ شام نے جو کچھ کیا، تاریخ اسے دہراتی رہی اس سے وہ یقیناً خستہ حال رہے اور ان کا وجود بھی برائے نام رہ گیا لیکن کثرت حدیث سازی سے شیعوں کے عقائد متاثر نہیں ہوئے۔ ذخیرہ احادیث سے ارکان ایمان کی منزلت جتنی گھٹائی گئی، وہ عام مسلمانوں کے لئے تھی، شیعان علی کے لئے ہرگز نہیں بلکہ اس سے ان کے جذبہ ایمان میں اور جلا ہوتی رہی، ان کے خون سے عراق و شام کی سرزمین کو جتنا رنگین کیا گیا، جذبہ حق گوئی کی تابانی میں اتنا ہی اضافہ ہوتا رہا، شجر نسل کو جس قدر کاٹا گیا، نئی کونپلیں اتنی ہی پھوٹتی رہیں۔ حدیث سازی نے تباہ کیا تو مستقبل کے اہل السنّت والجماعت کے مسلک کو۔ اس میں نت نئے نئے راستے وجود میں آتے رہے شیعوں کا صرف ایک فرقہ اور ایک راستہ تھا جو اب بھی ہے البتہ مسلمانوں کا بڑا گروہ ٹکڑیوں میں بڑھتا رہا۔ جب بھی کوئی بڑا مجتہد یا امام وجود میں آیا، اس نے اپنا سجادہ الگ بچھا لیا اور اس کا ایک علیحدہ نام پڑ گیا۔ راوی کو ضعیف کہہ دیا جائے گا لیکن امیر شام نے ایک بھرے دربار میں کہا تھا کہ "تو سہی جوان کو اونٹ اور اونٹنی کی تمیز ختم نہ کرادوں!" کہا کس کے لئے اور تمیز ختم کہاں ہوئی؟

پیغمبرؐ اسلام کی ایک حدیث بیان کی جاتی ہے کہ امت میں بہتر تہتر فرقے ہوں گے ۔۔۔ یہ مخبر صادق کی پیشین گوئی تھی جس کو اس اضافے کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے کہ ایسا باعث رحمت ہوگا۔۔۔ آئے دن مساجد میں دھینگا مشتی، خون خرابہ، آپس میں اک دوسرے پر کیچڑ اچھالنا، گروہوں کا باہم تصادم، افراد کو گولیوں کا نشانہ بنانا، مدارس و مساجد میں بم رکھ کر مسلمانوں کو اڑا دینا، کیا رحمت اسی کو کہتے ہیں ۔۔۔ اس پر مستزاد ہے ایک گروہ کا دوسرے گروہ کو کافر کہنا اور کفر سازی کی یہ بیماری مرض متعدی کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ کوئی فرقہ ایسا نہیں بچا ہے جس کو کسی دوسرے فرقے نے کافر نہ کہا ہو۔ کفر کی تہمت جب ہر ایک پر رکھ دی گئی تو کوئی مسلمان ہونے کا دعویٰ کیونکر کر سکتا ہے حالانکہ ایسا ہر کافر بذات خود صحیح اسلام کا مدعی ہے اور حدیثوں سے ہی استناد کرتا ہے

اور جواباً اس کی احادیث کو ضعیف اور راویوں کو غیر معتبر قرار دیا جاتا ہے۔

یہ الزام طرازی بھی ویسی ہی ہے جیسی عقائد اور افراد پر کی جاتی ہے، حالانکہ وہ بھی محدثین اور مورخین کے بیانات کا سہارا لیتا ہے۔ اس طرح احادیث کا پورا سرمایہ اور تاریخ کا سارا اثاثہ غلط ثابت ہوتا ہے۔ ایسے میں خود مخبر صادق بھی آتے تو ان کے فرمودات جس کے حق میں ہوتے وہی اعتبار کرتا، دوسرے تمام آپ کی صداقت کے منکر ہو جاتے۔

یہ سب کرشمہ سازی ہے اس ذخیرہ احادیث کی جس کو شام کی خلافت اول میں داخل بیت المال کیا گیا تھا۔۔۔ یہ صدفی صد حق ہے مگر اس کو قبول نہیں کیا جائے گا کیونکہ شام کے خلیفہ نے اپنی ہزار خطاؤں کو اجتہادی غلطی کہلوالیا تھا اور اپنی ساختہ و پرداختہ حدیثوں کی بنیاد پر مستقبل کے امام ابوحنیفہ کو اس فتوے پر مجبور کر دیا تھا کہ ''اعمال ایمان میں شامل نہیں ہوتے بلکہ اس کا حسن ہوتے ہیں۔''

بدیہی طور پر نتیجہ یہ نکلا کہ بڑے سے بڑا خطاکار صاحب ایمان ہو گیا کیونکہ اس کی فضیلت کی حدیث موجود ہے۔۔۔ قرآن مجید سے رجوع کیا جائے تو ایک ان سنی آواز کان میں پڑے گی۔ ''ہم نے تو انتیس بار منافقوں سے چوکنا رہنے کی ہدایت کی مگر مسلمان ان کو پہچاننا نہ چاہیں تو کیا کیا جائے''۔۔۔؟ اس کی تردید نہیں ہو سکتی لیکن مطعون کیا جائے گا مبصر کہ اہل ایمان پر شبہ کرتا ہے۔ کوئی یہ نہیں سوچے گا کہ کلام باری غلط تو نہیں ہو سکتا کہ منافق ہوں گے انتیس سے کئی گنا زائد تب ہی تو ''منافقوں،، کا استعمال اتنی مرتبہ کیا گیا۔ ایک دو کی تو اتنی اہمیت نہیں ہو سکتی کہ خدا بار بار رسول کو باخبر کرتا۔۔۔ اس کے بعد مسلمانوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ ان منافقوں کے نام بتائیں کہ وہ کون کون تھے؟

کسی کو جانشین نہیں بنایا؟

ہر بات غیر منفصلہ اور تحقیق طلب ہے۔ اصحاب کے فضائل بیان کر دینے سے صرف عقیدت مند مان سکتے ہیں کیونکہ پہلے سے خوش خیالی موجود ہے لیکن فضائل مسلم اسی وقت ہو سکتے ہیں جب میزان عمل پر پورے اتریں اور یہ میزان ہے حضورؐ کا زندگی نامہ اور غزوات اسلام کی رزم گاہ، جس کا خلاصہ پیش کیا جا چکا ہے۔ اگر اس میں کوئی کمی رہ گئی ہے تو اس کو پورا کر کے معیار عمل کی تشکیل ناممکن نہیں ہے اک میزان بنا کر اس پر پرکھا جائے کہ کس نے کیا کارنمایاں انجام دیا جس

کے سبب وہ اس شرف کا مستوجب قرار پایا؟
فضائل صحابہ کا مختصر اقتباس صحیح بخاری اور صحیح مسلم سے اخذ کر کے پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ ابو سعید سے روایت ہے۔ ابو بکر ہم سب سے زیادہ علم رکھتے تھے۔ سب لوگوں سے زیادہ مجھ پر ابو بکرؓ کا احسان ہے مال کا بھی اور صحبت کا بھی۔ میں کسی کو خلیل بناتا تو ابو بکرؓ کو۔ اب خلت نہیں ہے لیکن اسلام کی اخوت ہے۔ مسجد میں کسی کی کھڑکی نہ رہے مگر ابو بکر کی رہے۔ (ف ۴۵ صفحہ ۸۲)

۲۔ انہوں نے (ابو بکرؓ) پوچھا۔ سب لوگوں میں آپ کو کس سے زیادہ محبت ہے؟ آپ نے فرمایا کہ عائشہ سے۔ انہوں نے کہا۔ مردوں میں؟ آپ نے کہا۔ ان کے باپ سے۔ پوچھا گیا۔ ان کے بعد؟ آپ نے فرمایا، عمر سے۔ یہاں تک کہ آپ نے کئی آدمیوں کا ذکر کیا۔ (۴۶ صفحہ ۸۴)

۳۔ ابن ملیکہ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عائشہ سے سنا: شیعہ جو یہ دعوی کرتے ہیں کہ حضرت علی کی خلافت پر آپ نے نص کیا تھا وہ باطل اور بے اصل ہے، خود حضرت علی نے تکذیب کی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ابو بکر کو خلیفہ کرتے؟ پھر پوچھا گیا ان کے بعد؟ کہا، عمر کو کرتے۔ پھر پوچھا گیا۔ ان کے بعد؟ کہا، ابو عبیدہ بن الجراح کو پھر خاموش ہو رہے۔

۴۔ ام المومنین عائشہؓ سے روایت ہے۔ آپؐ نے بیماری میں فرمایا۔ بلاؤ ابو بکرؓ کو اور اپنے بھائی کو تاکہ میں ایک کتاب لکھ دوں، ڈرتا ہوں کہ کوئی آرزو کرنے والا آرزو نہ کرے اور کوئی کہنے والا یہ نہ کہے کہ میں خلافت کا زیادہ حقدار ہوں۔ اللہ انکار کرتا ہے اور مسلمان بھی انکار کرتے ہیں، سوا ابو بکر کے کسی اور کی خلافت سے۔

۵۔ جبیر بن مطعم سے روایت ہے کہ ایک بدوی عورت نے پوچھا کہ اگر میں آؤں اور آپ کو نہ پاؤں تو کس کے پاس جاؤں آپ نے فرمایا ابو بکرؓ کے پاس،،۔ (۵۱)

اس کے بعد یہ کہنا بالکل غلط تھا کہ کسی کو جانشین نہیں بنایا لیکن نامزدگی تسلیم کر لی جاتی تو دعوت ذی العشیرہ سے خم غدیر تک کھینچے ہوئے تاریخی خط مستقیم کو کیا کیا جاتا۔ نتیجے میں وضعی احادیث کی قلعی کھل جاتی لہذا نامزدگی کو ایک سرے سے اڑا ہی دیا گیا، رسول کی پوری زندگی کو زیر بحث آنے ہی نہیں دیا گیا اور جو کچھ کرنا تھا، اسے منصوبے کے مطابق کر لیا گیا۔

سوال یہ ہے کہ ان احادیث کے بعد کیا خطرہ لاحق تھا کہ آنحضرت وقت آخر کسی اور کے حق میں وصیت کر دیتے، لکھتے تو انہیں حضرات کے لئے پھر لکھنے کا سامان آپ نے طلب فرمایا تو

کیوں نہیں دیا گیا اور ہادیٔ برحق کی نافرمانی کے مرتکب ہو گئے؟

تدوین حدیث سے پہلے اور تدوین کے بعد

قرآن، رسول کی وفات کے بعد جمع ہونا شروع ہوا تھا حضرت عثمان کی خلافت میں لکھا گیا اور تدوین حدیث کی طرف حضرت علی کے عہد خلافت میں توجہ دی گئی اور مروجہ اصولوں پر شیعان علی نے اپنے طور پر قلم بند کرنے کا آغاز کیا اس کوشش پر پانی پھیرنے کے لئے شام کا دارالفتاویٰ قائم ہوا اور پھر اتنے کارہائے نمایاں انجام دیئے گئے جن کی مثال نہیں مل سکتی۔

دوسری طرف ان راویوں نے جس کے نام صحیحین اور دیگر مجموعوں میں لئے جاتے ہیں، اپنے کارہائے عظیم کا آغاز کیا۔ احادیث کی مشتہری خلافت شام کی حدود میں ۴۰ء کے بعد کی گئی۔ اس سے قبل کتنی احادیث موجود تھیں اور کس کس کے حافظے میں محفوظ تھیں، اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ معاویہؓ بن ابی سفیان کا انتقال ۶۰ھ میں ہوا، جب اصحاب رسول کی مبینہ احادیث عام لوگوں کے گوش گزار ہو چکی تھیں لیکن اس کے بعد بھی دوسرے خلفائے بنی امیہ کے زمانوں میں بعض ایسی احادیث سننے میں آئیں جو اس سے پہلے سنی نہیں گئی تھیں۔ اس کے معنی یہ لئے جا سکتے ہیں کہ معاویہؓ کے بعد بھی عہد معاویہ کے ذخائر احادیث میں اضافہ ہوتا رہا جو شاید وقت کی ضرورت کا تقاضا ہو۔ کہ اموی اکابر اپنے اسلاف سے سرخروئی حاصل کرتے رہے۔

تحریر تاریخ اور تدوین احادیث بنی امیہ کے عہد آخر یا بنی عباس کے ابتدائی دور میں باقاعدہ شروع ہوئی یعنی رحلت پیغمبر برحق کے کوئی ڈیڑھ سو برس کے بعد۔۔۔ راویوں میں سب سے بڑے راوی ابو ہریرہ اور ان کے بعد ام المومنین عائشہ ہیں پھر دوسرے لوگ۔ ابو ہریرہ ۷ھ میں اسلام لائے، ان کی مدت صحابیت تین سال سے کچھ زائدہ ہے۔ ان تین سال میں بھی وہ دو سال طائف میں رہے۔ ام المومنین عائشہ کی رخصتی ۲ھ میں ہوئی، مدت زوجیت آٹھ ساڑھے آٹھ سال ہے۔ ابو ہریرہ پانچ ہزار تین سو چوہتر احادیث کے روای ہیں، ام المومنین سے دو ہزار دو سو دس حدیثیں مروی ہیں، حضرت انس سے دو ہزار دو سو چھیاسی اور حضرت عبداللہ ابن عباس سے ایک ہزار چھ سو ساٹھ احادیث کی روایت ثابت ہوتی ہے۔ بعد کے دوسرے اصحاب کی حدیثیں چودہ پندرہ ہزار سے زائدہ نہیں ہیں۔

مجموعی تعداد تیس چالیس ہزار سے تجاوز نہیں کرتی لیکن امام بخاری نے ایک لاکھ سے

زیادہ احادیث جمع کی تھیں جن میں سے انتخاب کیا تھا۔ امام مسلم کو ان پر مستزاد تازہ حدیثیں ہزاروں کی گنتی میں ملی تھیں۔ اسی طرح دوسرے محدثین کو مواد اضافی میسر آیا تھا۔ ان سب کا تخمینہ لاکھوں تک پہنچ جائے گا۔ یہ سب کہاں سے آ گیا؟ خلفائے بنی امیہ کے علاوہ کسی کا کام ہو تو بتایا جائے یہ اسلام کی ایک بڑی خدمت ہوگی۔

دوسری اور تیسری صدی ہجری کے مجموعوں میں سنن ابو الولید ۱۵۱ھ، جامع سفین ثوری ۱۶۱، تصنیف ابو سلمہ ۱۶۷ھ، تصنیف ابو سفیان ۱۹۷ھ سفیان بن عینیہ ۱۹۸ھ، امام شافعی ۲۰۴ھ، سنن احمد ابن حنبل ۲۴۱ھ، صحیح بخاری ۲۵۶ھ صحیح مسلم بن حجاج ۲۶۱ھ، سنن ابن داؤد ۲۷۵ھ، سنن ابن ماجہ ۲۷۳ھ صحیح ترمذی ۲۷۹ھ میں ترتیب پائیں یعنی آخر خلافت بنی امیہ سے دور خلافت بنی عباس میں معتمد علی اللہ تک۔ شاید اس کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا لیکن اتنا وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ احادیث تازہ بنی امیہ کے درمیانی عہد سے ملنا بند ہو گئی تھیں تاہم یہ حقیقت مسلمات میں سے ہے کہ تدوین احادیث کی گراں قدر خدمات اور تحریر و ترتیب تواریخ کے کارہائے عظیم عہد عباسیہ میں سرانجام دیئے گئے۔ تاریخین لکھنے کا سلسلہ تو آج تک جاری ہے جس کا دائرہ شام و عراق، اندلس و مصر و مراقش اور ہندوستان کو بھی اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے لیکن ایسی ہر تحریر کی تان حدیثوں کے ان ذخائر پر جا کر ٹوٹتی ہے جس سے بنی امیہ کے فرزند عظیم کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا اور اسلام کے تمام مسالک فقہ بھی شام کے خلیفہ اول کے ہی رہین منت رہیں گے جن کی بدولت وہ مواد فراہم ہوا، جن پر فقہی نکات کی اساس رکھی ہوئی ہے۔

بے محل نہ ہوگا، اگر اس منزل پر ایک مظلوم فرقے پر الزام تراشی کرنے والوں کو للکارنے کے بجائے دعوت تحقیق دی جائے کہ جہاں کوئی جواب بن نہیں پڑتا وہاں کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ روایت شیعوں نے شامل کر دی۔۔۔ یہ مخاطبہ شیر کی کھال اوڑھے ہوئے گیدڑوں سے نہیں ہے بلکہ حقیقتاً ان علمائے کرام سے ہے جو جبہ و دستار کے ساتھ علم بھی رکھتے ہیں۔ وہ بتائیں کہ تمام ادوار میں شیعوں کی حالت کیا رہی تھی؟ کس عہد اور کس مقام پر وہ کب اس حیثیت میں تھے کہ اپنی کوئی روایت کسی علمی ذخیرے میں داخل کر دیتے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ کوئی شیعہ اگر کہیں پایا بھی جاتا تو تقیہ میں اور کہیں کسی کا عقیدہ کھلا ہوا بھی ہوتا تو وہ سوسائٹی میں شمار کے قابل تھا بھی یا نہیں؟ شیعوں کو اپنی جانیں بچانا اور اسلاف کا علمی خزانہ ہی محفوظ رکھنا ممکن نہ تھا تو دوسروں کو اثاثہ احادیث یا تاریخی سرمائے تک کیونکر پہنچ سکتے!

اموی اور عباسی ادوار ان کے لئے یکساں تھے بلکہ بد سے بدتر کیونکہ وہ ان افراد کے نام لیوا تھے۔ جن کے حقوق پر خلافت یا شاہی کی عمارتیں کھڑی ہوئی تھی لہذا ان کو نا پیدا کرنا بقائے حکومت کے لئے ضروری تھا جس کو روز اول سے پیش نظر رکھا گیا تھا خلافت کے کوفے سے دمشق منتقل ہونے پر اس مقصد میں مکمل کامیابی حاصل کر لی گئی ایسی کامیابی جس نے ماضی سے مستقبل بعید تک ایک خط منحنی کھینچ دیا اور جس کے ہر موڑ پر اسلام کا ایک نیا مسلک وجود میں آ گیا۔ مسالک مختلف النظریات ہیں پھر بھی ان کے زاویہ ہائے نگاہ کے مابین ایک نقطہ مشترک ہے، خلافت کا۔

جب کہ شیعہ بعد رسول امامت منصوص من اللہ کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ وہ رسالت کی طرح نیابت کو بھی امر الٰہی کا پابند قرار دیتے ہیں۔

ابتداً مسلک احناف سے شیعوں کا زیادہ اختلاف نہیں تھا۔ صرف نیابت کا مسئلہ تھا جو زیر بحث لایا ہی نہ جاتا تھا لیکن وقت کے تدریجی ارتقاء کے ساتھ جب خانوادہ رسالت کی بے حرمتی کا تصور عام ہونے لگا تو احناف سے بھی دوری پیدا ہونے لگی اور نجدیت کی ہوا سے تو گویا ایک خلیج ہی پیدا ہوگئی۔ یہ سب کراماتیں ہیں اس ذخیرہ احادیث کی جو خلافت بنی امیہ کا کارنامہ ہے۔

پہلے احناف کا مسلک یہ تھا کہ وہ ابن ابی سفیان کو نہ اچھا کہتے تھے اور نہ برا مگر اب صورت حال یہ ہے کہ چوتھے خلیفہ کو بساط اسلام پر باقی رکھنے کو جی نہیں چاہتا اور ان کی جگہ خلیفہ شام کو بٹھا دینے پر قدرت نہیں کیونکہ ماضی کی طنابیں کھینچ کر اس کو حال پر منطبق کر دینا کسی کے بس کی بات نہیں۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ بڑی سے بڑی اسلام دشمنی کی تاویل منطقی استدلال سے کر دی جاتی ہے۔

نسلیں گزر جانے کے بعد عقاید بھی موروثی بن چکے ہیں جن کو جائز و ناجائز تاویلات سے برحق ثابت کرنا فریضہ ایمانی سمجھا جاتا ہے۔ یہ عمل صرف شیعوں کے مقابلے پر ہی روا نہیں رکھا جاتا بلکہ سنیوں کی باہمی نظریاتی تفریق میں بھی ایسا ہی کیا جاتا ہے اور اکثر ہاتھا پائی اور خون خچر کی نوبت بھی آ جاتی ہے شیعوں کے لئے تو اب اپی ہوئی تلواروں کے بجائے کلاشنکوف کا استعمال عام ہے ماضی پر ایک اچٹتی نظر بھی ڈالی جائے تو سبق لیا جا سکتا ہے کہ امویت، عباسیت، سلجوقیت یا ایوبیت اور غزنویت نے کیا کچھ نہیں کیا مگر حاصل کیا ہوا؟ آج پھر اسی عمل ناکام کو دہرانے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے مگر اس کا انجام جانوں کے اتلاف کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

پیغمبر کا جانشین

ختم المرسلین کی پیروی کے دعویدار اور سنت محمدیؐ کے علم بردار یہ بھی نہیں سمجھتے کہ اگر خون انسانی کی ارزانی کر کے انسانیت کا سدھار ممکن ہوتا تو کوئی بھی پیغمبرؐ صداقت وحقانیت کے بجائے ہتھیار لے کر یا قہر خداوندی کے آلات کے بل پر آتا، دیکھتے ہی دیکھتے بغاوت کرنے والوں کا صفایا کردیتا اور دہشت زدہ باقیات کو اپنے راستے پر چلنے کے لئے مجبور کردیتا لیکن مشیت ایزدی نے اس کو روا نہیں رکھا بلکہ ایک لاکھ چوبیس ہزار سفیران الٰہی کو عام انسانوں کی طرح نسل آدم میں پیدا کیا ان سب کو تلامذہ رحمٰن بنا کر مامور کیا اور انہوں نے اپنی نظیر سامنے رکھ کر انسان نما حیوانوں کو انسانیت کے سانچے میں ڈھال لیا۔

حضرت آدم پہلے نبی پھر انسان تھے۔ آدم ثانی حضرت نوح نے کشتی انسانیت کو پار لگایا تھا۔ نسل آدم اس کے بعد صرف حضرت نوح سے چلی یعنی اللہ سارے بنی نوع انسان کو اپنی نوع کی رہبری کے لئے اپنی طرف سے انسانیت کی مثال بنا کر بھیجتا رہا جو امکان نسیان وخطا سے مبرا ہوتا۔ یہ سلسلہ ختم المرسلین پر منتہی ہوا۔ اس کے بعد تا قیام قیامت کا زمانہ بغیر رہبری الٰہی کے گزرنا سنت الٰہی کے خلاف تھا جبکہ قرآن مجید شہادت دیتا ہے کہ کوئی خطہ ارض اور کوئی زمانہ ہادی مطلق سے خالی نہیں رہا۔ ختمی مرتبتؐ سلسلہ نبوت کی آخری کڑی تھے جس کے بعد آخری شریعت کا نفاذ کس کی ذمہ داری تھی؟ کیا کوئی امر الٰہی اس کے لئے صادر ہوا تھا؟ مسلمان کہتے ہیں کہ حضورؐ نے کسی کو نامزد نہیں کیا۔ بات سمجھ میں آتی ہے کہ قادر مطلق کے اختیار کی بات وہ کیونکر انجام دیتے۔ قابل غور ہے یہ نکتہ کہ جب رسولؐ اس کے مجاز نہ تھے کہ اپنا نائب خود بنائیں تو امت کے چند افراد کو اس کا حق کیونکر ہوسکتا ہے پیغمبر کا جانشین خود منتخب کرلیں۔ تلاش کرتے تو مل جاتا کہ خدا نے یہ شرف کس کو بخشا ہے؟ خدا کا کام اپنے ہاتھ میں لینا حد بشر سے باہر ہے!

حدیث سازی کا ایک بدیہی نتیجہ

شیعوں میں بعد نبی منصوص من اللہ امامت پائی جاتی ہے مگر دوسری طرف کوئی صریحی آیت یا حدیث نہیں ملتی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ امت نے کسی نہ کسی جواز پر جانشین رسول خود بنالیا تھا اور جب جانشین خدا کا متعینہ نہیں تھا تو کسی کا کچھ بھی کہہ دینا ممکن تھا اور اس کو حرف آخر کا درجہ دیا

نہ جا سکتا۔۔۔اس پر مستزاد ہے یہ صورت حال کہ متضاد احادیث میں اثباتی حدیث بھی صحیح اور منفی حدیث بھی غلط نہیں۔ بعد کے آئمہ اور مجتہدین دونوں کا جواز پیش کرتے ہیں۔ گویا جس کے اقوال ہیں، اس نے دونوں باتیں کہیں تھیں۔ایسی احادیث اتنی کثرت سے ہیں کہ قدم قدم پر کسی بات کا تیقن کرنے کے لئے منطقی فکر کا سہارا لینا پڑتا ہے اور اس پر بھی کوئی مانتا ہے اور کوئی نہیں مانتا۔

ملت مسلمہ کے لئے یہ باتیں تشویش سے خالی نہیں مگر اس سے زائد دکھ تو اس پر ہوتا ہے کہ توحید، نبوت، قرآن اور اسلام، سب کی شکلوں میں کچھ نہ کچھ اختلاف پیدا ہو گیا ہے جس سے نبوت بھی متاثر ہوئی ہے اور عصمت پیغمبری بھی۔ ستم بالائے ستم تو یہ ہے کہ صحیحین میں جو احادیث مصدق قرار دی جاتی ہیں، ان کا اطلاق جن کرداروں پر ہوتا ہے، ان کی نفی کر دی جاتی ہے مگر یہ بتایا نہیں جاتا کہ پھر حضورؐ نے کن لوگوں کے لئے یہ ارشاد فرمایا تھا۔ اگر پوچھا جائے کہ تاریخ سے نکال کر ان کے نام پیش کئے جائیں تو اس کا جواب نہیں ملتا۔۔۔ چند حدیثیں درج ذیل ہیں۔

قارئین خود انہیں تلاش کرنے کی سعی فرمائیں۔

''انس بن مالک سے روایت ہے۔

جو شخص مجھ پر قصداً جھوٹ بولے، وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لے،،۔(۵۲)

عبداللہ بن مسعود نے روایت کی ہے۔

مسلمان کو گالی دینا فسق ہے۔ اس کے ساتھ جنگ کرنا کفر ہے۔(۵۳)

قرآن و حدیث کی رو سے مسلمان کا قاتل جہنمی ہے۔

ابو ہریرہ سے روایت ہے۔

''جو شخص ہم پر ہتھیار اٹھائے، وہ ہم میں سے نہیں اور جو ہم کو دھوکا دے، وہ ہم میں سے نہیں،،۔(۵۴)

۵۲ کے سلسلے میں حدیث توریث کو ایک فرقہ قول رسولؐ نہیں مانتا۔ صحیح مسلم جلد ۳ صفحہ ۱۴۳ مطبع مصطفیٰ البابی الحلبی، مصر ۱۳۴۹ھ میں حضرت عمر کا ایک قول پایا جاتا ہے۔

''جب ابو بکر نے اس روایت کو بیان کیا تو علی اور عباس نے ان کو جھوٹا، گنہگار اور خائن ٹھہرایا،،۔

انہیں حضرت عمر کا ایک واقعہ صحیح بخاری جلد دوم کتاب الجہاد والیسر باب ۲۴۴ فرض الخمس، حدیث ۳۲۷ صفحہ ۱۷۱ مطبوعہ فرید بک اسٹال لاہور ۱۹۹۱ء میں ملتا ہے۔

''دوسال سے میں نے اسے اپنی تحویل میں رکھا ہے اور اسی طرح خرچ کرتا ہوں جس طرح رسول اللہ اور ابوبکر خرچ کرتے تھے۔ میں اس معاملے میں سچا، نیکوکار، حق و ہدایت کا تابع ہوں۔ آپ میرے پاس آئے ہیں اور اس سلسلے میں گفتگو کر رہے ہیں۔ آپ دونوں کا مقصد ایک اور بات بھی ایک ہی ہے۔ یعنی اے عباس! آپ اپنے بھتیجے کے مال میں سے اپنا حق مانگتے ہیں اور علی اپنے خسر کے مال میں سے، میں بیان کر چکا ہوں کہ رسول اللہ نے فرمایا تھا۔ ہمارا کوئی وارث نہیں ہے، جو مال ہم چھوڑیں وہ صدقہ ہے۔ پھر جب مجھے مناسب نظر آیا تو اسے میں نے آپ کی تحویل میں دے دیا لیکن اس شرط پر کہ اللہ کے عہد و پیان پر نظر رکھیں اور اس کی آمدنی کو اسی طرح خرچ کریں جس طرح رسول نے خرچ فرمائی اور جس طرح ابوبکر نے خرچ کی دونوں نے تصدیق کی تو حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ جب اس بات پر فیصلہ ہو چکا ہے تو مجھ سے اس کے سوا کیا فیصلہ چاہتے ہیں؟ قسم ہے اس خدا کی جس کے حکم سے آسمان و زمین قائم ہیں، میں اس بارے میں کوئی اور فیصلہ نہیں کروں گا۔ اگر آپ اس کی نگرانی سے عاجز آ گئے ہیں تو مجھے واپس کر دیجئے میں اس کی نگرانی کے لئے اکیلا کافی ہوں۔،،

روایت کے بیان کو اتنا طول دیا گیا ہے کہ اس کی نظیر صحیحین میں مشکل سے ملے گی اور یہ کوشش ارادی ہے تاکہ سننے والا تصنیف کو تصنیف نہ سمجھ سکے حالانکہ تاریخ اس کی تصدیق نہیں کرتی کیونکہ فدک کی جائیداد حضرت عمر بن عبدالعزیز سے پہلے بنی فاطمہ کی تحویل میں کبھی نہیں دی گئی اور حضرت علی اور حضرت عباس کے مانگنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا جب کہ اصل حقدار سیدہ فاطمہ زہرا کو بڑی بیدردی اور بے حرمتی کے ساتھ حضرت عمر نے مسترد کر دیا تھا۔ علی کو جو حق پہنچتا تھا وہ بنت رسول کے رشتے ہی سے۔ کتنی ستم ظریفی ہے کہ علی کو اپنے ہی پیمانے پر تولا گیا۔ وہ ہاتھ جو کبھی اٹھا تو خدا کی راہ میں جہاد کے لئے یا سائل کو نوازنے کیلئے اور وہ ہاتھ جو خدا کا ہاتھ کہا جاتا ہے، وہ اک بندے کے سامنے باغ فدک کے لئے دراز ہوتا پھر اس فدک کے لئے جو ان کا اور صرف انہیں کا حصہ تھا۔ کسی مادی چیز کو لینا ہوتا تو صفین میں چمکنے والی تلوار سقیفہ میں چمکتی دکھائی دیتی مگر تحفظ پیغمبری کے لئے خلق ہونے والا، دنیاوی مفاد پر مادی اقتدار کے لئے انسانی خون کی ارزانی کیا کرتا وہ گوتم و عیسیٰ کی طرح مقصد حیات کو پورا کرتا رہا اور دنیا اپنی دنیاداری کو دین کے پردوں میں چھپانے کے لئے کہانیوں کو تاریخ بناتی رہی جس کی اک نظیر یہ روایت بھی ہے۔ صحیح مسلم نے کچھ بیان کیا اور صحیح بخاری نے کچھ۔ شاید دونوں صحیح ہیں اور رسولؐ اسلام سے منسوب کر کے جھوٹ بولنے کا اطلاق کسی پر

نہیں ہوتا!

ایک ایک بات کے لئے متضاد اقوال رسول، ایک ایک سلسلے میں کئی کئی مختلف روایات، بدیہی نتیجہ ہیں خلیفہ شام کی مساعی جمیلہ کا، جن سے بلاشبہ ابوسفیان کی اسلام دشمنی کا خواب پورا ہوا۔ دنیا سازوں کو اپنے کو موزوں ثابت کرنے کی خاطر جس طرح کی ضرورت تھی دین عرب اور پیغمبر عرب ایسے ہی بن گئے، اور تاریخ اسلام اس طرح مرتب ہو گئی جس کا حقیقت سے، بہت کم تعلق تھا، البتہ پیغمبر برحق کے ازلی جانشین کو بظاہر اس سے بہت نقصان پہنچا۔ وہ اپنی پوری زندگی اسلام پر قربان کر دینے کے باوجود نہ دین کو آلودگی سے محفوظ رکھ سکا اور نہ خود اپنے کو۔

دنیا تا حیات اس کے صدق و صفا پر کیچڑ اچھالتی رہی۔ اس کے مقلدین پر حقیقی و مجازی تیر و نشتر لگانے کا سلسلہ آج تک جاری ہے اور متقدمین اور متاخرین کے کرداروں میں ایک یکسانیت پائی جاتی ہے جس سے محسوس ہوتا ہے کہ مسئلہ عقیدے کا نہیں ہے بلکہ ذاتی دشمنی کا ہے۔ قرآن مجید کا مسلمانوں کے لئے کھلا ہوا انتباہ بھی نظر انداز کر دیا گیا ہے کہ کسی فرد یا قوم کی عداوت میں کہیں تم حق و باطل کا امتیاز نہ کھو بیٹھو۔ یہ سب کچھ کیا جاتا ہے اسلام کے نام پر اور علی اور مقلدین علی کو اپنے محبوب کرداروں کا دشمن قرار دے کر، حالانکہ جو کچھ لکھا جاتا ہے، وہ ان محسوسات کے قطعاً برعکس ہے۔ باغ فدک کے سلسلے میں جو وضعی حدیث بیان کی گئی ہے، وہ اگرچہ ہر لحاظ سے کھوکھلی ہے پھر بھی امام نووی نے اس سے استفادہ کر کے شیعان علی اور عظمت علی دونوں پر ضرب لگائی ہے۔ ملاحظہ ہو ان کا بیان:-

''اس حدیث سے حضرت علی کی محبت حضرت عمر سے نکلی اور یہ بھی ثابت ہوا کہ حضرت علی حضرت عمر کی تعریف کرتے تھے، ان کو اللہ کا مقبول بندہ اور ان کے اعمال کو نیک سمجھتے تھے۔ یہاں تک کہ ویسے ہی اعمال کی خود بھی آرزو کرتے تھے۔

اب ان بے ایمانوں کا منہ کالا ہو جو معاذ اللہ حضرت علی اور حضرت عمر کے مابین مخالفت بیان کرتے ہیں۔ تمام سیر، احادیث اور تواریخ سے ثابت ہے کہ حضرت عمر اور حضرت علی سے کبھی کوئی جھگڑا نہیں ہوا بلکہ حضرت عمر نے اپنی خلافت میں تمام اموال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت علی اور حضرت عباس کے سپرد کر دیئے تھے اور ہر کام میں حضرت علی سے مشورہ کرتے تھے۔ بعض مسائل میں حضرت علی کی صلاح بھی لیتے تھے۔۔۔۔ حضرت علی نے اپنی بیٹی ام کلثوم کا نکاح بھی حضرت عمر سے کر دیا تھا، باوجودیکہ وہ بوڑھے تھے،،۔ (۵۵)

جواباً عرض ہے کہ ام کلثوم کا نکاح قطعی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ ام کلثوم بنت علی عبداللہ بن جعفر کے چھوٹے بھائی محمد بن جعفر سے بیاہی گئی تھیں جو چار سال سے کافی بڑی تھیں۔ حضرت عمر نے ام کلثوم نام کی جس چار سال کی لڑکی کو زور ڈال کر بلوایا تھا، وہ ام کلثوم بنت ابی بکر تھی، محمد بن ابی بکر کی چھوٹی بہن، جو حضرت ابوبکر کی وفات کے بعد اپنی ماں کے ساتھ آئی تھی اور اس نے بھی محمد بن ابی بکر کی طرح حضرت علیؑ کے گھر میں پرورش پائی تھی۔ اس کے بارے میں اکثر مورخین نے لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے بہت کم سن ہونے کے سبب واپس بھیج دیا تھا۔ صرف ایک مورخ نے شادی کی تصدیق کی ہے۔ جس کے لئے کئی بار مستند حوالے دیئے جا چکے ہیں پھر بھی وہی طوطے کی ایک رٹ ہے۔

حضرت علیؑ نے بلاشبہ متعدد بار فقہی مشورے دیئے اور عامۃ المسلمین کے مفاد میں صلاح بھی دی لیکن بعد رسول ﷺ یہ علیؑ کی ذمہ داری تھی اور امام کی حیثیت سے حضرت عمر کیا، کسی بھی مسلمان کی رہبری کرنا ان کا فرض عین تھا۔ پیغمبرؐ برحق کے نائب ازلی کا مقصد تخلیق صرف یہی تھا جس میں انہوں نے ایک لحظہ کے لئے بھی کوتاہی نہیں کی۔

رہ گئی بات خوشگوار دنیاوی تعلقات کی تو کوئی منصوص من اللہ رہبر حالات کو تلخ بنانے کے لئے تو پیدا نہیں ہوتا، صبر وضبط سے مظالم سہہ کر بھٹکے ہوئے لوگوں کو راہ راست دکھانا اس کا کام ہوتا ہے، حضورؐ کی ابتدائی زندگی جس کی شاہد ہے۔

بیعت کی کہانی گڑھ لینے سے تو بات بن نہیں سکتی۔ کہا جاتا ہے کہ سیدہ کونین کے انتقال کے چھ ماہ بعد حضرت علیؑ نے بیعت کر لی تھی، اگر ایسا تھا تو تہامہ کے قبائل کا قتل عام کیوں کرایا گیا تھا۔ ان کا کہنا یہی تو تھا کہ وہ خانوادہ رسالت کے سوا کسی کو زکواۃ لینے کا اہل نہیں سمجھتے۔ پھر علی جب حلقہ اطاعت میں داخل ہو گئے تھے تو اور کون تھا جس کو وہ زکواۃ دینا چاہتے تھے ـ ـ ـ۔ پھر مستقبل کی تاریخ نے کربلا میں ساری دنیا کو بتا دیا کہ بجبر بیعت طلب کرنے کا انجام کیا ہوتا ہے؟ بلاشبہ علیؑ نے اقتدار کے لئے تلوار نہیں اٹھائی تھی لیکن حرمت رسول پر ضرب لگائی جاتی تو اس کی حفاظت ذوالفقار پر واجب ہو جاتی، خواہ کربلا کا چالیس پچاس سال قبل ہی وقوع میں آنا ناگزیر بن جاتا۔ اس حقیقت کو بار بار ثابت کیا جا چکا ہے پھر بھی کوئی نہیں مانتا تو نہ مانے لیکن حقیقت تو اپنی جگہ پر ہی رہے گی کہ علی اور علیؑ کی اولاد نے کبھی بیعت نہیں کی اور کربلا کے بعد کسی کو اس کی جرات بھی نہیں ہوئی۔

اور اگر ایک لمحے کے لئے مان بھی لیا جائے تو اس کے بعد علیؑ سے عداوت کیوں ہے؟ امام ابن سیرین کا قول صحیح مسلم میں موجود ہے کہ علیؑ کے فضائل میں جتنی حدیثیں ہیں، ان میں سے اکثر

جھوٹی ہیں۔ آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ وہ جھوٹی ہیں۔ کیا آپ اس قابل ہیں کہ علی پر تبصرہ کریں اور اگر علی دوستوں کے دوست تھے تو ان پر کیچڑ کیوں اچھالی جاتی ہے؟ عمر بن عبدالعزیز کے چند برسوں کے علاوہ بنی امیہ کے پورے عہد میں علیؑ پر تبرا کیوں کیا جاتا رہا اور علی سے دشمنی نہیں ہے تو ان کے ماننے والوں کو بے ایمان کہہ کر ان کا منہ کس قصور پر کالا بنایا جاتا ہے جب کہ ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ جواباً صرف اتنا ہی عرض کیا جائے گا کہ اس کا فیصلہ قیامت ہی میں ہوگا، کہ منہ کس کا کالا ہے، کہنے والے کا یا اس کا جس کو مطعون کیا جاتا ہے؟

احادیث محولہ ۵۳ اور ۵۴ کے لئے خلیفہ چہارم کے آغاز خلافت سے خلیفہ شام کے کردار و عمل کا جائزہ لیا جائے تو سمجھ میں آ جائے گا کہ ان احادیث کا اطلاق ان پر ہوتا ہے یا نہیں؟ تاریخی شواہد نا قابل انکار ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی کوئی تاویل کر دی جائے یا شرعی فیصلے کو سہوا استنباط پر محمول کر دیا جائے حالانکہ اس کا کوئی جواز ثابت نہ کیا جاسکے گا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت میں دو پونے دو سال کبھی کبھی بیٹھنے سے اتنی فقہی معلومات ممکن نہیں کہ کسی میں اجتہادی اہلیت پیدا ہو جائے! حضرت معاویہ کے لئے ایک حدیث صحیح مسلم میں ملتی ہے کہ حضورؐ کے طلب کرنے پر جب معلوم ہوا کہ معاویہ کھانا کھا رہے ہیں تو آپ نے فرمایا۔ خدا اس کا پیٹ نہ بھرے!

اس جملے میں بھی تعریف کے پہلو پیدا کئے جاتے ہیں۔ یہ کوئی نہیں سوچتا کہ اسلام میں بسیاری خوری کی ممانعت ہے اور یہ بات حضورؐ کو پسند نہیں آئی تھی۔

امام حسن بصری کا کہنا ہے کہ معاویہ کی کئی باتیں نا قابل معافی ہیں۔ کوئی ان میں سے کسی ایک کا بھی مرتکب ہو تو وہ اس کی ہلاکت کے لئے کافی ہے۔ ان کا امت پر تلوار سونت لینا اور مشورے کے بغیر حکومت پر قبضہ کر لینا۔ (ملاحظہ ہو حدیث مبینہ ۵۳ اور ۵۴ ایسے مسلمان کو خارج از اسلام اور کافر کہا گیا ہے)۔

اپنے بد کردار بیٹے کو اپنا جانشین جنانا
زیاد کو اپنے خاندان میں داخل کرنا
حجر بن عدی اور دیگر اصحاب رسول کا قتل۔ (۵۶)

اور ان سب سے بڑا جرم ہے علیؑ پر پورے ممالک محروسہ شام میں تبرا جس کا سلسلہ حکومت بنی امیہ کے اختتام تک جاری رہا، سلطنت غزنویہ اور اورنگ زیب کے زمانے میں مغل شہنشاہیت میں جس کا اعادہ کیا جاتا رہا اور چھوٹے بڑے جن متعصب حکمرانوں نے اس کی تقلید کی،

وہ قابل ذکر نہیں ہیں۔ صحیح مسلم میں فرمان رسولؐ ہے کہ لعنت کرنے والے کی شہادت قیامت میں نہ لی جائے گی۔

ایسے اعمال کی اگر پردہ پوشی کی کوشش کی جائے تو اس کو جذبہ عقیدت سمجھ کر نظر انداز کیا جاسکتا ہے لیکن ناقابل درگزر ہے آیات قرآنی کی غلط تفسیر کرانا اور جھوٹی احادیث گڑھوا کر ایسے انبار لگوادینا جس نے اثاثہ پیغمبری کی شناخت ہی ختم کرادی، کہنے کو غلط کے لئے لفظ صحیح استعمال کرلیا جائے اور ایک بات پر متعدد حدیثوں میں، الفاظ کی تبدیلی کو اگر گوارا بھی کرلیا جائے تو متن میں اتنا فرق پیدا ہو جاتا ہے کہ تر و تازہ اور شاداب عقلوں کی فکر بھی جواب دے جاتی ہے اور جو حدیثیں ایک دوسرے کی نقیض کرتی ہیں، ان میں کوئی محدث یا مجتہد کیا، خود قائل حدیث بھی سوچ میں پڑ سکتا ہے۔ علم لدنی نہ ہو تو وہ بھی شاید بتا نہ سکے کہ اس نے کہا یا تھا؟

شیعوں کا سرمایہ احادیث جو کچھ بھی ہے وہ اگرچہ براہ راست آئمہ اثنا عشر کا بیان کیا ہوا ہے مگر ان میں بھی اکا دکا ایسی حدیثیں مل جاتی ہیں جن میں نام تو خانوادہ رسالت کے لوگوں کا ہے، مگر درحقیقت زبان و بیان کا ان سے کوئی تعلق نہیں وہ احادیث کے اس جنگل کی پیداوار ہیں جس کی آبیاری دمشق کے بیت المال سے کرائی گئی تھی اور جن کو اثنا عشر کی نسبت سے شیعہ محدثین نے لیا تھا۔

اہل السنت والجماعت کے محدثین نے مدینے سے شام تک پھیلی ہوئی احادیث سے اپنے مجموعے تیار کئے تھے۔ یہ احادیث پہلے تو مدینۃ النبی سے دیار شام تک آئی تھیں پھر ان کا مرکز دمشق بن گیا۔ وہاں سے عراق و عرب تک ان کا دائرہ وسیع ہوا۔ اس کے بعد پورا عالم اسلام شامل ہو گیا۔ احادیث کے ذخیروں میں اصل و نقل کی تمیز مفقود تھی۔ کوئی کہتا ہے کہ ان سب کی خالق پیغمبرؐ کی ذات گرامی تھی، کوئی خلیفہ شام کو کثرت کا ذمہ دار قرار دیتا ہے، کوئی مختلف لوگوں کے ہاتھ بتاتا ہے اور کوئی کہتا ہے کہ سب ارشادات رسولؐ کے تھے ان میں ترمیم و تنسیخ کردی گئی ہے۔ اسباب جو کچھ بھی ہوں مگر ان میں اتنا باہمی اختلاف اور اتنا اجتماع ضدین تھا کہ اس نے توحید، نبوت، خلافت، امامت اور خود اسلام کے پرخچے اڑا دیئے اور مسلمانوں میں اتنے فرقے پیدا کردیئے کہ ان کی ہم آہنگی بظاہر ممکن نظر نہیں آتی۔

اور کبھی کبھی بعض حدیثیں تو ایسی نظر آجاتی ہیں کہ ہنسی روکنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اس دور کے مسلمانوں کو کس قدر سادہ لوح سمجھ لیا گیا تھا کہ وہ اس پر اعتبار کرلیں گے۔ ام المومنین عائشہ سے روایت ہے کہ:

"دو شخص رسولؐ کے پاس آئے۔ معلوم نہیں، ان سے کیا باتیں ہوئیں کہ آپ کو غصہ آ گیا۔ آپ نے ان دونوں پر لعنت کی اور برا کہا ان کو۔ جب وہ باہر نکلے تو میں نے عرض کیا! یا رسول اللہ۔ ان دونوں کو کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ آپ نے فرمایا، کیوں؟ میں نے عرض کیا، اس وجہ سے کہ آپ نے ان پر لعنت کی اور ان کو برا کہا۔ آپ نے فرمایا تجھے معلوم نہیں، میں نے جو شرط کی ہے اپنے پروردگار سے، مالک میرے میں آدمی ہوں، میں مسلمان پر لعنت کروں یا اس کو برا کہوں تو اس کو پاک کر اور ثواب دے۔" (۵۷)

ابو ہریرہ سے روایت ہے۔

"یا اللہ میں آدمی ہوں، جس مسلمان کو میں برا کہوں، لعنت کروں یا ماروں تو اس کو پاک کر دے اور اس پر رحمت کر"۔

ایک تسلسل سے کئی حدیثیں اسی طرح کی پائی جاتی ہیں جن میں سیرت نبوی کا ایک معیار بتایا جاتا ہے کہ وہ ایک آدمی تھے، بغیر وحی کے اپنی طرف سے بھی بہت کچھ کہتے تھے اور جو کچھ وہ فرماتے، اس کے لئے پروردگار سے ان کا ایک پیمان تھا کہ الفاظ کے معنی برعکس لئے جائیں، برا کہیں تو اچھا، بددعا دیں تو دعا سمجھی جائے۔ شاید اس کی تاویل یہ کی جائے کہ ایسا صرف مسلمانوں کے لئے تھا، کفار یا مشرکین کے لئے نہ تھا، حالانکہ اگر ہوتا تو ان کے لئے بھی ہونا چاہیئے تھا کیونکہ آپ رہبر انسانیت اور رحمۃ اللعالمین تھے۔ اہل ایمان تو کسی سفیر الٰہی کے لئے ایسا تصور بھی نہیں کرتے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ آپ سراپا صدق تھے، مشیت کے سانچے میں ڈھلے ہوئے، انسان کی شکل وصورت میں نور مطلق، سایے سے مبرا، کسی مادیت سے خالی، قول وفعل کے اعتبار سے پابند الٰہی، بولتے تو صرف وحی الٰہی سے، جو کچھ کسی سے کہہ دیا، وہ امر الٰہی اور حرف اول وآخر۔

ایسی ہی حدیثوں نے اعتبار احادیث کھو دیا ہے۔ شاید حدیث گڑھ کر آپ کے ایک قول کے معنی بدلنا ہوں، جو آپ نے معاویہ بن ابی سفیان کے لئے کہا تھا کہ خدا اس کا پیٹ نہ بھرے۔

فکر کے دھارے پر ایک واقعہ اور گردش کرتا ہے کہ وقت آخر سے کچھ پہلے اسامہ بن زید کے لشکر کے ساتھ جانے کی تاکید ہر ایک کو کی تھی اور فرمایا تھا کہ۔

"علیؑ کے علاوہ جو بھی اس لشکر کے ساتھ نہ جائے گا، اس پر خدا کی لعنت ہوگی۔"

بڑے بڑے مورخین کی اکثریت اور علامہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے (مدارج النبوۃ ۶۹۳ مدینہ پبلشنگ ہاؤس کراچی ۱۹۷۵ء) میں لکھا ہے اکثر اکابر صحابہ نہیں گئے تھے پھر اس کی

تاویل یہ کی ہے کہ جانا خلاف مصلحت تھا۔ انہوںؓ نے کہا کہ لعنت سے غرض یہ تھی کہ آپ نے خدا سے دعا کی تھی، انہیں پاک کر اور ثواب دے۔ اگر محدث دہلوی یہ کہتے تب بھی مان لیا جاتا مگر اس سے ایمان صحابہ پر حرف آ جاتا کہ وہ پاک نہیں تھے اور رحمۃ اللعالمین ان کے لئے دعا فرما رہے تھے!

اسی لئے شعور فکر ایسی حدیثوں کو صحیح ماننے سے انکار کرتا ہے اور عقیدت سے ہٹ کر اور بے لوث ہو کر غور کیا جائے تو غلط احادیث ہی سارے فساد کی جڑ ٹھہریں گی اور ان کو وضع کرانے والا قاتل اسلام۔۔۔ جس کے بعد اتنا کہہ دینا کافی نہ ہوگا کہ فلاں گروہ نے یہ حرکت کی ہے۔ تاریخ سے ثابت کرنا پڑے گا کہ کس زمانے میں یہ مظلوم طبقہ اس قابل تھا کہ اس کو اپنی جانیں بچانے کی فکر نہیں تھی تو وہ ایسے ذرائع کہاں سے لاتا۔ انجام کار اُن تاریخی حقائق کو ماننا پڑے گا جس کی شہادت بڑے بڑے مورخین دیتے ہیں اور جو صراحت کے ساتھ لکھے جا چکے ہیں۔

اب اس طرح گھوم پھر کر ایک ہی نام ہدف بنتا ہے، وہ مرکز عقیدت ہے اور اس کی وجہ سے تسلیم کرنے سے انکار ہے تو اس کا کوئی علاج نہیں۔ ایسی حالت میں پروردگار سے صحیح راستہ دکھانے کی دعا ہی کی جا سکتی ہے!

اکابر میں باہمی اختلاف

علیؑ اور شیعان علی تو احادیث کثیرہ کی رو سے بعد وفات رسول گردن زدنی قرار پا گئے اور آج بھی ہیں۔ انہیں روافض کہہ کر نوازا گیا لہذا کوئی صفائی دینے کی ضرورت نہیں اور نہ ان کو اپنے جادۂ مستقیم کے لئے کسی ایسے سے سند درکار ہے جو خود اپنے کو برحق ثابت نہیں کر سکتے۔ ان مواقع پر اکثر کہہ دیا جاتا ہے کہ دنیا جنہیں مسلمان سمجھتی ہے، وہ مسلمان ہیں مگر یہ کوئی دلیل تو نہیں ہے کیونکہ اگر اکثریت دلیل صداقت ہے تو عیسائی، ہندو اور بدھسٹ کے عقائد پر نکتہ چینی کی گنجائش باقی نہ رہے گی۔

میرے ایک دوست نے ایک بار ایسی ہی بحث کے سلسلے میں کہا تھا۔

''حقائق تاریخ سے انکار کر کے تم اپنے کو حق بجانب ثابت نہیں کر سکتے،،۔

اس کو حقیقتاً میرے ساتھ بڑی ہمدردی تھی اور میری فکر کو قابل رحم سمجھتا تھا کہ میں مسلمات کی تردید کر کے سوسائٹی میں اپنے کو مطعون کرا رہا ہوں۔ میں نے اس کو شکر گذاری کے انداز سے دیکھا اور بڑی نرمی سے کہا۔

’’تم بھی تسلیم کر چکے ہو کہ وفات رسول کے وقت اور بعد میں جو کچھ کیا گیا، ایسے وفاداروں سے اس کی امید نہ تھی؟،،اس نے اقبال تو کیا مگر برجستہ اس طرح کہا، جیسے مجھے لاجواب کر دے گا۔۔۔

’’مگر فتوحات سے اسلام کو کتنا فائدہ پہنچا اور حضرت علی تو اپنی خلافت ہی کو سنبھال نہ سکے، معاویہ سے مات کھا گئے،،۔

ایک تاریخی نتیجے سے انکار کی گنجائش نہ تھی لیکن میں نے ہلکے سے تبسم کے ساتھ جواب دیا۔
تب ہی تو کافروں کے مقابلے پر نعرہ تکبیر کے بعد صفین کے شکست خوردہ کا نعرہ لگاتے ہو۔۔۔اللہ اکبر کے بعد جب بھی کہتے ہو، تو یا علیؑ کہتے ہو کبھی یا عمر، یا ابوبکر بھی کہا ہے،،؟

وہ دم بخود رہ گیا اور بڑی بے چارگی سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔
’’فرق ہے سیاست اور صداقت کا۔ تم مجھے صداقت سے سیاست کی طرف لانا چاہتے ہو تو ایمان میں سیاست نہیں ہوتی،،۔

یہ ذاتی تعلقات میں آپس کی گفتگو تھی لیکن حقیقتاً اس سے پیغمبرؐ اسلام کی شخصیت کے دو پہلو روشنی میں آ گئے تھے اور اسلام کے دو نظریوں کی ترجمانی ہو گئی تھی جو آج تک پائے جاتے ہیں۔ بات ہے نہ علی کی اور نہ ابوبکر کی اور نہ صفین کے دو فریقوں کی بلکہ دین خالص اور دین مرکب کی ہے۔ دین خالص کو کبھی کوئی یہودیت کہتا ہے اور کبھی علیؑ کو خدا کا اوتار کہہ کر شیعوں کو بدنام کرتا ہے مگر اپنے دین پر نظر نہیں ڈالتا جس پر خلافت سقیفہ سے خلافت شام تک اور شام سے خلافت بغداد تک ہر دور کی مہر لگی ہوئی ہے اور غزنوی سلجوقی اور ایوبی عہد کی ملمع سازی اس پر اضافی ہے۔ اس دین مرکب کی اساس پر اسلام کے شہرہ آفاق مورخ ابن خلدون نے اپنے مقدمے میں ایک اجمالی تبصرہ کیا ہے۔

’’منقولی تفسیر اچھی اور بری، مقبول و مردود، سب ہی پر مشتمل ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ عرب اہل کتاب نہ تھے، جاہل تھے۔ وہ ابتداء کائنات و مقاصد وجود کو معلوم کرنے کے لئے ان یہود و نصاریٰ کی طرف رجوع کرتے جو اسلام لا چکے تھے جیسے کعب بن احبار، عبداللہ بن سلام اور وہب بن منبہ وغیرہ۔ ان سے استفادہ کر کے انہوں نے تفسیر کی کتابوں کو منقولات سے بھر دیا جن کی بنیاد تورات یا خود یہودیوں کی من گھڑت باتوں پر رکھی ہوئی تھی۔

اور نہ صرف تفاسیر بلکہ کتب احادیث میں بھی اکثر ایسا مواد پایا جاتا ہے جن کو پڑھ کر

مسلمان شرم سے سر نہیں جھکاتے۔ ان کے مدوین وخالقین سے برأت ونفرت نہیں کرتے بلکہ انہیں اپنا دین وایمان قرار دیتے ہیں اور طرح طرح کی لایعنی تاویلیں کرکے صحت کرنے کے بجائے انہیں صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں''۔

اس بیان کی روشنی میں عہد رسول کے ان افراد کا جائزہ لیا جائے تو عالمان تورات وانجیل میں ورقہ بن نوفل کا نام سرفہرست نظر آئے گا جو دائرہ اسلام میں داخل ہونے سے قبل وفات پا گئے پھر وہ لوگ جنہیں مسلمانوں کی بساط علم وفقہ پر ایک امتیاز حاصل رہا۔ عبداللہ بن سلام کو بلا تردید بنی امیہ میں عالم العلام کا درجہ حاصل تھا۔

یہود ونصاریٰ کے یہ علماء نووار دان دائرہ اسلام میں آسمانی کتابوں اور ادیان ماسبق کے بحر العلوم گردانے جاتے، زہد وتقویٰ اور دینداری کا لبادہ اوڑھے ہوئے، جب نکات دین محمد کو بیان کرتے تو ان میں ان کے عقائد قدیمہ کے چراغ جل اٹھتے۔ مسلمان اکثر ان کو اپنے گھیرے میں لے کر یکجا ہوتے اور ہادیان ماسبق کی داستانیں سنا کرتے تھے۔ ان کی بڑی قدر وقیمت تھی عربوں کی نگاہ میں اور اموی عوام وخواص پر تو ان کے علم وجبروت کا سکہ بیٹھا ہوا تھا۔ کتب احادیث میں انکے فضائل کی روایتیں بھی پائی جاتی ہیں۔

ایسے ماحول میں جب انہیں موقع ملا تو انہوں نے روایات انبیاء کے طرز پر فرضی افسانوں اور اختراعی روایات سے عقیدت مندوں کے کان بھر دیئے اور اپنے پسندیدہ لوگوں کی عظمت بڑھانے کے لئے رسولؐ سے منسوب کرکے حدیثیں بھی بیان کردیں۔ جو مفسرین ومحدثین تک پہنچیں تو قدرے رنگ آمیزی کے ساتھ کتب تفسیر وحدیث کی زینت بن گئیں۔

یہ علماء اسلام میں کتنے مخلص تھے، انکے بارے میں کچھ کہنا ایک فاضل بات ہوگی لیکن اتنا کہا جاسکتا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ ان کے علم وتقویٰ کے سامنے کسی گنتی میں نہ آسکتے۔۔۔ دمشق کے اسلحہ ساز احادیث ان کی صحبت اٹھائے ہوئے تھے۔ ذہانت وطباعی اور مشاقی میں انہوں نے حقیقی یا مجازی استادوں کے نام روشن کئے اور حدیثوں کے ایسے جواہر پارے پیش کئے جن سے الفاظ قرآنی کی تفسیر میں بہت مدد ملی اور کسی آیت کا جو مطلب درکار تھا وہ نکال لیا گیا۔ ہوسکتا ہے کہ حسب ضرورت بعض احادیث فی البدیہہ بھی وضع کرلی گئی ہوں مگر یہ بات ثبوت کی محتاج ہے۔

سقیفہ کے بعد اگر ان تفاسیر واحادیث کا جائزہ لیا جائے تو ذخیرہ بہت کم تھا۔۔۔ بعض محققین اور مورخین کی کتب سے چند اقتباسات پیش ہیں۔ (تاریخ الخلفاء از علامہ جلال الدین

سیوطی اور کنز العمال جلد ۶)

حضرت ابوبکرؓ سے ایک مرتبہ کلالہ کے معنی پوچھے گئے تو آپ نے فرمایا:۔

''میرے خیال میں یہ باپ اور بیٹے کے علاوہ کوئی چیز ہے۔اس تسلسل میں آپ نے کہا ۔ یہ میں نے اپنی رائے سے کہا ہے۔اگر یہ معنی ٹھیک ہیں تو خدا کی طرف سے ہیں اور غلط ہیں تو شیطان کی طرف سے،،۔

پھر حضرت عمر کے دور میں پوچھنے والے نے ان سے دریافت کیا تو آپ نے کہا:۔

''مجھے شرم آتی ہے کہ ابوبکرؓ کی کہی ہوئی بات کو رد کروں،،

وقتی طور پر حضرت عمر نے ٹال دیا مگر بات ان کے دل میں کھٹکتی رہی کہ رسولؐ اللہ نے بتا دیا ہوتا تو شرمندگی نہ ہوتی۔

آپ نے بعد میں حضرت علیؑ سے دریافت کیا تو انہوں نے بتا دیا:۔

''خلافت د ربا یعنی سود،،(ماخوذ از کنز العمال بیہقی جلد ۶ حدیث ۳۱۶ مستدرک الحاکم جلد ۲)

تاریخ الخلفاء از علامہ سیوطی میں ابوعبیدہ نے ابراہیم تیمی سے روایت کی ہے۔

ایک مرتبہ حضرت ابوبکرؓ سے قول پروردگار ''فا کھتہ وابا،، کے معنی پوچھے گئے تو آپ نے کہا۔

''کون سا آسمان مجھ پر سایہ کرے گا اور کس زمین میں سما سکوں گا،اگر میں کتاب خدا کیلئے ایسے معنی بتاؤں جو مجھے معلوم نہیں،،۔

امام حسنؑ نے اس کے معنی بتائے ہیں۔

کتاب خدا اور ہم (ہم اور کتاب خدا) ینابیع المودہ باب ۳)

اصحاب کبار کو شاید علم قرآن کا زیادہ دعوی بھی نہ تھا۔علامہ جلال الدین سیوطی اپنی تفسیر اتقان جلد ۲ میں تحریر فرماتے ہیں۔صحابہ میں دس آدمی علم تفسیر میں مشہور تھے۔خلفاء میں سب سے زائد تفسیریں علی ابن ابی طالب کی ہیں،خلفائے ثلاثہ سے بہت کم۔اس کا سبب یہ ہے کہ صحابہ کا انتقال بہت جلد ہو گیا۔ابوبکر سے تفسیر میں جو روایتیں منقول ہیں،وہ دس سے زیادہ نہیں ہیں۔

بلاشبہ حضرت ابوبکرؓ کی مدت خلافت دوسال چار ماہ ہے۔اس عرصے میں بروئے تاریخ الخلفاء ہزاروں مقدمات و مسائل آپ کے سامنے آئے جن کے جوابات آپ گھر سے نکل کر

سڑکوں اور گلیوں میں موقر کو روک کر پوچھا کرتے تھے اور جو کوئی بتا دیتا، اس کو یاد رکھتے اور خدا کا شکر ادا کرتے کہ ان کی مشکل حل ہوگئی۔

حضرت عمر و حضرت عثمان کا زمانہ دس اور بارہ سال کا تھا۔ وہ ارباب علم وفقہ عبداللہ ابن عباس اور عبداللہ ابن مسعود اور خود حضرت علی سے مدد لیتے مگر جہاں تک اول الذکر دو اصحاب کا تعلق ہے، وہ خود حضرت علی کے تلامذہ میں تھے۔

مراۃ الانوار بحوالہ تفسیر نقاش کے مطابق عبداللہ ابن عباس کا بیان تھا کہ قرآن سات حرفوں پر نازل ہوا ہے۔ ہر حرف کے ظاہری اور باطنی دونوں معنی ہیں۔ حضرت علی ظاہر اور باطن کے کل معنی کو جانتے تھے اور ابن عباس نے حضرت علی سے اس کی تعلیم حاصل کی تھی۔

شاہ ولی اللہ اپنی کتاب قرۃ العینین میں لکھتے ہیں کہ ''خلفاء قرآن کے متعلق سوال کرنے والوں کو ابی بن کعب کے پاس، فرائض کے متعلق پوچھنے والوں کو زید بن ثابت کی طرف بھیج دیتے اور مالِ دنیا طلب کرنے والوں کو اپنے ذمے رکھتے تھے۔''

مقصد تحریر یہ ہرگز نہیں ہے کہ اکابر کے کرداروں کو داغدار ثابت کیا جائے۔ لیکن وضعی حدیثوں کے بل پر ہر فضیلت جو اپنے پسندیدہ کرداروں سے وابستہ کردی گئی ہے اس کی حقیقت کو واضح کرنا عین صداقت ہے اور یہ کلیہ جو بنالیا گیا ہے کہ اصحاب کو سوائے بھلائی کے یاد نہ کریں، خواہ ان سے رسولؐ کی کردار کشی اور قتل اسلام کا ارتکاب ہی کیوں نہ ہو جائے، اس کو ضمیر انسانی برداشت نہیں کرتا کیونکہ انہیں صحابہ میں سچے مسلمان بھی تھے اور مسلم نما منافق بھی۔ کون منافق تھا اور کون صاحب ایمان اس کا فیصلہ آج تک نہ ہوسکا اور نہ شاید کبھی ہوسکے کیونکہ جہاں کمزوریوں کی نقاب کشائی کی جاتی ہے، وہاں کبھی قلم اور کبھی تلوار اٹھالی جاتی ہے اور زبان بند کرنے کے لئے کسی حربے کے استعمال میں دریغ نہیں کیا جاتا۔

اس پر طرہ یہ ہے کہ پیکر صدق وصفا کرداروں کو شروع ہی سے سیف وقلم کی زد پر رکھ لیا گیا ہے اور خود مشرکین نے ان کے دامان عصمت کو آلودہ کرنے کی خاطر دشمنان اسلام کو اسلام کی صفوں میں لا کھڑا کیا۔ خلیفہ شام نے ماضی کی تقلید میں جو شگوفے کھلائے، صحیحین میں ان کے پھولوں کے گلدستے اس طرح آویزاں کئے گئے ہیں گویا انہیں سے اسلام کی زیب وزین ہے۔۔۔ بنگاہ غائر حدیث کی بعض کتابوں کا جائزہ لیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ اہل بیت رسالت کی اسلام میں کوئی جگہ ہی نہیں تھی۔

بعض مورخین نے ان پر تبصرے کیے ہیں۔ چند اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں۔ (میزان الاعتدال از علامہ ذہبی)

عباد بن ابی صالح، ''راوی'' مسلم وابوداؤد و ترمذی، حسن بن عمارہ فقیہ و قاضی بغداد ''راوی'' بخاری و ترمذی و ابن ماجہ، حارث ابن عمیر ''راوی'' بخاری و ترمذی، سب جھوٹی حدیثیں گڑھا کرتے تھے۔

عمران بن حطان ''راوی'' بخاری خارجی تھا اور حضرت علی، امام حسن و امام حسین کو گالیاں دیتا تھا۔ جریر بن عثمان ناصبی تھا، تبرے اور گالیوں کا مرتکب ہوتا تھا۔ مروان بن حکم محتاج تعارف نہیں، وہ کھلے عام خاندان رسالت کے افراد کو گالیاں دیتا تھا۔

حصین بن نمیر کربلا میں یزیدی فوج کا سردار تھا، مدینے کی تاراجی میں مسلم بن عقبہ کا دست راست تھا، معرکہ حرا میں اصحاب رسول کے قتل عام میں برابر کا شریک تھا، مدینے میں پاک دامن خواتین کی عصمت دری میں اس کا بھی ہاتھ تھا، مورخین کی اکثریت نے لکھا ہے کہ اس کے بعد مدینۃ النبی میں کوئی لڑکی کنواری نہیں رہی اور اسی تناسب سے کئی ہزار حرامی بچے پیدا ہوئے تھے۔ مکے کی بے حرمتی میں افواج یزیدی کا سردار وہی تھا اور اسی کے ہاتھ سے تاریخ میں بیت اللہ کی سب سے زائد پامالی ہوئی اس کو بھی صحیحین کا ''راوی'' ہونے کا شرف حاصل ہے۔

خارجیوں کی ایک بڑی تعداد راویان احادیث میں پائی جاتی ہے جن میں اشعت بن قیس کو فضیلت حاصل ہے جسے خارجیوں کا پہلا سردار کہا جاتا ہے۔

صاحب حدائق الحنفیہ نے تنزیہہ النظر فی توضیح الفکر میں، ملا علی قادری نے اس کی شرح میں، سخاوی نے شرح الفیہ میں، بخاری کے اسی اور مسلم کے ایک سو ساٹھ راویوں کو ضعیف قرار دیا ہے۔

ان محدثین کا معیار انتخاب یہ تھا کہ راوی اگر دشمن اہل بیت ہو تو وہ سچا ہے۔ علیؑ کی فضیلت بیان کرنے والا نگاہ اعتبار میں کھوٹا ٹھہرتا تھا۔

اور صرف خانوادہ رسالت پر ہی موقوف نہیں، مسلک خلافت کے مقلدین میں بھی اکثر لوگ ان کی میزان پر ہلکے ثابت ہوتے جن میں خود امام ابوحنیفہ بھی تھے۔

صاحب حدائق الحنفیہ کے مطابق ابوحنیفہ کی بضاعت احادیث کو کھوٹا قرار دیا جاتا نسائی کتاب الضعفاء کی رو سے ابوحنفیہ روایت میں قوی نہیں تھے۔

امام بخاری نے کتاب الضعفاء میں لکھا ہے کہ نعمان بن ثابت مرجیہ تھے ۔لوگ ان کی رائے سے ساکت ہو جاتے ۔

''عقیدہ ارجاء یہ ہے کہ ایمان صرف قول واقرار کا نام ہے، عمل ایمان کا جزو نہیں ہوتا۔ عمل سے ایمان میں کمی وزیادتی نہیں ہوتی، عام فاسق و فاجر انسان اور فرشتوں کا ایمان برابر ہوتا ہے''۔

اس عقیدے کی بناء پر امام بخاری اور شاہ عبدالقادر جیلانی نے بروئے ملل ونحل ازشہر ستانی، انہیں مرجی قرار دیا ہے۔اس عقیدے کو گمراہی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

صاحب حدائق الحنفیہ نے امام بخاری کی اس رائے کو تعصبانہ اور حاسدانہ کہا ہے اور ارجاء سے امام ابوحنیفہ کی نسبت کو تہمت اور افتراء قرار دیا ہے پھر تحریر کیا ہے کہ۔''امام بخاری نے دیکھا کہ امام اعظم اپنے ورع وتقوی، کثرت علم وعبادت، زہد وریاضت کے باعث مرجع سلف و خلف ہیں اور ان میں بفضل الٰہی کوئی بات مثل فسق ورذالت نہیں ہے جس سے عدم قبولیت کا امکان ہو لہذا ان پر الزام لگا دیا جس کی کتاب اصح الکتب ہو اور بعد کتاب باری تصور کی جاتی ہو، اس کے خلاف غلط بیانی بڑی دیدہ دلیری کا کام ہے''۔

طویلے کی اس لنیاہج میں گروہ بندی کی سی صورت ہے۔

طبقات شافعیہ بترجمہ بخاری جلد۲، میں امام محمد بن یحیٰی نے امام بخاری کو بدعتی لکھا ہے۔

امام ذہبی نے میزان اعتدال جلد۲ میں تحریر کیا ہے کہ امام مسلم کے استاد ابوزرعہ اور ابوحاتم امام بخاری کی حدیثیں نہیں لیتے تھے۔علامہ ابن ذوالنبیین ابن دحیہ کا کہنا تھا کہ بخاری کی عادت تھی کہ حضرت علیؑ کے فضائل کی احادیث میں کاٹ چھانٹ کردیا کرتے تھے۔وہ حضرت علیؑ سے منحرف تھے۔(استقصاء الافہام جلد۱)

کتب صحیحین کے مولفین ہی میں نظریاتی اختلاف نہیں تھا بلکہ ان کی تالیفات کے آہنگ میں بھی یکسانیت نہیں تھی۔صحیح بخاری کے بارے میں اور بھی ایسی ہی آراء ہیں جن کو صرف نظر کر کے انوار القرآن، مقدمہ بحوالہ جواہر معینہ جلد۲ سے ایک اقتباس قابل ملاحظہ ہے کہ :-

''امام مسلم نے جب اپنی صحیح لکھ کر اپنے استاد ابوزرعہ کو دکھائی تو انہیں رنج ہوا۔انہوں نے غصے میں کہا، تم نے اس کا نام صحیحہ رکھا ہے جب کہ اس کو بدعتوں کا زینہ بنایا ہے۔امام عبدالقادر کہتے تھے، خدا رحمت کرے ابوزرعہ پر بالکل ٹھیک کہا تھا انہوں نے استقصاء جلد۱ بحوالہ کتاب

رہیں گی کہ بہتّر کی تعداد پورے ہو جائے۔

ان بہتّر میں سے اکہتّر ایک طرف اور ایک دوسری طرف شمار کیا جاتا ہے۔ بالا اختصار کہا جائے تو ایک کی تقسیم ممکن نہیں ''اکہتر،، کے ٹکڑے ہوتے رہتے ہیں اور انجام کار سرور کائنات کی ذات گرامی پیغمبری اور فرمانروائی میں منقسم ہوگئی ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو حصول فرمانروائی کے لئے تشکیل خلافت کی ضرورت ہی لاحق نہ ہوتی۔ کسی سے کہا بھی جاتا تو وہ پیچھے ہٹ جاتا کیونکہ صرف بساط پیغمبری میں دھرا کیا تھا اور اس کی صلاحیت بزور بازو حاصل کرنے کی چیز بھی تو نہیں تھی۔ غزوات اسلام نے ثابت بھی کر دیا تھا کہ بازوؤں میں طاقت علیؑ کے علاوہ کہیں اور پائی بھی نہیں جاتی تھی لیکن صداقت کا توڑ ہر زمانے میں سیاست سے ہوتا رہا ہے اور عرب کے قبائلی نظام میں اندرونی سازشوں کا وجود ہمیشہ سے پایا جاتا تھا۔

جہاں تک دنیا کی بڑی طاقتوں کا تعلق ہے، انہوں نے حجاز کے بیہڑ اور بے آب و گیاہ ریگستانوں پر کبھی توجہ نہیں کی تھی، لے دے کے یمن کی سرزمین یعنی ملکہ بلقیس کا ملک سبا تھا جو کچھ کشش رکھتا تھا تو وہ حبش کے زیر نگین تھا، قرآن مجید جس کی گواہی دیتا ہے۔

سورہ الم ترا کیف عبدالمطلبؓ کے یقین توحید پر دلالت کرتا ہے۔۔۔مکہ مدینہ اور ریگزار کے دوسرے مقامات کے قبائل، شورائی نظام پر چلتے تھے لہذا وہاں روایتی معاشرت اور تمدنی سیاست پائی جاتی جوام القریٰ میں دوسری جگہوں سے زائد تھی، بالخصوص بنی ہاشم اور بنی امیہ میں، دونوں کی مختصر تعریف دو لفظوں میں صداقت و سیاست سے کی جاسکتی ہے۔

دینی قیادت اگر سیاست سے ممکن ہوتی تو بنی امیہ بہت پہلے اس کو حاصل کر لیتے لیکن اس میں شاید مشیت ایزدی کو دخل تھا یا صداقت کی معجز نمائی ہو کہ بنی امیہ کامیاب نہیں ہوئے۔ چراغ صداقت جب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شکل میں اپنی انتہائی منزل پر روشن ہوا اور بھڑک کر گل ہو گیا تو ابوسفیان اس کی بساط پر قبضہ کرنے کے لئے پہلے سے موجود تھا مگر ایک دوسرا گروہ اس سے قبل اپنے پنجے بڑی مضبوطی سے گڑو چکا تھا، جس کو صنادید عرب کا نمائندہ کہا نہ جاسکتا مگر وہ ان سے بازی مار لے گیا اور آل ابی سفیان کو مقصد براری کے لئے تحمل سے کام لینا پڑا۔ اس آزمائش میں انھیں کامیابی ہوئی۔ شاید اسی لئے مسلمان حلم کو معاویہ سے مختص کرتے ہیں۔

حضرت عثمان کے پیش رو شیوخ خلافت بنی امیہ کے مقابلے میں اسلام دوستی میں کہن سال تھے، خدمت دین اور طلب اقتدار دونوں میں انھیں اولیت حاصل تھی صراط عمل میں ان کے

قدم مضبوطی سے جم گئے تھے لہذا انھیں کامیابی ہونا ہی چاہیئے تھی اور طریقہ کار میں بھی شاید وہ زیادہ سوجھ بوجھ بھی رکھتے تھے جس کا اندازہ مقصد براری کے لئے ان کے طور طریقے سے ہوتا ہے کہ مسند خلافت پیغمبری پر اس سلیقے سے انہوں نے تخت حکومت سجا دیا کہ مملکت اسلامیہ آہستہ آہستہ حکمرانی کی عام ڈگر پر آ گئی اور اس کے ماتھے پر اسلام کا لیبل بھی آویزاں رہا۔

ابن ابی سفیان نے دل ہی دل میں پہلے دن سے انھیں استاد مان لیا تھا۔ اس لئے ان کے راستے پر ایک ہوش مند شاگرد کی طرح قدم زن رہا اور دھیرے دھیرے اس میں اتنی ترق بھڑک پیدا کر دی جو اس کے آبائی مزاج کا خاصہ تھی۔

دنیا میں حکومت سازی کا بنیادی تقاضا ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ اس کو وراثت کا پابند رہنے نہ دیا جائے اور سابق حکمراں کی اولاد اگر اہل بھی ہو تو اس کو ناکارہ ثابت کر دیا جائے پھر اس کو اس قابل نہ رکھا جائے کہ وہ کبھی سر اٹھا نہ سکے۔۔۔ رسولؐ کے متقی اور ریاضت کار صحابہ نے بھی اسی پر عمل کیا اور انھیں اس کے مواقع بھی میسر آ گئے کیونکہ مملکت تھی ہادیانہ صداقت کی اور خود رسولؐ کے ورثہ دار صداقت کے علاوہ کوئی حربہ استعمال ہی نہ کر سکتے تھے۔ دنیاداری ان کے خمیر میں داخل ہی نہیں تھی اور بساط پیغمبری پر نص امامت انھیں اپنے مسلک سے ہٹنے نہ دیتی۔ اس کے برعکس مسلمانوں کی اکثریت صرف دس بارہ سال یعنی مدینے کی زندگی میں ہادی برحق کے زیر تربیت رہی تھی۔ اس میں بہت کم لوگوں کے قلوب سے صحرائیت کے آبائی اثرایت کالعدم ہو سکے تھے جو آنحضرت کی زندگی میں دبتے چلے گئے مگر ان کے بعد ماحول کی تبدیلی سے اندر کے بنیادی نقوش ابھرنے لگے اور بعض سن رسیدہ افراد کی تقدس نما شخصیتوں کی ہوا پا کر داخل اور خارج کا آمیزہ بن گئے۔ سازش کا تانا بانا دبے لفظوں میں کئی بار پیش کیا جا چکا ہے۔

مہاجرین کی اکثریت اہل مکہ کی تھی جن میں جاہلیت کے عمائدین کی اولاد بھی شامل تھی ۔۔۔ ان کے علاوہ باہر کے کچھ لوگ بھی تھے جیسے فارس کے سلمان، حبش کے بلال اور ابوذر غفاری وغیرہ جو مکے والوں پر اثر انداز نہ ہو سکتے کیونکہ مکے والوں کی اکثریت میں علیؑ دشمنی اور ذاتی مفاد کے نظریات اس حد تک پائے جاتے کہ انھیں خود اپنے ضمیر کی آواز سنائی نہ دیتی اور کوئی سناتا بھی تو اسے ان سنا کر دیتے۔ نتیجے میں وہ سب کچھ پیش آیا جس پر آج بھی کبھی کبھی تنہائی میں تاریخ کے آنسو نکل آتے ہیں۔

حصول اقتدار کا جواز چند وضعی احادیث پر مبنی تھا جن میں کچھ اضافے مدینے میں ہوئے

پھر دمشق میں انبار لگ گئے، جن سے اسلام، ہادی اسلام اور تاریخ اسلام کے مبینہ کردار تیار ہوئے پھر ان کرداروں سے فضائل کے وہ تمام فرمودات رسول وابستہ کردیئے گئے جو اہل بیت سے متعلق تھے اور اسی کے ساتھ افراد اہل بیت کی کردار کشی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی گئی، احادیث کے ذخائر اور مجموعہ ہائے احادیث تیار ہوئے اور تاریخیں بھی لکھی گئیں۔ بعض مورخین نے ثقہ راویوں سے سنے ہوئے واقعات جزو تاریخ بنا دیئے تو انھیں جھوٹا کہا جاتا ہے اور اہل بیت کے سلسلے میں بچے کھچے ارشادات پیغمبری کو وضعی قرار دیا جاتا ہے۔ مسلمانوں کے تمام فرقے انھیں احادیث کی تقویت پر باہم دست وگریبان ہیں جن پر کافی بحث کی جا چکی ہے۔

ایک آخری کارنامہ آیات قرآنی کی غلط تفاسیر کا ہے جو خلیفہ شام نے شاہراہوں پر بیان کروائی تھیں۔ ان آیات کے متعلق کچھ لکھا جائے تو مناظرے کی صورت پیدا ہو جائے گی اور حاصل کچھ نہ ہوگا پھر بھی نظیر کے طور پر صرف ایک آیت پیش کی جاتی ہے، جو سن وسال کے اعتبار سے اصحاب کی بزرگ ترین شخصیت کے متعلق ہے اور اس کے ذیل میں سب سے کم عمر داماد رسولؐ بھی آجاتے ہیں۔ پارہ نو سورہ توبہ آیت چالیس کا لفظی ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔ تفسیر قارئین خود فرمالیں۔

''اس وقت صرف دو آدمی تھے، دوسرے رسولؐ تھے، جب وہ غار میں تھے اور اپنے ساتھی کو سمجھا رہے تھے کہ گھبراؤ نہیں، خدا یقیناً ہمارے ساتھ ہے تو خدا نے بھی اس کے لئے اپنی طرف سے تسکین نازل فرمائی،،۔

اس آیت کو حضرت ابوبکر کا شرف قرار دیا جاتا ہے کہ پروردگار نے خود ان کی دل جوئی فرمائی۔۔۔ اموی مورخ اور مفسر کہتا ہے کہ حضرت ابوبکر غار میں تمام سوراخوں میں کپڑا ٹھونس رہے تھے کہ ان میں سے سانپ بچھو نکل کر حضورؐ کو ڈس نہ لیں وہ رو رہے تھے کہ دشمنوں کی تعداد زائد ہے اور وہ صرف دو ہیں، حضورؐ کی جان کو خطرات میں پاکر بڑی بے چینی تھی، بالالفاظ دیگر انھیں خود اپنی کوئی فکر نہ تھی، ہر تدبیر اور رونا دھونا صرف رسولؐ کی خاطر تھا اس میں اتنی شدت تھی کہ اکثر آواز بھی نکل جاتی تھی۔

اور حضرت ابوبکر کی روایتی فدا کاری سے توقع بھی اسی کی، کی جاسکتی تھی لیکن یہ کہتے ہوئے خوشی نہیں ہوتی کہ ماضی اور مستقبل کی تاریخ اس جذبے کو غلط قرار دیتی ہے۔ شعب ابی طالب میں بھولے سے بھی خبر نہیں لی کہ ان کے ہادی برحق پر کیا گزری جو کچھ بیتا اس کو علیؑ کے عظیم المرتبت باپ نے جھیلا، جنگ احد میں خبر شہادت پر جان بچا کر الجراح کے ساتھ بھاگ نکلے تھے، جس طرح

رسولؐ کی میت کو پیٹھ دکھا کر سقیفہ بنی ساعدہ چلے گئے تھے اور اس کے بعد ہر ذمہ داری ابو طالب کے بیٹے پر آ پڑی تھی جو اس کے ازلی فرائض میں داخل تھی، حنین میں سب کے ساتھ ابو بکر بھی اپنے پیغمبر کو مرنے کے لئے چھوڑ کر اپنی جان بچا لے گئے تھے، غار ثور میں فرار کا امکان ہوتا تو کیا نکل نہ جاتے۔ ان حقائق کے باوجود کوئی ضمیر فروش یہ کیونکر لکھتا ہے کہ انھیں اپنے لئے حشرات الارض کا خوف نہ تھا اور دشمنوں سے ڈر رہے تھے تو صرف رسولؐ کی خاطر کہ ان کے قتل ہو جانے کا خطرہ تھا، اسی لئے رو بھی رہے تھے۔۔۔ جبکہ رسولؐ خود مطمئن تھے اور انھیں سمجھا رہے تھے کہ ڈرتے کیوں ہو، خدا بھی ہمارے ساتھ ہے۔ اگر مخبر صادق کی یقین دہانی پر اعتبار آ جاتا تو خود خدا کو تسکین دینے کی ضرورت پیش نہ آتی۔۔۔!

آیت کے الفاظ کو سامنے رکھا جائے ''اس وقت دو آدمی تھے، دوسرے رسول،، پہلے یار غار، دوسرے رسول یعنی یار غار سانپ اور بچھو کے خوف سے سوراخوں کو بند کر رہا تھا اور دشمنوں کو زائد سمجھ کر قتل ہو جانے کے تصور سے رو بھی رہا تھا۔ خود رسول بالکل بے خوف اور مطمئن تھے، انھیں یقین کامل تھا کہ خدا ان کے ساتھ ہے لہذا کسی کو کوئی گزند نہیں پہنچ سکتا۔ خود یار غار کو نہ رسولؐ کی ذات گرامی کی معجز نمائی پر اعتماد تھا اور نہ خدا کے ساتھ ہونے کا یقین۔۔۔ رسول نے فرمایا بھی تو شاید صداقت پر اعتبار نہیں آیا۔ تب ہی تو خدا کو خود تسکین دینا پڑی۔۔۔ آیت کے ماقبی الفاظ پر غور فرمایا جائے۔

> '' جب وہ غار میں تھے اور اپنے ساتھی کو سمجھا رہے تھے کہ گھبراؤ نہیں، خدا بھی یقیناً ہمارے ساتھ ہے تو خدا نے بھی اس کے لئے اپنی طرف سے تسکین نازل فرمائی،،۔

اس کے بعد کیا یہ کہنا غلط نہ ہوگا؟ کہ اگر یار غار کو رسولؐ کی صداقت پر اعتماد ہوتا تو رسولؐ کو سمجھانے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی اور اگر پہلے ہی خدا کے ساتھ ہونے کا یقین کرتے تو رسولؐ کیوں بتاتے اور رسولؐ کے کہنے پر تسکین ہو جاتی تو خدا کو ایک زائد کام کیوں کرنا پڑتا۔

اندھی عقیدت سے کام نہ لیا جائے تو پس منظر اور پیش منظر کی تاریخ ناقابل انکار ہے اور آیت کے معنی میں بے محل معنیٰ آفرینی نہ کی جائے تو الفاظ اور انداز بیان کے مفاہیم وہی ہیں جو پیش کئے گئے۔

اس کے بعد کل ایمان کے مقابلے میں راسخ الایمان کہنا کتنا بڑا ظلم ہوگا۔ اس کو محسوسات

سے سمجھا جا سکتا ہے۔

اس واقعے کے ساتھ اگر بستر رسولؐ پر رسول کی شبیہ بن کر سونے والے پر نظر ڈالی جائے تو آیات قرآنی صداقت ایمان کی گواہ ہیں اور نفس بیچ کر سونے والے کے لئے فرمودات ایزدی کی غلط تفسیر کی جائے تب بھی حقائق تاریخ نا قابل انکار ہیں۔

اردو کے محاورے میں، گھوڑوں کا سوداگر گھوڑے بیچ کر سویا تو ذہن کا ہر بوجھ اتر چکا تھا۔ اس کو ایسی نیند آئی کہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔ علیؑ نے اپنا نفس خالق کونین کے ہاتھوں بیچ دیا تھا اب ان کے پاس کیا رہا تھا۔ سب کچھ تو خدا کا تھا، خطرات سر پر منڈلا رہے تھے کفار قریش کسی لحہ بھی محمد سمجھ کر حملہ کر سکتے تھے پھر بھی علیؑ اپنی ہوئی تلواروں کی چھاؤں میں جوانی کی نیند سو گئے کیونکہ ان کی کوئی ذمہ داری تو رہی نہ تھی ہر شے اللہ کی تھی سب کچھ اس کی مشیت پر تھا وہ چاہتا تو حفاظت کرتا نہ چاہتا تو نہ کرتا۔ نقصان و نفع سب اسی کا تھا۔

یہ فیصلہ بستر رسولؐ اور غار ثور کو تصور میں رکھ کر کیا جا سکتا ہے کہ خطرات کہاں زیادہ تھے؟ غار کے دہانے کے سامنے چند افراد کسی شبہ پر آ کر ٹھہر گئے تھے، اس کے مقابلے میں رسولؐ کے گھر کے محاصرے میں ہر قبیلے کا ایک ایک آدمی شمشیر بکف نظریں جمائے کھڑا تھا کہ سفیر الٰہی کو دیکھتے ہی قتل کر دے، حالانکہ سفیر الٰہی موجود نہ تھا۔ علی کا ساتھ دینے والا اگر کوئی تھا تو اللہ کے حاضر و ناظر ہونے کا یقین پھر بھی علی اردو کے محاروے میں سولی پر حافظ حقیقی پر ایمان کامل کے ساتھ بے خبر سو گئے۔۔۔ غار میں سفیر الٰہی خود موجود تھا اور اسلام پر عقیدہ رکھنے والے کے لئے اللہ بھی موجود تھا اور قرآن مجید کے الفاظ میں رسولؐ اپنے ساتھی کو سمجھا رہے تھے کہ گھبراؤ نہیں، خدا یقیناً ہمارے ساتھ ہے، حالانکہ وہ بات سمجھانے کی تھی ہی نہیں جو ہر مومن کا عین ایمان ہوتی ہے پھر بھی یار غار مطمئن نہیں تھے۔

اور اگر یہ مان لیا جائے کہ وہ اپنے لئے نہیں رو رہے تھے انھیں رسولؐ کی ذات گرامی کے قتل ہو جانے کا خوف تھا تو سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ خوف ان کے لئے کیوں تھا جبکہ خود انھیں کوئی گھبراہٹ نہیں تھی وہ جس کے نمائندے تھے، اس کی مشیت پر راضی بارضا رہنے کی تعلیم انہوں نے دی تھی۔ شاید اس تعلیم میں کوئی کمی رہ گئی تھی یا پھر معلم کے حصول علم کی سطح میں ناپختگی کا کوئی عنصر پایا جاتا تھا کہ معلم مطلق کی زندگی اور موجودگی ہی میں وہ اس کی تعلیم کو بھول گئے تھے۔ تھوڑی سی بھی فکر کی جائے تو ہر دو جانب ایمان کا توازن اور تقابل آئینہ ہو جائے گا لیکن عقیدہ جب موروثی بن جاتا

ہے تو اپنے خلاف کچھ سوچنے کی اجازت نہیں دیتا لہذا ایسی کسی بحث کو چھیڑنا ایک فاضل کام ہے لیکن قلم اس وقت بے اختیار اٹھ جاتا ہے، جب ستاروں کی خود ساختہ آب و تاب کو دکھانے کے لئے چاند پر خاک ڈالنے کی سعی کی جاتی ہے۔۔۔کاش یہ سعی بند کر دی جائے!

حسبنا کتاب اللہ

احادیث کے ساتھ ایسی تمام آیات کی فکری تفسیریں بھی تخلیق مسالک کی اساس ہیں جن پر بحث کرنا بحث برائے بحث ہوگا کیونکہ منطقی جواز کے بل پر ہر ایک اپنے کو حق بجانب قرار دیتا ہے۔ البتہ حقائق تاریخ تبصرے میں معقولات کا سہارا بن سکتے ہیں لہذا واقعہ قرطاس میں حضرت عمر کے فیصلہ کن الفاظ کو تاریخ ساز قرار دیا جاتا ہے۔ آپ نے فرمایا تھا ''یہ مرد ہذیان بک رہا ہے۔ ہمارے لئے کتاب خدا کافی ہے،، جملے کو صریحی تاریخ اسناد کے باوجود بعض اکابر کا عقیدہ غلط کہنے پر مجبور کرتا ہے، اس کو نظر انداز کر کے صرف دوسرے جملے پر کچھ عرض کرنا نا قابل انکار ہوگا۔

کتاب خدا کو کافی سمجھ کر اس کو خلافت اسلامیہ کا دستور بنایا گیا تھا لیکن اس میں آیات کی منطقی تفاسیر سے الجھنیں پیدا ہونے لگیں تو پہلے تو فقہائے عصر سے مدد لی گئی جن میں عبداللہ ابن عباس اور عبداللہ ابن مسعود کے ساتھ حضرت علی کا نام بھی لیا جاتا ہے اور واقعی حضرت علی نے اکثر دریافت کرنے پر فقہی مسائل میں اپنے فیصلے سنائے مگر بعد کے ائمہ، ابن تیمیہ، ابن سیرین اور امام نودی وغیرہ کہتے ہیں کہ علیؑ کے فیصلوں کو اس وقت تک تسلیم نہیں کیا جاتا تھا جب تک عبداللہ ابن مسعود سے تصدیق نہ کرائی جاتی۔۔۔جبکہ عبداللہ ابن مسعود خود علی کے تلامذہ میں تھے۔

بہر حال فقہی مسائل کسی نہ کسی طرح حل تو کر لیے جاتے تھے مگر یہ مجبوریاں ارباب اقتدار کو زیادہ دن گوارا نہ ہو سکیں، حالانکہ حضرت ابوبکر زہد و تقوی میں منفرد اور علم دین میں مجتہد تھے اور حضرت عمر کی فقہی حیثیت بھی ان سے کم نہ تھی اور صرف انھیں دو پر موقوف نہیں، آگے چل کر معاویہ بن ابی سفیان بھی خداداد صلاحیت کے سبب اسی درجے پر فائز ہوئے۔ صاحبان حکومت اول دن سے کوئی سچائی برداشت کرنے کو تیار نہ تھے اسی لئے کہہ دیا تھا کہ قرآن ہمارے لئے کافی ہے۔

حضورؐ نے فرمایا تھا، ''میں تم میں دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں خدا کی کتاب اور اپنے اہل بیت،،

ایک راوی نے کہا: خدا کی کتاب تو کہا تھا مگر اپنے اہل بیت میں نے نہیں سنا تھا، میرے

خیال میں اپنی عترت یا اپنی سنت کہا تھا۔ دوسرا بولا اپنی عترت تو نہیں کہا تھا بلکہ کہا تھا،، خدا کی کتاب اور اپنی سنت۔،،

اور اس کے بعد '' خدا کی کتاب اور اپنی سنت،، مستند ہو گیا اور قرآن کی تفسیر سنت رسولؐ کی روشنی میں کی جاتی رہی۔ اس میں پہلے تو فقہاء کا سہارا لیا گیا پھر اموی دور میں احادیث سازی کر کے سنت رسولؐ سے قرآن کے معنی سمجھے جانے لگے۔ لائحہ عمل یہ بنایا گیا کہ جہاں کسی آیت کو سمجھنے کے لئے کوئی حدیث نہ ملے وہاں ذہین اور طباع راوی مددگار ثابت ہوں۔

عرب کے یہودی پہلے بھی اہل زبان تھے اور اس کے بعد بھی عربی کے ماہر لسانیات ثابت ہوئے ــــ۔ حضرت ابو ہریرہ بنی ہاشم کے سے فصیح نہ سہی مگر عربی کے مزاج داں ضرور تھے۔ یقین سے تو کہا نہیں جا سکتا کہ حدیث سازی میں انہوں نے کیا کارہائے نمایاں انجام دیئے مگر شبہ ضرور ہوتا ہے اور اتنا تو پورے اعتماد سے کہا جا سکتا ہے کہ ان کی شہرت سے دوسروں نے فائدہ اٹھایا اور فنکاری کے ذریعہ حصول معاش میں ابو ہریرہ کے ساتھ دوسرے اکابر اسلام اور وابستگان اہل بیت کے ناموں کا استعمال کیا گیا اور دینی خزانوں کو کثرت احادیث سے مالا مال کر دیا گیا ــــ۔ جس کی تصدیق میں بعض محدثین اور مورخوں کے مستند اقوال پیش کئے جا چکے ہیں۔

یوں تو پیغمبر اسلام کی یہ شہرہ آفاق حدیث کئی طرح سے پائی جاتی ہے مگر دو صورتیں دو حلقوں میں مستند قرار دی جاتی ہیں۔

'' میں تم میں دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں، کتاب خدا اور اپنے اہل بیت،،

'' میں تم میں دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں، کتاب خدا اور اپنی سنت[1]،،

کتاب خدا کے ساتھ اہل بیت کو شامل کر کے خانوادہ رسالت کے حلقے نے اسلام کو سمجھا، اصحاب رسولؐ کا دوسرا حلقہ کتاب خدا کی تفسیر سنت رسول سے کرتا رہا اور خلافت شام میں کتاب خدا کو کافی قرار دینے کی سند کے لئے کئی کئی حدیثیں ملنے لگیں تو خلافت کو اپنا حق سمجھنے والے نے '' اپنی سنت،، کی رعایت سے دار الفتاویٰ دمشق پر ایک نام کندہ کرایا: '' اہل السنّت والجماعت،، مگر بنی امیہ نے اس کو پسند نہیں کیا اور یہ نام رواج نہ پا سکا۔

کوئی ایک سو پینتیس سال بعد عباسیوں کے مامون اعظم نے اسلامیان شام کے کسریٰ کا خواب پورا کیا۔ ہارون رشید نے اہل بیت کے '' منصوص من اللہ سلسلہ امامت،، کے مقابلے پر حکومت ساز امامت کی بنیاد رکھی اور ابو حنیفہ کو پہلا امام اعظم بنایا، مامون نے ابو حنیفہ کے فتوات

کو ان کے شاگرد امام ابو یوسف سے سرتب کرایا، اور ایک جماعت بنا کر شعیان علی کا مدمقابل قرار دیا۔ اس کا نام اہل السنّت والجماعت رکھا اور امام ابوحنیفہ کے فتاوے کو اس کی فقہ قرار دیا۔

یہ بات ہے ائمہ اثنا عشر کے سلسلہ امامت کے ادھیار (آدھے راستے) کی یعنی رحلت پیغمبرؑ کے کوئی پونے دوسو برس بعد کی جس کے بعد احادیث کا منطقی تصرف زور پکڑ گیا اور مسالک فقہ بننا شروع ہوئے تو بنتے ہی چلے گئے۔ بنیادی طور پر خدا کی کتاب کے ساتھ دو جز دتھے" اپنے اہل بیت یا اپنی سنت،، دوسرے الفاظ میں" امامت یا خلافت،، بعدہ شیعان علیؑ اور شیعان معاویہ۔ دوسرے صدی ہجری کے آخر میں ان کے نام شیعان علی اور اہل السنّت والجماعت ہو گئے جو آج تک چلے آرہے ہیں مگر ان کے مابین کچھ زیادہ اختلاف نہیں تھے اور جو باتیں مختلف فیہ تھیں انھیں ملت مسلمہ کے اتحاد کی خاطر زیر بحث لایا نہ جاتا۔ ہر ایک کا عقیدہ اس کے ساتھ رہتا۔ مثال کے لئے علامہ عبدالحق محدث دہلوی کی مدارج النبوہ کو پیش کیا جاسکتا ہے جس میں خلافت سقیفہ اور خانوادہ رسالت دونوں کا احترام پایا جاتا ہے لیکن جس وقت سے ابوسفیان بن حرب معاویہ بن ابی سفیان اور یزید بن معاویہ کی حمایت میں ان افراد کو کھلے عام مطعون کیا جانے لگا جن کو لے کر آنحضرتؐ نصارائے نجران سے مباہلے کے لئے گئے تھے اس وقت سے نظریاتی تصادم ایک اختلافی خلیج کی شکل اختیار کر گیا۔ انصاف طلب ہے یہ حقیقت کہ جو لوگ آیہ تطہیر کے مصداق ہیں ان کے سامنے ایسے افراد لائے جائیں جن کا ایمان آج بھی ثبوت کا محتاج ہے۔ وضعی احادیث کے بل پر نفاق کو یقین کا درجہ دینا کبھی مسلّم نہیں ہوسکتا۔

یہ بھی سوچا نہیں جاتا کہ ہادیِ برحق ایک بات کو اثبات ونفی دونوں میں کیونکر کہہ سکتے تھے ۔۔۔ جس کسی نے ایسا مواد یکجا کر کے تفرقہ ڈالا ہے اس کو سچا مسلمان کس طرح تسلیم کیا جاسکتا ہے ۔۔۔ اگر تمام فرقے اس کو تسلیم کرلیں تو باصفا متقدمین اور ان میں کوئی فرق ہی نہ رہ جائے گا اور نفاق و یقین کا امتیاز ختم ہو جائے گا۔

جذبہ اسلام کا فطری تقاضا اس کی اجازت نہیں دیتا اور موجودہ حالات میں جب ہر فرقہ اپنی منتخب حدیثوں کے بل پر پوری استقامت کے ساتھ دوسرے کو، دوسرا تیسرے کو، اور تیسرا چوتھے کو صراط مستقیم سے ہٹا ہوا قرار دیتا ہے اور کفر سازی نے تلقین ایمان کی جگہ لے لی ہے تو دردِ اسلامی کا تقاضا بس اتنا ہی ہے کہ ایک دوسرے سے تعرض نہ کرے ورنہ پیغمبران الٰہی کی بعثت کا مقصد فوت ہو جائے گا ایسے فیصلے کبھی تیغ وسنان سے طے نہیں ہوتے۔ افکار صالحہ کی بساط پر انسانی خون کی

ارزانی ماضی میں بھی نتیجہ خیز نہیں ہوئی تو اب کیا ہوگی۔ وقتی طور پر تو یہ ہوسکتا ہے کہ کوئی شہ زور کسی کمزور کو کمزور تر بنا دے لیکن ناپید نہیں کر سکتا۔

اسلام کے لئے یہ کوئی اچھا شگون بھی نہ ہوگا کہ مختلف راہوں سے ایک منزل کی طرف جاتے ہوئے کاروانوں میں سے کسی ایک کارواں کو ختم کر دیا جائے کیونکہ اگر ایسا ہوا تو کوئی دوسرا کارواں اس کی جگہ لے لے گا اور پھر تیسرا اسکے بعد یہ بھی تو نہیں کہا جاسکتا کہ راستہ کس کا صحیح ہے جبکہ صراط مستقیم پر کسی ایک کا راستہ ہی ممکن ہے۔ ہوسکتا ہے کہ جس کو ختم کرنے کی فکر ہے، راستہ اسی کا صحیح ہو، یا پھر جو اس کی جگہ لے وہ راہ راست پر ہو۔ ابھی وقت ہے کہ مسلک انسانیت کو جادۂ حیوانیت پر پڑنے نہ دیا جائے ورنہ بحالت موجودہ تو یورپ کے مورخین یہی کہتے ہیں کہ اسلام کو تلوار کے زور سے پھیلایا گیا، کل یہ بھی کہیں گے کہ پیغمبر عرب نے اپنے پیروؤں کو انسان کی طرح رہنے کے بجائے درندوں کی زندگی بسر کرنے کی تعلیم دی تھی جو ایک دوسرے کا شکار کرتے رہے اور رسولؐ کی اس حدیث کا اطلاق بھی ہوگا کہ:۔

''میرے بعد کفر کی طرف پھر نہ جانا کہ آپس میں ایک دوسرے کی گردنیں اڑانے لگو (بخاری جلد سوم ۱۱۱۳، حدیث ۱۹۵۶ء مطبوعہ فرید بک اسٹال لاہور)

چند احادیث اس سلسلے میں گوش گزار کی جاتی ہیں:۔

''جب کوئی اپنے مسلمان بھائی کو کافر کہے تو ان میں سے ایک کافر ضرور ہوگا۔،، (باب ۲۶۹ حدیث ۱۰۳۶)

''جو کسی مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اس کا بدلہ جہنم ہے کہ مدتوں اس میں رہے اور اللہ نے اس پر غضب کیا اور لعنت کی اور اس کے لئے تیار رکھا ہے بڑا عذاب،،۔ (پارہ ۹۲،۴)

ان احادیث کے ذیل میں مترجم بخاری مولانا اختر علی خان شاہجہاں پوری کا نوٹ تمام ذی فہم مسلمانوں کی رہبری کے لئے کافی ہے آپ لکھتے ہیں:۔

''جو بات بات پر سچے اور راسخ العقیدہ مسلمانوں کو کافر و مشرک کہتے ہوئے نہیں تھکتے اگر ان کے زاویہ نظر کو درست مان لیا جائے تو چودہ صدیوں کے کسی ایک فرد کو بھی مسلمان ثابت نہ کیا جاسکے گا۔ خدا نے تو اپنے محبوب کی امت کو سب امتوں کا سردار بنایا ہے۔ لیکن یہ حضرات اسے امت ملعونہ باور کرانے پر تلے ہوئے ہیں۔،،

فاضل مترجم کا اشارہ، ممکن ہے کسی کمزور فرقے کی طرف ہو لیکن اس کا اطلاق فی زمانہ

ان افراد پر ہوتا ہے جو اپنے مسلک کے علاوہ، دوسرے تمام فرقوں کو منحرف اسلام قرار دیتے ہیں اور اب تلوار کے بجائے کلاشنکوف کا استعمال کر رہے ہیں اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس طرح وہ ہادی برحق کی تعلیمات کو لا حاصل ثابت کر رہے ہیں۔ نتیجہ ظاہر ہے۔

اس طرح انسان ساز خلافت کے ماننے والوں میں جتنے گروہ وجود میں آئے ہیں اُن میں انتہا پسند آخری گروہ کو خلافت شام کا نمائندہ کہا جا سکتا ہے۔ بات صرف کہنے کی نہیں ہے۔ قطعی جائزے کے لئے خلافت کوفہ کے خلاف، خلافت شام کے رزم و بزم کے پورے دائرہ حرب پر اس گروہ کی بساط عمل کو منطبق کر کے دیکھا جا سکتا ہے اس کے نظریات کو چھپایا نہ جائے تو بنی ہاشم پر بنی اُمیہ کی فضیلت اس کا طرہ امتیاز قرار پائے گی، خصوصاً اہل بیت پیغمبر پر سم قاتل، برش شمشیر اور وضع احادیث کے حربوں کی تقلید نظر آئے گی۔ اہل بیت کی جگہ ان کے ماننے والوں نے لے لی ہے تو تقاضائے وقت کے مطابق سم قاتل اور تلوار کے بجائے کلاشنکوف اور بموں کا استعمال کیا جا رہا ہے اور جھوٹی حدیثیں بنانے کا امکان نہیں ہے تو کھلے ہوئے تبرے کی جگہ کردار کشی کے نئے انداز اور قلمی کتابوں کی مبینہ روایات دکھائی دیتی ہیں جو چھپے ہوئے اس ایمان کی ترجمان ہیں جس کی روح ابوسفیان کے کردار اور معاویہ بن ابی سفیان کی سیرت کا معجون مرکب ہے اور جس کے پس منظر میں یزید بن معاویہ کی آواز سنائی دیتی ہے۔ پیغمبری بنی ہاشم کا ایک کھیل تھی، نہ کوئی وحی آئی اور نہ کوئی فرشتہ اترا!

ثقہ اہل السنت والجماعت اگرچہ اس عقیدے کو بدعت سمجھتے ہیں تاہم اس کی صفائی بھی دینے کی کوشش کرتے ہیں لیکن جن کا یہ عقیدہ ہے انھیں انکار نہیں۔۔۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ حنفی مسلمان اس فرقے کی حمایت کیوں کرتے ہیں جبکہ ہادی اسلام نے اس کی پیشین گوئی کی تھی اور مترجم صحیح بخاری نے اس کی صراحت بھی کر دی ہے کہ آنحضرت کا ارشاد نجد کی وہابیت کی طرف ہے۔ (۵۹)

حضرت معاویہ کے دور کو گزرے ہوئے تقریباً ساڑے نو سو برس ہو چکے تھے جب محمد بن عبدالوہاب نے اپنا فقہی نظریہ پیش کیا اور درعیہ کے شیخ سے رشتہ قائم کر کے اس کی اشاعت شروع کی۔۔۔ جو ایک تاریخی بیان ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس نظریے کے بنیادی اصول عبدالوہاب کے اسلاف کو دمشق سے ملے تھے جب وہ جنگ صفین کے بعد نہروان میں جمع ہوئے تھے پھر ان نظریات میں پختگی آتی رہی اور وقتی طور پر اپنائے ہوئے علی دشمنی کے خیالات دو چار نسلوں کے بعد

عقیدہ بن گئے اور چند حدیثوں کا سہارا پا کر داخل ایمان ہو گئے۔

مسلمانوں کے خلاف انگلستان کی سیاسی پالیسی کے تحت اور عرب میں ترکی اقتدار ختم کرنے کی خاطر انگریزوں نے درعیہ کے شیخ کی سرپرستی کی تھی اور بصرہ کے معروف عالم محمد بن عبدالوہاب کو نجد لا کر ترکی کے خلاف ایک محاذ بنایا تھا جو کامیاب ہوا اور وہابیت نے آہستہ آہستہ نجد کے بعض صحرائی قبائل میں قدم جما لیے پھر مذہبی ہتھیار بن کر ترکی کے مقابل صف آرا ہو گئے۔ اسطرح مسلمانوں میں ایک ایسے فرقے کا اضافہ ہو گیا جو پچھلے تمام فرقوں سے مختلف تھا اور جس کے وجود سے اسلام پر ایک ایسی ضرب کاری لگی کہ توحید، نبوت اور عقائد سب میں ایک طوفان آ گیا ۔۔۔ پھر یہ طوفان آگے بڑھتا ہی رہا۔۔۔ جس کی بنیاد اہل بیت رسولؑ کے عناد اور شیعان علی کی دشمنی پر رکھی ہوئی ہے۔

یہ کرامت بھی کثرت احادیث کی ہے۔ اگر حدیثوں میں اتنے ہی اضافہ پر اکتفاء کی جاتی جو شروع میں کسی مقصد کے لئے کیا گیا تھا تو اس کا نتیجہ اچھا یا برا جو بھی ہوا تھا، اس کو مسلمانوں نے جانے انجانے میں برداشت کر لیا تھا۔ تفرقہ پڑا تھا اور یقیناً بہت پڑا تھا مگر رسولؐ کے شاگرد رشید نے منصب امامت پر صبر و تحمل سے اسے برداشت کر لیا تھا اور حقدار کو اس کا حق مل گیا تھا۔ اسلام میں جو دراڑیں پڑی تھیں وہ بتدریج کم ہو جاتیں اور دین عرب اپنی ڈگر پر آ جاتا بشرطیکہ بنی امیہ کا مایہ ناز سپوت راستے کی دیوار بن کر حائل نہ ہو جاتا مگر بدنصیبی سے ایسا نہیں ہوا پھر بھی اس سے مسلک امامیہ کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچا لیکن جمعیت مسلمین ٹکڑیوں میں بٹ گئی اور اتحاد کے امکانات موقوف ہو گئے۔ خانوادہ رسالت کے دیوانوں نے اسلام کو جس طرح سمجھا تھا وہ آج بھی اس پر قائم ہیں اور آئندہ بھی قائم رہیں گے۔ تعداد کم ہو یا زیادہ ہو۔۔۔ مگر اہل السنت والجماعت کو مزید خطرات لاحق ہیں اور ایک وقت وہ بھی آ سکتا ہے کہ اپنے کو سواد اعظم کہنے والا ہر گروہ علیحدہ گنتی میں جماعت قلیل بن جائے۔

فرقہ امامیہ کا تاریخی فیصلہ

رحلت رسولؐ کے بعد خلافت سقیفہ بلاشبہ ایک جیتی جاگتی تاریخی حقیقت تھی لیکن یہ خلافت نہ جمہوری تھی، نہ شورائی پھر بھی اس نے جانشینی کا منصب سنبھال لیا۔ جمہوری اس لئے نہیں کہ جمہوریت کا موجودہ نظام اس وقت تک فہم انسانی میں نہیں آیا تھا، شورائی اس لئے نہیں کہ تمام

خاندانوں کی نمائندہ مجلس شوری بنائی نہیں گئی تھی جو رئیس مدینہ کا انتخاب کرتی اور ایسا کر بھی لیا جاتا تو اسلام صرف مدینۃ الرسولؐ تک محدود تو نہ تھا، اس کا دائرہ پورے ریگزار عرب میں پھیل چکا تھا اور تقریباً تمام قبائل دینِ محمدؐ کے پرچم سے وابستہ ہو گئے تھے لہذا مملکت اسلامیہ کے سربراہ کو منتخب کرنے کے لئے ہر قبیلے کو نمائندگی ملنا چاہیئے تھی اور تمام قبائل کے نمائندے مل کر اپنے قائد یا خلیفہ کا انتخاب کرتے تب ہی اس کو جمعیت مسلمین کا متفقہ رہنما کہا جا سکتا تھا۔

لیکن اس التزام کے لئے کافی وقت درکار تھا اور مقامی لوگوں کو بہت جلدی تھی اس لئے پیغمبرؐ عرب کی حالت غیر ہوتے ہی تھوڑے سے لوگوں کو اطلاع کر دی گئی۔ شبہ حضرت ابو بکرؓ پر کیا جاتا ہے کہ حضورؐ کی تاکید کے باوجود اسامہ کے لشکر کے ساتھ نہیں گئے اور اپنے مضافاتی مکان پر جانے کے بہانے کچھ لوگوں کو سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہو جانے کی اطلاع دینے گئے اور واپس ہوئے تو آنحضرتؐ سفر آخرت کر چکے تھے۔ حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ اور دوسرے لوگوں کو لے کر سقیفہ کی طرف روانہ ہو گئے اور حضرت علیؑ اپنے مرشد برحق کی تجہیز و تکفین کے لئے رہ گئے۔

سقیفہ کے اجتماع کا انتظام جس کسی نے کیا ہو لیکن آدمی سو سے کم بتائے جاتے ہیں جن میں سے تین چار انصار اور تمام مہاجروں نے حضرت ابو بکر کی بیعت کی۔ چند بنی ہاشم اطلاع پا کر پہنچ گئے تھے انہوں نے، اور سعد بن عبادہ اور ان کے ساتھیوں نے بیعت نہیں کی بلکہ دھینگا مشتی میں سعد مرتے مرتے بچے اور زبیر بن العوام کو ہاتھا پائی میں بعض مہاجر پکڑ کر اٹھا لے گئے۔

الزام تراشی میں مہاجر و انصار ایک دوسرے کو ذمہ دار قرار دیتے ہیں لیکن پلڑا حضرت ابو بکرؓ کا بھاری تھا اور ان کی بیعت کرنے والوں میں دو چار کے علاوہ سب مہاجر تھے جن میں بنی ہاشم میں سے کوئی نہیں تھا۔ اہالیان مدینہ کی اکثریت اس انتخاب سے بے خبر تھی۔ ان لوگوں سے ایک ایک دو دو کر کے مسجد نبوی میں طلب کر کے بخوشی یا بجبر بیعت لی گئی جہاں خالد بن ولید کے لائے ہوئے ساڑھے تین ہزار سوار ٹھہرائے گئے تھے۔ بعد کے واقعات تاریخ اسلام کا المیہ ہیں جن کی تصدیق مورخین کی ایک تعداد کرتی ہے دوسری طرف بعض تاریخی حوالے اس کی تردید میں بھی دیئے جاتے ہیں۔

محتاج فکر ہے یہ خیال کہ اگر حضرت ابو بکر نے یہ التزام نہیں کرایا تھا تو سقیفہ میں ان کی اکثریت کیوں تھی انصار اتنے کم کیوں تھے کہ سعد بن عبادہ رئیس انصار کو بچانا ان کے لئے مشکل ہو گیا اور جہاں تک سعد کے مخالف قبیلے کا تعلق ہے اس کے صرف تین چار آدمی موجود تھے جو حضرت عمر

کے ذاتی دوست تھے، باقی موافق اور مخالف انصار معاویہ کے عہد تک قیس بن سعد کے ہم نوار ہے یہی طاقت تھی جس کے بل پر قیس نے معاویہ کی پرواہ نہیں کی۔

پھر رسولؐ برحق کی اکلوتی بیٹی کے ساتھ جو مظالم کئے گئے وہ بہر طور نا قابل بیان ہیں۔ مورخین کے متواتر لکھنے کے باوجود ان سے انکار کیا جاتا ہے لیکن جس سلوک کا اعتراف کیا جاتا ہے اس کی بھی توقع امت مسلمہ سے کسی طرح کی نہ جاسکتی پھر بھی ہوا کچھ ایسا کہ بنت رسولؐ چھ ماہ کے اندر اپنے پدر عظیم سے، بعض صحابہ کا شکوئی کرتے کرتے، صرف انیس سال کی عمر میں خالق حقیقی سے جاملی۔

صحیح مسلم اور صحیح بخاری کی رو سے حضرت عائشہ کی مبینہ بعض روایات شہادت دیتی ہیں کہ سیدہ کونین نے مرتے دم تک بعض صحابہ سے بات نہیں کی اور بعض دوسری روایات کے رو سے معصومہ نے وصیت کی تھی کہ فلاں اور فلاں ان کے جنازے میں شریک نہ ہوں جن میں حضرت ابوبکر اور ام المومنین عائشہ سرفہرست تھیں اس لئے حضرت علیؑ نے نہایت خاموشی کے ساتھ شب کی تاریکی میں انھیں جنت البقیع میں لے جاکر دفن کیا تھا۔ تدفین میں صرف تھوڑے سے بنی ہاشم اور سلمان، مقداد اور ابوذر وغیرہ شامل تھے۔۔۔ کیا اس سے بھی انکار کیا جاسکتا ہے؟

کہا جاتا ہے کہ حضرت علیؑ نے فاطمہ زہرا کے انتقال کے چھ ماہ بعد بیعت کر لی تھی۔ یہ بہت سی، دوسری باتوں کی طرح کہانی ہے۔۔۔ حقیقت یہ ہے کہ صرف علیؑ ہی نے نہیں بلکہ کسی بنی ہاشم اور اصحاب کی بڑی تعداد نے کبھی بیعت نہیں کی۔ ان میں سے کوئی انسان کی بنائی ہوئی خلافت کو صحیح سمجھتا ہی نہیں تھا۔ ان کے نزدیک تو ختمی مرتبت کے بعد نبوت کی جگہ منصوص من اللہ امامت نے لے لی تھی اور علیؑ ابن ابی طالب پہلے امام تھے۔۔۔ نبوت کی طرح امامت کے لئے بھی ان کا عقیدہ تھا اور ہے کہ:۔

''کسی رسول کی شریعت کا نفاذ جس طرح بعد میں آنے والا نبی کرتا ہے۔ اسی طرح نبوت ختم ہونے کے بعد اس کی جگہ امامت مشیت الہیٰ میں خلق ہوئی ہے اور اس کا سلسلہ بارہ اماموں تک جاتا ہے جس کے آخری امام حضرت مہدی الزمان ہیں۔''

اس کے بعد یہ کہنا کہ علیؑ نے وفات فاطمہ زہرا کے بعد بیعت کر لی تھی کس قدر مضحکہ خیز ہے اللہ کی طرف سے مامور کئے ہوئے امام نے چند انسانوں کے ساختہ پرداختہ خلیفہ کی بیعت کر لی تھی۔ مسلمات میں ہے یہ حقیقت کہ چند ماہ قبل غدیر خم میں تکمیل دین کے ساتھ جب پیغمبر ختمی مرتبت

نے علیؑ کو اپنا جیسا مولیٰ قرار دیا تھا تو تمام صحابہ نے اس شرف پر علی کو ہدیہ تہنیت پیش کیا تھا۔ حضرت عمر کے الفاظ تاریخ نے محفوظ کر لئے ہیں۔ ’’بہت بہت مبارک ہو یا علیؑ! آج سے آپ میرے بھی مولیٰ ہو گئے!،،

مولیٰ کے معنی کی تاویل میں نہ جانے کیا کیا کہہ دیا جاتا ہے لیکن جو کچھ بھی کہا جائے، شرف خود رسول اسلام کا تھا جو انہوں نے علیؑ کو بھی دیدیا تھا اور یقیناً شرف ایسا ہی ہوگا جو مبارکباد کے لائق تھا تب ہی تو حضرت عمر نے دیگر اصحاب سے آگے بڑھ کر تبریک میں افضلیت حاصل کی تھی۔ اب اگر دو یا تین ماہ قبل کے مولیٰ کے بارے میں کہا جائے کہ اس نے مولیٰ کہنے والوں میں سے کسی کی بیعت کر لی تھی تو کیا بات یقین کے قابل ہوگی؟ جبکہ غدیر خم کا مولیٰ بعد پیغمبرؐ برحق نفاذ اسلام کے لئے نمائندہ ایزدی بھی تھا اور اسی حیثیت نے اس کے ہاتھ باندھ دیئے تھے کہ اس نے دنیاوی حقوق غصب کرنے والوں پر تلوار نہیں اٹھائی۔۔۔ اس حقیقت کو وہ لوگ کیا سمجھ سکیں گے جنہیں اسلام اور رسولؐ اسلام کا مکمل عرفان نہ تھا۔ انہوں نے تو صرف اتنا دیکھا تھا کہ وہ صفا کی چوٹی پر کھڑے ہو کر نعرہ توحید بلند کرنے والا عرب کی مملکت اسلامیہ کا مالک بن گیا تھا جس کے سفر آخرت کر جانے کے بعد انتظام مملکت کو ہاتھ میں لے لینا گروہ بندی سے ہی ممکن تھا، جو ہو گئی اور خلافت کے نام سے حکومت پر قبضہ کر لیا گیا۔

یہ حکومت پیغمبر عرب کی بنائی ہوئی تھی اور پیغمبری خدا کا عطیہ تھی جس کو لے کر محمد بن عبداللہ پیدا ہوئے تھے۔ اب پیغمبری کے بجائے امامت خالق کی طرف سے علی ابن ابی طالب کو دی گئی تھی جس کو کوئی زور بازو سے حاصل نہ کر سکتا تھا۔ علی کو حکومت کے بجائے پیغمبری کا تحفظ کرنا تھا لہذا علی نے پہلے دن سے دین اسلام کو بچانا اپنا نصب العین قرار دیا۔ ان کی تلوار جب بھی نیام سے باہر نکلی تھی تو کفر کی یلغار سے دین کو محفوظ رکھنے کی خاطر، تسخیر ملک کے لئے کسی مادی دشمن کے سر پر نہیں چمکی تھی۔ تشکیل خلافت اسلام کے نام پر اس حصہ ارض کے لئے ہوئی تھی جس کو پیغمبر عرب نے اپنے دین کی ترویج کے لئے حاصل کیا تھا اور علیؑ کا منصب الٰہیہ دین کا نفاذ عالم ممکنات کے لئے تھا کسی مخصوص علاقے کیلئے نہ تھا۔ اصول اسلام میں اگر کچھ بدعتیں شامل ہو رہی تھیں تو ان کی صحت علی کی ذمہ داری تھی مگر ایسا تو نہیں تھا کہ کفر اسلام پر غالب آ گیا تھا۔ یہ صورت جب پیدا ہوئی تو دنیا نے ذوالفقار حیدری کی آب و تاب کو صفین میں دیکھ لیا۔

کوئی کہتا ہے کہ مسلمان ان کے ساتھ نہیں تھے۔ اول تو یہ سرتاسر غلط ہے اور صحیح بھی ہو تو

سوال کیا جاسکتا ہے کہ کیوں نہیں تھے؟ کیا صرف اس لئے کہ وہ عمر میں کم تھے۔۔۔ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کو تسلیم کرنے والے جانتے ہیں کہ سفارت الٰہیہ ازل میں ودیعت کی گئی تھی۔ خدا کا سفیر جب پیدا ہوتا ہے تو سفیر ہوتا ہے۔ وہ اکیلا ہوتا ہے۔ حق پسند اس کے ساتھ آ جاتے ہیں۔ روح اللہ نے گہوارے میں کہا تھا۔ ''میں خدا کا بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب عطا کی ہے۔،، تو کیا مسلمان اس کو جھٹلا سکتے ہیں کہ چار دن کا بچہ نمائندہ ایزدی ہونے کا دعویٰ کیوں کرتا ہے؟ تھوڑے دن پہلے جب حضورؐ نے سورہ برات کی تلاوت کے لئے حضرت ابوبکر کو بھیجا تھا پھر واپس بلا لیا تھا اور علیؑ نے ان کے بجائے اس کار رسالت کو انجام دیا تھا تب کیوں نہیں کہا گیا کہ وہ عمر میں اتنے چھوٹے ہیں؟ سوال کیسے کیا جاتا؟ آنحضرت نے تو خود فرما دیا تھا کہ امر الٰہی یہ ہے کہ میں خود اس کام کو انجام دوں یا وہ کرے جو میرے اہل میں سے ہو۔ بات بالکل واضح ہے کہ علیؑ کے علاوہ کوئی اہل نہیں تھا وہ حضرت ابوبکرؓ ہوتے یا حضرت عمرؓ!

اس کے بعد سن و سال کی توجیہہ لایعنی ہے۔۔۔کوئی حیلہ حوالہ کوئی تاویل بھی بے ضرورت ہے کیونکہ عطیہ خداوندی علیؑ کے لئے مقدر تھا وہ انھیں مل گیا۔ رسولؐ نے دنیا میں جو حاصل کیا تھا، امت نے اس پر قبضہ کر لیا تو مادی شے کے لئے ذوالفقار کا استعمال بے محل تھا لہذا علیؑ نے خاموشی اختیار کر لی کہ اہل دنیا، دنیا کے طلبگار ہیں انھیں صراط مستقیم پر اپنے حوصلوں کی آزمائش کرنے کا موقع دیدیا جائے۔

لیکن جب جادہ اسلام پر بدعتوں کے بجائے شرک و کفر کے شگوفے کھلنے لگے تو پیغمبرؐ اسلام کے جانشین ازلی نے حفاظت اسلام کے لئے خدا کی دی ہوئی تلوار کو بے نیام کر لیا اور صفین کی لیلۃ الحریر پر صبح مکہ کی تابانی ثبت کر دی۔

مسلمانوں کا ایک گروہ یہ بھی کہتا ہے کہ مسلمانوں میں علیؑ کو قبول عام حاصل نہیں تھا لہذا اپنے کو کمزور پا کر شکست کے خوف سے مقابلے پر نہیں آئے ایک لحظے کے لئے بھی بدر، احد، خندق، خیبر، حنین اور وادی الرمل پر نظر نہیں ڈالتے۔۔۔کتنی ڈھٹائی سے کاغذ کے شیروں کو اسد اللہ الغالب کے سامنے رکھ دیتے ہیں مگر واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے سے بھی بات نہیں بنتی۔۔۔کھلا چیلنج ہے ہر ایک کے لئے جو تاریخی طور پر ثابت کر دے کہ کسی غزوے میں کسی نے بھی علیؑ کے مقابلے میں شجاعت و سرفروشی کی کوئی نظیر پیش کی ہو۔

دعائیں دینا چاہیے خلیفہ شام کو کہ انہوں نے احادیث کے جنگل میں کاغذ کے شیروں کو

جسمانیات کے شیروں کے متوازن بنا دیا ہے۔اس لئے بحث وتمحیث سے قطع نظر کر کے ایک قطعی نتیجہ اخذ کرنا فیصلہ کن ہوگا کہ وفات رسول کے بعد امت مسلمہ خلافت وامامت کے دو دھڑوں میں بٹ گئی۔کون بہادر تھا اور کون بزدل،حق کس کا تھا کس نے لے لیا؟ یہ سوالات کبھی ختم نہیں ہو سکتے۔ اتنا کہا جا سکتا ہے کہ آنحضرتؐ نے حضرت علی کے لئے فرمایا تھا کہ ''آدم کو ان کے علم میں،نوح کو تقویٰ میں،ابراہیم کو خلت میں،موسیٰ کو ہیبت میں اور عیسیٰ کو زہد میں دیکھنا ہو تو میرے بھائی علی ابن ابی طالب کو دیکھ لو۔،،کسی نے یہ سب کچھ دیکھا ہو یا نہ دیکھا ہو مگر دنیا نے علی کو بعد مصطفیٰ عیسیٰ کی سیرت میں ضرور دیکھا۔یقین نہیں آتا تو دیکھ لے کہ غزوات اسلام کا ضیغم یزدانی سجادہ امامت پر منصب الہیہ کی پابندیوں میں جکڑ کر کتنا بدل گیا تھا کہ گلے میں رسی بندھوا کر برسوں پہلے اپنے پوتے زین العابدین کی نظیر پیش کر رہا تھا اور اطاعت امام کی بساط پر کھڑے ہوئے اصحاب رسول رگوں میں دوڑتے ہوئے خون کی گرمی کو صبر وضبط کی تھپکیوں سے دبائے ہوئے تھے۔۔۔سیدہ عالمیان کی آواز بلند ہو رہی تھی۔''چھوڑ دو ابوالحسن کو ورنہ میں زیر آسمان بال کھول کر تمہارے لئے بددعا کرتی ہوں!''

اس طرح امامت اور خلافت کے دو حلقے علیؑ کے تحمل کے سایے میں آگے بڑھتے رہے اور خلافت بنی امیہ کے وجود میں آنے کے بعد مدینے میں علیؑ کے جانشین اور مقلدین امامت،خوف و دہشت کی فضا میں مقاصد حیات پورے کرتے رہے پھر عراق وشام میں محبان علیؑ قتل گاہوں اور زندانوں کی زینت بن کر منظر عام سے ناپید ہو گئے۔

اسلام کی بساط پر اب سیاست جہانبانی بڑی مضبوطی سے اپنے پنجے گڑ و چکی تھی بچے کھچے باشعور مسلمان اسلام کشی کو محسوس کرنے لگے تھے اور کربلا میں جب سے حسین ابن علیؑ نے سوال بیعت کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا تھا اس وقت سے ایک عام خیال پیدا ہو رہا تھا کہ اگر دین کو خانوادہ رسالت کی ڈگر سے ہٹایا نہ جاتا تو اتنی پیچیدگیاں پیدا نہ ہوتیں۔خود بنی ہاشم میں سے بعض افراد کئی بار ظلم وستم سے اکتا کر رزم گاہ کی باعزت موت کو لبیک کہہ چکے تھے۔انہوں نے اکثر خوفزدہ مسلمانوں کی ہمدردیاں حاصل کر لی تھیں۔

حادثات کے مدوجزر میں کربلا کے بعد بنی ہاشم نے میدان جنگ میں شمشیر آزمائی کر کے مرنے کا فیصلہ کر لیا تھا چنانچہ علی بن عبداللہ بن عباس کے بیٹے محمد نے ۱۰۰ھ میں بمقام ابواء عمائدین بنی ہاشم کو جمع کیا جن میں عبداللہ محض بن حسن مثنیٰ،ان کے دونوں بیٹے محمد المعروف بہ نفس

ذکیہ اوران کے بھائی ابراہیم، ابوالعباس بن محمد ابن عبداللہ ابن عباس، ابوجعفر بن محمد بن عبداللہ ابن عباس اوردیگر بنی ہاشم شامل تھے۔۔۔ان سب نے عبداللہ محض بن حسن مثنیٰ کے بیٹے محمد نفس ذکیہ کو سربراہ تسلیم کر کے ایک عہد کیا تھا۔ نفس ذکیہ شجاعت وسخاوت، حدیث وفقہ، عبادت وریاضت میں منفرد تھے ان کی ہتھیلیوں پر بیضے کے برابر نشان بھی تھے، لہذا روحانیت کو بھی ان سے منسوب کیا جاتا تھا لیکن امامت منصوص من اللہ کو سب مانتے تھے لہذا جواں سال امام جعفر صادق سے رجوع کیا گیا، آپ نے سب کچھ سن کر فرمایا۔

''مہدی آل محمد کے خروج کا زمانہ ابھی بہت دور ہے،،۔ پھر آپ نے عبداللہ محض سے فرمایا۔''اگر مظالم سے تنگ آ کر خروج بالسیف کرنا ہی چاہتے ہوتو بزرگ خاندان تم ہو،،۔ یہ بات پسند نہیں کی گئی تو آپ نے ابوالعباس بن محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس سے فرمایا''مستقبل کے بادشاہ تم ہو!،، پھر آپ خاموش ہو گئے۔

نفس ذکیہ کے لئے خفیہ تحریک چلتی رہی۔ ۱۰۱ھ میں محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس شام گئے۔ محمد حنفیہ کے پوتے ابوالہاشم سے مدد حاصل کرنے کے لئے جوداعی آل محمد کہے جاتے تھے لیکن انھیں دنوں میں ابوالہاشم کا انتقال ہوگیا۔ محمد بن علی بن عبداللہ ابن عباس نے مشہور کردیا کہ ابوالہاشم انھیں اپنا خلیفہ بنا گئے ہیں اس طرح حقوق آل محمد کی تحریک نصف صدی تک چلتی رہی اور آخر عبداللہ بن عباس کے پوتے ابوالعباس، ابومسلم خراسانی اورابوسلمہ کی مدد سے بنی امیہ کے آخری بادشاہ کے مقابل آ گئے۔

نعرہ حقوق آل محمد کا تھا، لہذا کامیابی بنی عباس کو ہوتی رہی۔ انہوں نے بنی امیہ کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور سرزمین شام سے ان کی قبروں کو بھی ناپید کردیا۔ ابوالعباس الفتاح کے نام سے بنی عباس کا پہلا خلیفہ ہوا۔ اسکی جگہ ابوجعفر نے لی جو تاریخ میں منصور دوانیقی کے نام سے جانا جاتا ہے۔

ان سب کا تعلق درحقیقت خانوادہ رسالت سے تھا اور وہ اولادرسول کا نام لے کر سرپر آرائے خلافت ہوئے تھے لیکن مشکل وہی اصل حقداروں کی تھی، دین پر دنیا غالب آ گئی۔ بنی عباس نے اس سے قبل بنی ہاشم کی تمام تحریکوں میں ان کا ساتھ دیا تھا اور خود منصور نے نفس ذکیہ کی بیعت بھی کی تھی، وہ بنی ہاشم کے تمام افراد کے ذہنوں سے واقف تھا اس لئے حکومت کے پہلے دن سے اس نے ان کو کچل دینے کا تہیہ کرلیا کیونکہ اگران میں ذرا بھی دم خم باقی رہتا تو استحکام حکومت ممکن نہ تھا اوراسے کسی لحہ بھی آل رسول میں سے کسی کے اٹھ کھڑے ہونے کا خطرہ لاحق رہتا۔ علیؑ کے منصوص

من اللہ جانشین کی روحانیت کا بھی اسے علم تھا اور یہ بھی وہ جانتا تھا کہ فقہی مسائل میں امامت کا کوئی مدمقابل نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہی امام جعفر صادق علیہ السلام کے قبول عام سے بھی وہ خوف زدہ تھا لہذا اا لفتاح کے بعد مظالم کا افتتاح کرنے کے باوجود براہ راست اس نے امامؑ پر ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہیں کی بلکہ خلیفہ شام کا آزمودہ حربہ استعمال کیا اور صف عامہ کے ایک نامور فقیہہ کی خدمات حاصل کر کے انھیں دارالفتاوی کا سربراہ بنا دیا۔۔۔ ابو حنیفہؒ نے چھ ماہ امام محمد باقرؑ کی درس گاہ میں اور دو سال تک امام جعفر صادقؑ کے مدرسے میں کسب علم کیا تھا جس کا اعتراف خود انہوں نے کیا ہے مگر ایک زمانے کے بعد امام ابن تیمیہ نے اس کو ماننے سے انکار کر دیا تھا کہ وہ امام جعفر صادقؑ سے عمر میں بڑے تھے لہذا ان کے شاگرد نہیں ہو سکتے۔۔۔ وہی دلیل سن رسیدہ ہونے کی!

اس کے بعد منصور کے تیسرے جانشین ہارون رشید نے اہل بیت کے وقار کو مجروح کرنے کے لئے خلافت سقیفہ کی طرح انسان ساز امامت بھی بنا دی جو منصوص من اللہ امامت کا تمسخر کرنے کی مترادف تھی۔ یزید ابن معاویہ نے کہا تھا۔ ''نبوت بنی ہاشم کا ایک کھیل تھی، نہ کوئی وحی آئی نہ فرشتہ آیا،،۔

منصور نے زبان سے تو کچھ نہیں کہا، اپنے عمل سے اعلان کیا کہ امام ہر گروہ کے قائد، رہبر اور پیشوا کو کہتے ہیں، ہر فرقے کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنا امام خود بنا لے اس کے لئے خلافت کی طرح امر خداوندی کی پابندی نہیں ہوتی ہارون رشید نے اس خیال کو عملی جامہ پہنا دیا کہ امام اعظم بنا کر امام جعفر صادقؑ کے مدمقابل لا کھڑا کیا اس کے ساتھ ہی یہ مشہتر کرایا کہ جو امام ابو حنیفہؒ سے فتویٰ لے گا، اس کو ایک دینار انعام دیا جائے گا اور جو امام جعفر صادقؑ سے فتویٰ لے گا، وہ ایک دینار جرمانہ ادا کرے گا۔

اب اس کو جذبہ ایمان کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ علی کے دیوانے اپنی حالت زار میں بھی ایک دینار تاوان ادا کر کے امام برحق سے دینی استفسار کرتے تھے۔۔۔ یہ حربہ کسی امام کو قتل کرنے کے بجائے نظریہ امامت کو موت کے گھاٹ اتارنے کے مترادف تھا۔

اور ایک کھلا ہوا اعلان کہ رسولؐ کے جانشین کی طرح شریعت اسلامیہ کے لئے قائد، رہبر، امام بنانا خدا کا کام نہیں ہے، مسلمان خود یہ خدمت کسی لائق فقیہ سے لے سکتے ہیں۔

منصور کے بعد مہدی اور ہادی کے ادوار میں مظالم کی زیادہ شدت نہیں رہی تھی لیکن یہ کمی ہارون رشید کے عہد زرین میں پوری ہوگئی اور مسلک حنفیہ وجود میں آ گیا۔ اس زمانے میں

قاضی القضاۃ امام ابو یوسف نے اپنے استاد کی فقہ کی جڑیں مضبوط کیں ۔ مامون اعظم نے اس کی تدوین کرا کے اسکو فقہ حنفیہ سے موسوم کر دیا اور معاویہ کے مجوزہ نام پر اہل السنّت والجماعت کی تشکیل کی پھر فقہ امامیہ کو اس کا مدمقابل قرار دینے کے لئے فقہ جعفریہ کا نام دیدیا ۔۔۔ یہ ایک اندازے کے مطابق ۲۰۰ ھ کی بات ہے ۔ فقہ حنفیہ کی حد تک تو نام کو غلط نہیں کہا جا سکتا لیکن فقہ جعفریہ ایک اضافی نام تھا، جس کو مسلک علی پر ایک زہر آلود شگوفہ کھلانے کا ہم ردیف کہا جا سکتا ہے کیونکہ فقہ بعینہ وہی تھی جس کی تعلیم ختم المرسلین نے دی تھی اور جو علیؑ کے سجادہ امامت سے چلی تھی اس کو علیؑ کے ہر جانشین سے یکساں طور پر نسبت دی جا سکتی ہے ۔ بلاشبہ امام جعفر صادقؑ کو دنیا داروں کی باہمی کشمکش میں کچھ موقع مل گیا تھا اس لئے آپ نے مکتبہ مدینۃ العلم سے تبلیغ واشاعت کے کچھ کارہائے عظیم انجام دیئے تھے لہذا ان کے نام سے اس فقہ کی ممکن ہم رشتگی تھی، لیکن درحقیقت یہ فقہ، فقہ اسلام، فقہ علوی یا فقہ امامیہ ہی تھی مگر مامون نے فقہ جعفریہ اس لئے کہلوایا تھا تا کہ اس کو بھی فقہ حنفیہ کی طرح نوزائیدہ سمجھا جائے ۔۔۔ اس کے بعد یہ ہمارے علمائے عظام کے اجتہاد کی بات رہ جاتی ہے کہ اس کو فقہ جعفریہ کے نام سے پکارا جائے یا نہ پکارا جائے مگر ایک سوال پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ امام محمد باقرؑ تک اس فقہ کا کیا نام تھا؟

سلسلہ استدلال میں ایک نظیر سامنے رکھنا شاید بے محل نہ ہو کہ اسلام حضرت سرور کائنات کا مذہب تھا جو یزید بن معاویہ کے دور تک اپنی شکل وصورت بدل چکا تھا ۔ امام حسینؑ نے کربلا میں اپنے خون سے اس کے داغ دھبوں کو دور کیا اور بتا دیا دنیا کو کہ اصل اسلام کیا ہے؟ یعنی ایک طرح پر کربلا سے اس کی نشاۃ ثانیہ شروع ہوئی مگر اسلام کا نام تو نہیں بدلا ۔ پھر امام جعفر صادقؑ کی مساعی عظیم کی نسبت سے فقہ کی دائمی نسبت ''فقہ صادقہ،، تو سمجھ میں آتی ہے فقہ جعفریہ سے سوالات پر سوالات پیدا ہونے لگتے ہیں ۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ہم نے اس کی گہرائی پر غور نہ کیا ہو اور ایک سیاسی فکر کے حربے سے اپنی قدامت کو کھو نہ دیا ہو؟ پھر بھی ہمارے عقیدے میں تو پہلا بھی محمد، اوسط بھی محمد، آخر بھی محمد ہوتا ہے، نام جس کا بھی ہو، رہے گی ''فقہ محمدی،، ہی ۔

اس طرح ۲۰۰ ھ کے بعد مسلمان دو مستقل ٹکڑوں میں بٹ گئے ۔ شعیان علی اور اہل السنّت والجماعت اور اسلام کے دو سجادے بچھ گئے فقہ جعفریہ اور فقہ حنفیہ فقہ امامیہ مشیت نژاد تھی اور فقہ حنفیہ حکومت ساز اور خلافت نواز ۔

شیعوں کا عقیدہ پہلے دن سے یہ تھا اور ہے کہ رسولؐ کے بعد جس طرح نبی ہوتا تھا رسول

ماسبق کی شریعت کے نفاذ کے لئے نبوت ختم ہونے کے بعد خالق کون ومکان نے امامت کو اس کا بدل بنایا تھا، ختم المرسلین کے بعد علیؑ کو پہلا امام اور امام مہدی کو آخری امام قرار دیا تھا۔ مسلمان آخری امام، امام مہدی کو تو مانتے ہیں، پہلے کو نہیں کیونکہ آنحضرت کی وفات کے فوراً بعد انہوں نے نبوت کی جگہ پر خلافت کی تنظیم کرلی تھی جو ان کے نزدیک دنیا اور دین دونوں کے لئے تھی۔ اگر صرف دنیا کے لئے ہوتی تو شیعان علیؑ شاید اُسے تسلیم کرلیتے لیکن مسلمانوں نے بعض لوگوں کی برگزیدگی کا نعرہ لگا کر دین کو بھی خلافت کے دامن میں سمیٹ لیا تھا لہٰذا وہ اہل بیت اور ان کے پیرووں کے لئے ایک لمحے کے لئے قابل قبول ہو ہی نہیں سکتی اور پھر علیؑ اس کو کیسے مان لیتے۔ تاریخ کا یہ مذاق بھی کتنا عجیب ہے کہ علیؑ نے مان لیا تھا شیعان علی نہیں مانتے!

دعوت عام ہے اہل خرد کے لئے کہ علیؑ نے بیعت کرلی تھی تو علیؑ کے سرفروشوں نے بیعت کیوں نہیں کی؟ سلمان، ابوذر، مقداد، بلال بن رباح، جابر بن عبداللہ انصاری، حذیفہ الیمانی، ابوایوب انصاری، خالد بن سعید، خزیمہ بن ثابت، سعد بن عبادہ، سماک بن خرشہ (ابودجانہ) عبداللہ بن مسعود، ربیع بن خثیم، عمار بن یاسر، قیس بن عاصم، مالک بن نویرہ عبداللہ بن بدیل، عدی بن حاتم، سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں نام ہیں، جنہوں نے کبھی بیعت نہیں کی۔ اگر کسی نے مفاد اسلامی کے تحت تعاون کیا تو لکھ دیا گیا کہ بیعت کرلی تھی۔ اگر علی نے اور ان سب نے بیعت کرلی تھی تو ان سے دشمنی کیوں ہے؟ اور اگر علیؑ سمیت پورا خانوادہ رسالت بیعت میں آ گیا تھا تو پھر شیعان علی انھیں تسلیم کیو ں نہیں کرتے؟ آقا ان کے دوست تھے تو غلاموں کو کیا پڑی تھی کہ وہ دشمن بنتے اور ظلم پر ظلم سہتے رہتے! خدا کے لئے کوئی وجہ بتائیں تو سہی اور علیؑ اگر تبعین میں تھے تو صحاح ستہ میں ان کے خلاف حدیثیں کیوں ملتی ہیں اور امام ابن سیرین علیؑ کے فضائل میں جو حدیثیں ہیں ان کو جھوٹی کیوں بتاتے ہیں، امام نووی شیعوں کے خلاف الزام تراشی کیوں کرتے ہیں؟

کوئی بات دلائل کے ساتھ ہو تو تسلیم کی جاسکتی ہے۔ منصور دوانیقی محسن ہے فقہ حنفیہ اور اہل السنّت والجماعت کا۔ کل تک وہ بھی حلقہ بگوش امامت تھا اور امام جعفر صادق کی پیشین گوئی پر پورے یقین کے ساتھ اس نے بڑے بھائی کے ساتھ بنی امیہ کا مقابلہ کیا تھا اور یہ بنی عباس کی نسلی عداوت ہی تھی کہ امویوں کی قبروں تک کے نام ونشان تک شام وعراق سے مٹادئے تھے۔ امامت منصوص من اللہ کو خاندان بنی عباس تسلیم کرتا آیا تھا لیکن ابوالعباس کے بعد فرمانروائی کی ہوس نے ابوجعفر منصور کو ارباب سقیفہ کا قالب اختیار کرنے پر مجبور کردیا۔ اگر ایسا نہ کرتا تو حکومت ہاتھ سے نکل جاتی۔

عبداللہ بن عباس علی ابن ابی طالب کے شاگرد رشید تھے۔ ان سے لے کر اگلی دو نسلوں تک ہر ایک جن کو غاصب سمجھتا آیا تھا۔ جنگ صفین میں جس منصور کے آباؤ اجداد معاویہ بن ابی سفیان سے علیؑ کے دوش بدوش لڑے تھے ان کی تقلید اور منصور۔۔۔! بات نا قابل یقین تھی، بالخصوص جب سلطنت عباسیہ کا قیام بھی آل محمدؐ کے نام پر ہوا تھا مگر اقتدار کی ہوس میں دنیا جب دین پر غالب آ جاتی ہے تو دنیا کی تعمیر کے لئے ارکان دین کے خون کا گارا تیار کیا جاتا ہے۔ ایسا ہی کچھ معاویہ نے بھی کیا تھا اور اس سے بڑھ کر منصور نے کیا۔ ایک کو تو بنی ہاشم اور خاندان رسالت دونوں سے یکساں طور پر دشمنی تھی دوسرے کو صرف خاندان رسالت سے کیونکہ اب اگر کوئی حکومت پر اپنا حق جتا سکتا تھا تو صرف بنی فاطمہ کا کوئی فرد یا خاص کر ان کا امام لہذا اس نے امامت کی اجارہ داری ہی ختم کر دی اور ایک جماعت کو بھی شیعان علی کا دوامی حریف بنا کر کھڑا کر دیا۔

تلوار، زر و زندان، سارے حربے معاویہ بن ابی سفیان کے کل کے دشمن اور آج کے مقلد نے استعمال کر ڈالے مگر شیعان علی نے نہ خود ساختہ خلافت کو مانا تھا اور نہ حکومت ساز اور انسان کی بنائی ہوئی امامت کو تسلیم کیا۔ ان کے نزدیک تو امامت نبوت کی طرح کا ایک منصب الہیہ تھی۔ انسان کو نہ نبی بنانے کا اختیار تھا اور نہ امام البتہ اہل السنّت میں خلیفہ کی طرح امام کو بھی ایک عام لفظ قرار دے دیا گیا، یہاں تک کہ خلیفہ حجام کو اور اکھاڑے کے کنارے بیٹھے ہوئے پہلوان تک کو کہا گیا اور پھر امام ہر وہ شخص بن بیٹھا جس کو تھوڑا بہت دینی شعور تھا۔

شیعوں نے اس لفظ کی حرمت کو برقرار رکھا کیونکہ ان کا آخری امام تا قیام قیامت موجود ہے۔ امام منصوص من اللہ کے علاوہ جتنے بھی امام گزرے۔ وہ اس امامت کے ذیل میں جس کو منصور نے بنایا تھا۔ شیعہ اس قرآنی لفظ امام کا استعمال کسی غیر معصوم کے لئے جائز نہیں سمجھتے، جب کبھی کوئی ہوا تو اس تعریف سے ہٹ کر، اگر کسی کو کہا گیا تو روانی میں نائب امام کو امام کہہ دیا گیا۔ وہ بھی چودھویں صدی ہجری کے بعد عقیدت کی خود فراموشی میں ورنہ تولائے دوازدہ امام میں بساط شیعیت پر اس کی گنجائش نہیں کہ حضرت حجت کے دور امامت میں کسی کو امام تسلیم کیا جائے۔ اگر کوئی ہوگا تو اس کا شمار انسان ساز آئمہ کے ذیل میں کیا جائے گا ورنہ کوئی شیعہ تو حرمت نبوت کی طرح حرمت امامت کو پامال نہیں کر سکتا!

اہل السنّت والجماعت کے آئمہ بے شمار ہیں اور ہو سکتا ہے کہ آئندہ بھی ہوتے رہیں۔ ایسی ہی صورت مسالک فقہ کی بھی ہے لیکن قدیم مسالک کے مابین کچھ زیادہ اختلاف پایا نہیں جاتا

البتہ چار پونے چار سو قبل کے مسلک جدید سے کسی کی ہم آہنگی نہیں ۔ اس طرح اہل اسلام کے مسالک فقہ کی موٹی موٹی تقسیم اگر ہو سکتی ہے تو اس طرح کہ امامت منصوص من اللہ کے پیرو اور حکومت ساز یا خود ساختہ آئمہ کے مقلدین اور آخر الذکر میں دو حلقے اہل السنّت اور وہابیوں کے یعنی تین راستے اور ایک منزل ۔ یہ شاید بہتر کا خلاصہ ہے ۔ ان میں سے منزل بکنار کون ہوگا ؟ اس کا فیصلہ اس دنیا میں نہیں ہو سکتا ۔

اس تقسیم کی ذمہ داری غلط احادیث کے راویوں پر اور متضاد احادیث کے مصنفین پر عائد ہوتی ہے، کسی کی طرف اشارہ کئے بغیر جادہ تحقیق میں جو بھی ثابت ہوں ہر نہج و اعتبار سے اسلام دشمن قرار دیئے جائیں گے ۔

مسلمانوں کی تاریخ کے سہ راہے میں پہلی راہ کو یقیناً بنیادی حیثیت حاصل ہے لیکن اسلام کے گہرے نقش و نگار دوسرے دور میں بنائے گئے اور تیسرے دور میں ان کو اتنا مزین کر دیا گیا کہ اصلی اور نقلی رنگوں کی تمیز ہی ختم ہو گئی اور قوت فیصلہ جواب دینے لگی ۔

واضح الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ بنی عباس نے علی کی نسل کو اپنی دانست میں نیست و نابود کر دیا تھا ۔ شاید خطرہ تھا کہ ان میں سے کوئی مدعی خلافت اسی طرح میدان میں نہ آ جائے ، جس طرح وہ خود آئے تھے ۔ اس کے بعد شاید اس حقیقت کو سمجھنے میں دشواری نہ ہو کہ خود آل رسولؐ سے انھیں کیا عناد تھا ؟ مظالم کو انتہا پر پہنچانے کے اسباب، اب شاید کسی کے لئے معمہ نہ رہیں اور آئندہ یہ سوال نہ اٹھے کہ بنی امیہ اگر غیر تھے تو بنی عباس تو اپنے تھے ، انہوں نے مصائب کے پہاڑ کیوں ڈھائے ؟

ایک نکتہ غور طلب ضرور رہ جاتا ہے کہ زندوں سے تو اندیشے لاحق تھے، مردوں نے کیا بگاڑا تھا جو قبروں تک کو کھدوا ڈالا ۔ اس کی وجہ نام و نشان مٹا دینے کے سوا سمجھ میں نہیں آتی ۔ اس بات کو اگر شرعی اصول میں ڈھالتے تو خود اپنے اسلاف کے مزارات ناپید کرنا پڑتے اس لئے جن کو دشمنان ایمان قرار دیا تھا، ان کی لاشوں کا وجود بھی برداشت نہیں کیا ۔ اس کمی کو اموی نژاد اہل نجد نے پورا کر دیا ۔ حاکم شام ان کے گروہ کے خالق مجازی تھے، لہذا انہوں نے قبروں کے وجود ہی کو خلاف شرع قرار دیدیا کہ اگر ان کے اجداد کی قبریں نہیں رہیں تو وہ کسی مسلمان کے مزار کو باقی نہ رہنے دیں گے ۔

اس طرح خلیفۂ حدیث ساز کا ایک مقصد اور پورا ہو گیا جس کی زد پر رحمۃ للعالمین ؐ کا روضۂ اقدس بھی آ سکتا تھا مگر شاید مسلمانوں کا خوف غالب آ گیا !

دو اسلام: دو قرآن

بنیادی طور پر اسلام ایک تھا اور قرآن بھی ایک، خدا بھی ایک تھا اور مرسل برحق بھی ایک جو کتاب انبیاء کا حرف آخر تھا۔ پیغمبر خاتم کے مرتے دم تک ان میں سے کسی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی لیکن وفات سے پہلے ہادی برحق نے امت سے کہا تھا:

''میں تم میں دو گرانقدر چیزیں چھوڑ رہا ہوں، خدا کی کتاب اور اپنی عترت۔ ان دونوں سے متمسک رہو گے تو کبھی گمراہ نہیں ہو گے''۔۔۔ امت میں کچھ لوگوں کو ثقل سماعت تھا، انھیں عترت کے بجائے سنت سنائی دیا اور عترت و سنت کی بحث میں ایک مرد خردمند نے فیصلہ طلب لفظوں کی بحث کو ختم کر دیا اور کہہ دیا۔

''ہمیں خدا کی کتاب کافی ہے۔۔۔''

خدا کی کتاب کے لئے اُس کا علم درکار تھا جو کما حقہ کسی کو حاصل نہ تھا لہذا سنت کا سہارا لیا گیا لیکن سنت تمام دینی اور دنیاوی ضروریات کو کافی ثابت نہیں ہوئی اس لئے اس میں اضافے ناگزیر ہو گئے اور بعض احادیث کی تصنیف وقت کا تقاضا بن گئی۔ ہوسکتا ہے کہ بعض ناروا اعمال کا ارتکاب بادل ناخواستہ کیا گیا ہو کیونکہ ان پر بعض اصحاب کو وقت آخر پچھتاوا ہوا تھا۔

اس دوران بساط اسلام پر عرب کی قدامت اپنے نقوش مرتسم کر چکی تھی اور دین کی بعض اصطلاحات کا دامن اتنا کشادہ ہو گیا تھا کہ اس کے پھیلاؤ پر ملوکیت کے شبہات پیدا ہوتے تھے۔ وقت کی تدریجی ترقی کے ساتھ اس میں اضافہ ہوتا رہا اور جہاد عملی طور پر تسخیر ممالک کا انداز اختیار کر گیا۔ پھر بھی اس کو اشاعت اسلام کا نام دیا جاتا رہا لیکن اس کی کامیابی میں بقول حضرت عمر عربوں کی صحرائی جبلت کو بڑا دخل تھا، تب ہی تو یورپ کے مورخین ابوعبیدہ الجراح اور عمرو عاص کے

حملوں کو نپولین اور ہنی بال کے حملوں سے تعبیر کرتے ہیں۔ نتیجے میں پیغمبرؐ اسلام کی چھوٹی سی مملکت کی حدود ایک طرف حکومت روم کی سرحدوں سے جاملیں دوسری طرف ایران کی شہرہ آفاق سلطنت پارہ پارہ ہوکر رہ گئی۔

یہ توسیع اسلام کے نام پر تھی اور پیغمبرؐ عرب کی اس سرزمین میں کشادگی کی تعریف میں تھی جو آپ نے دین کی تبلیغ کے لئے بنائی تھی مگر اس کے خطوط میں سکندریت اور دارائیت کا رنگ جھانکتا نظر آرہا تھا۔۔۔پھر بھی اس کو افادیت سے مبرا کہا نہ جاسکتا۔

ختم المرسلین کا مقصد بعثت تمام انبیائے ماسبق کی طرح بنی نوع انسان میں خدا شناسی اور خودشناسی پیدا کرنا تھا، عرفان خالق اور ہدایت مخلوق کو منشائے تخلیق کہا جاسکتا ہے۔۔۔ابوسفیان اگر مکے میں چین سے رہنے دیتا اور اشاعت دین کی راہ میں جوروستم کے پہاڑ کھڑے نہ کردیتا تو آپ ترک وطن نہ کرتے اور اگروہ اسلام کی اشاعت روکنے کی خاطر مدینے پر حملہ آور نہ ہوتا تو حضورؐ اپنے دفاع کے لئے بدر میں نہتے اور برائے نام مسلح مسلمانوں کو لے کر اس کا مقابلہ نہ کرتے بلکہ کفرو اسلام کی کوئی جنگ واقع نہ ہوتی بشرطیکہ آپ کو اپنی بات کہنے سے روکا نہ جاتا۔ کافر آپ کی سنتے یا نہ سنتے، آپ باربار خدا کا پیغام سناتے رہتے مگر تشدد تو درکنار، تلخ بیانی کو بھی روا نہ رکھتے۔ یہی کار نبوت کا انداز تھا۔ اس کے لئے تو صرف زبان اور الفاظ کی صداقت کی ضرورت تھی اور یہ لوازمات ہر سفیر الٰہی لے کر آتا ہے۔ حضورؐ میں اس کی خصوصیات عرش کی بلندیوں سے بڑھ کر موجود تھیں۔ آپ کو شمشیر آہن اور پیکان فولاد درکار نہ تھے مگر جان کی حفاظت کے لئے ان کا استعمال عین اسلام تھا جو دفاع کے لئے جائز ہی نہیں بلکہ واجب تھا۔ اس کو جہاد فی سبیل اللہ کا نام دیا گیا تھا۔

آپؐ کی وفات کے بعد اس جہاد میں فرمانروائی کی خاطر تسخیر ممالک کا نظریہ شامل ہوگیا جو کہیں پرتو مفاد دین کی طرف جاتا نظر آتا اور کہیں صرف دنیاوی اقتدار دکھائی دیتا۔ اس طرح عرب جس اسلام کو لے کر اجنبی ممالک میں داخل ہوئے وہ جابجا ان تعلیمات سے مختلف تھا جو مرسل برحق نے اپنے مقلدین کو دی تھیں پھر بھی ان کو دیکھ کر کہا نہ جاسکتا کہ یہ دین محمدی نہیں ہے۔

خود مدینے کے ملحقات میں اول دین کچھ کچھ بدل گئے تھے تاہم ان کی اصلاح ممکن تھی اور وہ ان حدود سے متجاوز نہیں ہوئے تھے جہاں پہنچ کر اصل روح فنا ہوجاتی ہے۔۔۔

اسلام بدلی ہوئی شکل میں سہی مگر تھا اسلام۔ آیات قرآن تفسیروں کے سہارے اپنے معنی تبدیل کررہی تھیں پھر بھی قرآن قرآن ہی تھا۔ خلافت کی چوتھی منزل پر آکر مساعی علیؑ سے

اسلام کے اصل خدوخال کچھ نمایاں ہوئے تو ابوسفیان کو مرے ہوئے اگرچہ سات آٹھ سال ہو چکے تھے لیکن ان کا فرزند رشید موجود تھا، اس نے مسجد کوفہ سے علی کا خون لیکر دین کے چہرے پر مل دیا اور روئے اسلام پر آل محمدؐ کا خون چڑھانے کی ایک ریت قائم کردی جو حضرت حجت کی غیبت تک جاری رہی۔

جنگ صفین کے بعد حکمین کا فیصلہ کہنے کو معاویہ بن ابی سفیان کی کامیابی تھی لیکن حقیقتاً منافقت کے ہاتھوں اسلام کی شکست تھی جو پھر کبھی فتح میں بدل نہ سکی۔ تاریخ کہتی ہے کہ شام وعراق کے زندان سادات وشیعان علی سے بھرے رہتے تھے، گلی کوچے خون سے رنگین ہوجاتے تھے مگر بنگاہ غائر دیکھا جائے تو صداقت پا بہ زنجیر کی جاتی تھی، پیغمبرؐ عرب کا دین دار پر چڑھایا جاتا مگر وہ ایک انگڑائی لے کر کسی مظلوم کی آواز پر پھر زندہ ہوجاتا تھا۔

تشدد کے ان حربوں کے ساتھ خلافت شام سے اسلام کو زہر دینے کا سلسلہ جو شروع ہوا، اس نے آل محمدؐ کی کسی قربانی کو بارآور نہ ہونے دیا۔۔۔ الفاظ سے خاندان رسالت کے افراد کی کردار کشی اور جھوٹی حدیثوں کی افراط سے صداقت کا گلا گھونٹ دیا گیا۔

علی ابن ابی طالب آج کی اصطلاح میں غزوات اسلام کے ہیرو تھے لیکن بانی اسلام کی وفات کے پچیس سال بعد اسلامیان عرب کے خلافت کے دو دعویداران کی جو رزم گاہ آراستہ ہوئی، اس میں مدینے کے مقابلے پر شام کی طرف سے جو آلات حرب لائے گئے، ان کا جواب مدینے کے علم بردار کے پاس نہ تھا۔ انجام کار کل کا ہیرو آج اس طرح قتل ہوگیا گویا اس کا کل اثاثہ پیغمبری جو وراثت میں ملا تھا، صفحۂ ہستی سے ناپید ہوگیا۔ یہیں سے ایک کے بجائے دو اسلام بن گئے۔ قرآن تھا تو ایک ہی لیکن معنیٰ کے لحاظ سے وہ دو شکلوں میں بٹ گیا تھا۔ ہر ایک کو ان میں سے قرآن کہا جاتا مگر ان کا بطن اور متن الگ الگ ہوگیا تھا۔

اولادِ رسول اس قدر مطعون کی جاچکی تھی کہ اس کا جو تصور مسلمانوں کے ذہنوں میں متشکل ہوتا وہ دینداروں سے بالکل مختلف تھا۔۔۔

خلیفہ شام نے ایک گشتی فرمان جاری کیا تھا کہ جتنی احادیث اہل بیت کے لئے ہیں، ویسی ہی اور ان سے بہتر احادیث دوسروں کے لئے گڑھی جائیں اور ان کی اتنی مشہتری کی جائے کہ اصل حدیثیں پیچھے پڑجائیں۔

تخت شاہی نے مسند اسلام کی جگہ لے لی تھی اور نام تھا خلیفہ رسول کا لہذا لوازمات

ملوکیت کو اصول اسلام سے مستند کرنے کے لئے ارشادات پیغمبر کی تصنیف ضروری تھی جو شد و مد کے ساتھ کی گئی۔ اس کے بعد جو کچھ کرنا تھا، اس کے لئے کوئی نہ کوئی حدیث عوام کی زبانوں پر موجود پائی گئی۔ اس طرح اسلام، قدمائے اسلام اور معنی قرآن کی تفاسیر میں اتنے زاویے پیدا ہو گئے کہ مفکرین کو ان گنت راستے کشادہ نظر آنے لگے۔

اس طرح شروع میں جو دو حلقے بنے تھے قرآن اور اہل بیت یا قرآن و سنت، ان میں سے ایک حلقہ قرآن و اہل بیت تو مفلوج ہو گیا، دوسرا حلقہ قرآن و سنت کا باقی رہا لیکن حدیثوں کی کثرت نے سنت کے بٹوارے کر ڈالے اور جب سنت رسول میں ارشادات پیغمبر کا تضاد سامنے آیا تو صحیح اور غلط کا فیصلہ دشوار ہو گیا اور اسی لحاظ سے تفاسیر قرآنی بھی منقسم ہو گئیں۔

بنیادی طور پر اہل بیت و سنت، قرآن فہمی کے دو وسیلے قرار پائے تھے اور سنت پیغمبری کو سمجھنے کے لئے اکابر کے ذہنوں میں جو حدیثیں تھیں، انھیں سے آیات قرآنی کو سمجھا جاتا تھا لہذا نظریات میں زیادہ اختلافات پیدا نہیں ہوا لیکن اس کے بعد قلم کی روشنائی اتنی پھیلی کہ اصلی الفاظ کو مادی آنکھوں سے پڑھنا تقریباً ناممکن ہو گیا۔

توحید

خداشناسی بعثت پیغمبری کا مقصد اولین ہوتی ہے۔ اس کے لئے جو نظریات پائے جاتے ہیں انھیں اختصار سے درج کیا جاتا ہے۔

امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب نے ایک یہودی سے خدا کو سمجھانے کے لئے کہا تھا۔

"کیا تم لوگ اپنی بعض کتابوں میں نہیں پڑھتے کہ ایک روز موسیٰ بن عمران بیٹھے ہوئے تھے کہ مشرق کی طرف سے ایک فرشتہ آیا۔ موسیٰ نے پوچھا۔ کہاں سے آ رہے ہو تم؟ اس نے جواب دیا: اللہ کے پاس سے۔ پھر ایک فرشتہ مغرب کی طرف سے آیا۔ موسیٰ نے اس سے بھی پوچھا کہ کہاں سے آ رہے ہو؟ اس نے بھی جواب دیا کہ اللہ کے پاس سے۔

اس کے بعد ایک اور فرشتہ آیا۔ اس نے پوچھنے پر بتایا۔ ساتویں آسمان سے اللہ کے پاس سے۔ پھر ایک فرشتے نے آ کر کہا کہ وہ ساتویں زمین سے اللہ کے پاس سے آ رہا ہے۔۔۔ موسیٰ نے کہا کہ پاک ہے وہ ہستی جس سے کوئی مقام خالی نہیں۔ اس کا کوئی مکان نہیں لیکن کسی مکان کی

نسبت وہ زیادہ قریب ہے۔۔۔ یہودی اس بیان پر بھڑک اٹھا،،۔(۶۰)

اسی کتاب میں ۶۷۹ پر بحوالہ کتاب الاحتجاج طبرسی جلد ا صفحہ ۱۳۱۳ دیدار الہٰی کے لئے امیر المومنین کا ایک بیان نقل کیا جاتا ہے۔

'' آنکھیں اس کا مشاہدہ نہیں کر سکتیں۔ عقلیں حقائق ایمان کے ساتھ اس کو دیکھتی ہیں وہ دلائل کے ساتھ معروف ہے، علامات سے موصوف ہے۔ لوگوں پر اس کا قیاس نہیں کیا جا سکتا، حواس اس کا ادراک نہیں کر سکتے،،۔

امیر المومنین کے ایک خطبے سے حمد خدا کا ایک اور اقتباس ملاحظے کے لئے پیش ہے جس سے وجود باری پر مزید روشنی پڑ سکتی ہے۔

'' وہ خدا، جس کی حقیقت بلند ہمتوں کے ادارک سے ماوراء ہے، فکر کی گہرائیاں جس تک پہنچنے سے قاصر ہیں۔ اس کی صفات کی کوئی حد نہیں، نہ کوئی ایسی نعمت (جو صفات خداوندی کا بیان کر سکے) نہ کوئی وقت جس کا شمار ممکن ہو۔ نہ کوئی مدت دراز جو ختم ہی ہو۔ اس نے خلائق کو اپنی قدرت سے پیدا کیا، ہواؤں کو اپنی رحمت اور مہربانی سے پھیلایا۔۔۔ متحرک اور لرزاں زمین کو سنگ ہائے بزرگ سے میخ کوب کیا اور مستحکم و مستمار فرمایا۔

دین کی پہلی بنیاد خدا کی معرفت ہے، معرفت کا کمال اس کی تصدیق ہے، کمال تصدیق توحید ہے، کمال توحید اس کو ہر چیز سے برتر ماننا ہے، کمال اخلاص ذات صفت کی نفی ہے کیونکہ وہ صفت غیر موصوف ہے اور ہر موصوف غیر صفت ہے، جس نے اس کی توصیف میں ذات کو صفت سے ملایا، اس نے گویا ذات الہٰی میں دوئی پیدا کی، جس نے دوئی پیدا کی، اس نے ذات الہٰی میں تقسیم مانی۔ وہ نادان ہے، جس نے نادائی کی، اس نے خدا کی طرف اشارہ کیا، جس نے اشارہ کیا اس نے اسے محدود کر دیا اور جس نے یہ پوچھا کہ خدا کس چیز میں ہے؟ اُس نے گویا کسی چیز کے ضمن میں اسے قرار دیا۔ جس نے سوال کیا، وہ کس چیز پر ہے؟ تو اس نے دوسرے مقام کو اس سے خالی تصور کر لیا۔

خدا ہمیشہ سے موجود ہے مگر حادث و نو پید نہیں ہے۔ وہ موجود ہے مگر اس کی ہستی عدم و نیستی کے بعد نہیں ہوئی۔ وہ ہر چیز کے ساتھ ہے لیکن بطور ہم سر نہیں۔ وہ ہر چیز سے الگ ہے لیکن اس سے کنارہ کش نہیں۔ وہ ہر چیز کا فاعل ہے لیکن اس کا فعل حرکات و آلات کا نتیجہ نہیں۔ وہ بصیر ہے، اس وقت سے جب اس کی مخلوق نہ تھی، وہ منفرد ہے کیونکہ اس کا کوئی ساتھی نہیں، جس سے وہ اپنا جی

بھلائے اور جس کے نہ ہونے سے اسے الجھن ہو۔ اس نے دنیا کو پیدا کیا اور پہلے پہل بغیر اس کے کہ فکر کو کام میں لاتا یا تجربے سے فائدہ اٹھاتا۔

''اس نے نہ اپنے نفس میں کوئی حرکت پیدا کی نہ پہلے سے کوئی اہتمام کیا کہ جس کے لئے بے چین ہوا ہو۔۔۔،، (۶۱)

حاشیے پر مترجمین کے نوٹ ملاحظہ فرمائے جائیں تو بلاغت کلام کی صراحت ہو جاتی ہے اور کلام کا ایک ایک جملہ مستقبل میں سائنس کی دریافت کو ایک ہزار سال قبل واضح کر دیتا ہے۔۔۔'' متحرک اور لرزاں زمین کو سنگ ہائے بزرگ سے میخ کوب کیا۔،، دنیا بہت سے بزرگوں کی ہمہ دانی اور بصیرت کا نعرہ لگاتی ہے۔ ہے کسی کی کوئی ایسی بات کسی کے علم میں ہے، جو تصورات مروجہ کے برعکس اس وقت منظر عام پر لائی گئی ہو؟

اس کا جواب شاید مل نہ سکے کیونکہ سوال ہی غلط کیا گیا ہے۔۔۔ مرشد کامل کے لئے بخاری کی ایک حدیث ام المومنین عائشہ کی مروی یاد آ گئی کہ حضور کو کوئی علم غیب نہیں تھا۔ ظاہر ہے کہ جب نبی کو غیب کا حال خدا نے نہیں بتایا تھا تو جانشینوں کو علم نہ ہونا چاہئے تھا لیکن مسلمانوں کے خلیفہ چہارم اور شیعوں کے پہلے امام کو منصوص من اللہ ہونے کے ساتھ ساتھ بہت سے رموز کائنات معلوم تھے جو معلم مطلق نے تعلیم کر دیئے تھے، جن میں سے اعشاری نظام اور گردش ارضی کا حوالہ ربط تحریر میں آ گیا ہے۔ بعض مزید باتیں خطبات سے آئینہ ہو جاتی ہیں اور پورے مسلک حیات کے ہر لمحے پر نظر ڈالی جائے تو، توحید، عدل، مشیت، ادیان عالم، اسلام اور پیغمبرؐ اسلام کی ہر تصویر حیطۂ خیال میں آ جاتی ہے مگر پیغمبرؐ عرب کو فرمانروائے عرب قرار دینے والوں نے احادیث سازی اور تاریخ کی خلاقی میں سب کچھ بدل ڈالا۔۔۔ توحید کے سلسلے میں اہل سنت کے اساسی نظریات علیؑ کے مبینہ حقائق سے زیادہ مختلف نہیں تھے لیکن بنی امیہ نے جب خدا کی تعریف کی تو اس کو بھی الگ کر لیا ۔ چند نظریات پیش خدمت ہیں۔

خدا نے آدم کو اپنی صورت میں پیدا کیا جس کا قد ساٹھ میٹر تھا۔

ہر شخص جنت میں آدم کی صورت میں داخل ہو گا یعنی خدا کا ہم شکل۔ (۶۲)

کیا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ سارے اہل جنت ہم شکل ہوں گے؟ اور صحیح بخاری کی رو سے سب سے پہلے جنت میں داخل ہونے والے خود حضورؐ ہوں گے۔ حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان کے محلات کی تفاصیل بھی اسی صحیح میں پائی جاتی ہے۔ یہ محل بھی غالباً کہیں قریب ہی واقع

ہوں گے اور سب کے سب ہوں گے آدمؑ یعنی اللہ کے ہم شکل تو ایک دوسرے کو پہچانے گا کیونکر؟ یہ بھی ممکن ہے کہ ابو بکر یا عمر کو رسولؐ سمجھ لیا جائے یا رسول کو ابو بکرؓ کا نام لے کر پکار لیا جائے ---- ممکن ہے کہ شناخت کے لئے پوشاک کی وضع قطع یا کوئی رنگ مختص کیا گیا ہو۔ یہ الجھن پیدا ہونے پر تلاش سے کوئی روایت نہ مل سکی البتہ خدا کے بارے میں ایک حدیث ضرور ملی کہ جب وہ جنت میں آئے گا تو اس کو بڑی مشکل سے پہچانا جائے گا۔

اس کی تفصیل سمجھنے کے لئے خود بخاری کا مطالعہ فرمائیں اور مجھے مسلمانوں کے عتاب سے محفوظ رکھیں۔

ایک بات پر توجہ دلانے کی جسارت ضرور کی جاتی ہے کہ ام المومنین عائشہ کا عالیشان محل بھی کہیں جوار ہی میں ہوگا۔ عورتوں کے بارے میں کوئی حدیث نہیں ملی کہ ان کی صورت کیسی ہوگی؟ اس سوال کا جواب بھی قارئین کرام خود حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

خدا کے بارے میں چند احادیث کے اقتباسات اور نقل کیے جاتے ہیں جن سے وحدت باری پر روشنی پڑتی ہے۔

خدا تخلیق کائنات سے پہلے عرش پر اڑتا پھرتا تھا

خدا کے بیٹھنے سے عرش چرچراتا ہے۔ جیسے نئی زین سوار کے بیٹھنے سے آواز دیتی ہے۔

خدا اپنی پنڈلی کھولے گا تو مومنین و مومنات سجدے میں گر جائیں گے۔

دوزخ سے اس وقت تک ھل من مزید کی آواز آتی رہے گی، جب تک خدا اس میں اپنی پنڈلی نہ ڈال دے گا۔

ملک الموت موسیٰ کی روح قبض کرنے گئے تو موسیٰ نے اس زور کا طمانچہ مارا کہ ملک الموت کی ایک آنکھ پھوٹ گئی۔

احناف ان تمام نظریات سے متفق نہیں ہیں بعض کو تسلیم کرتے ہیں۔ ایک جلیل القدر عالم نے طویل گفتگو کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ یقیناً کچھ باتیں غور طلب ہیں لیکن ہم قیامت میں خدا کو کسی نہ کسی شکل میں دیکھیں گے ضرور۔ خدا کے متشکل ہونے سے حلول کرنا ثابت ہے۔ مزید بحث بیکار ہے۔

رسالت

خدا کے بعد دین میں سب سے زیادہ اہمیت حضور کو ہے۔علامہ عبدالحق محدث دہلوی ؒ نے مدارج النبوہ میں صحیح بخاری اور دیگر کتب احادیث سے آپ کے حسب ونسب کو بحوالہ روایت جبریل مشرقین ومغربین میں افضل ترین تحریر کیا ہے۔تخلیق کائنات سے ہزاروں سال قبل آپ کے نور کو خلقت اول قرار دیا ہے اور نسل آدم میں اس کی منتقلی پاکیزہ بطون اور مطہر اصلاب میں لکھی ہے۔ خود آپ کی ایک حدیث بھی نقل کی ہے کہ آپ اس وقت بھی نبی تھے جب آدم مٹی اور پانی کے مابین منتظر تخلیق تھے۔

شیعوں کے عقیدے میں اس نور سے چار نور اور مشتق ہیں، جن سے پنجتن پاک کی تکمیل ہوتی ہے اور علی وفاطمہ اور حسن وحسین مل کر مرکز ایمان قرار پاتے ہیں۔

انبیاء کے متعلق ایک متفقہ نظریہ ہے کہ سب ختم المرسلین کی امت اور صاحبان عصمت ہیں۔ خدا سب کو علم لدنی اور خلعت نبوت سے نواز کر بھیجتا ہے۔ حضرت عیسیٰ جس کی ایک نظیر ہیں اور گہوارے میں اپنی نبوت کا اعلان کرتے ہیں۔تین چار روز کا بچہ کبھی بولا نہیں کرتا لیکن عیسیٰ مریم کہتے ہیں کہ خدا نے مجھے کتاب دی ہے۔

حضرت آدم پہلے نبی اور پہلے انسان تھے۔علم نبوت اپنی خلقت میں لے کر آئے تھے ۔۔۔ یہ ایک علیحدہ موضوع ہے کہ کس نے کب اعلان نبوت کیا؟ اس کا انحصار مشیت الہیٰ کے نزدیک اقتضائے وقت پر تھا، جس کی پابندی ہر نبی پر واجب تھی اس طرح اصول فطرت میں ہر نبی کے لئے حسب ونسب میں طاہر ومطہر ہونا، علم لدنی لے کر آنا، خطا ونسیان سے مبرا ہونا لازم تھا، جس کا التزام مشیت نے روز اول سے کیا تھا اور ایک نظام کامل کو لوازمہ خلقت بنا دیا تھا۔

مسلمانوں کا ایک گروہ ان تمام باتوں کا قائل ہے دوسرا بعض کو مانتا ہے اور بعض کو نہیں مانتا اور اس کے بعد کے فرقوں میں تو ایک نے نبی کو انسان کی شکل میں دیکھ کر اپنا سا انسان سمجھ لیا اور اس سے ہر وہ بات وابستہ کر دی جو عام انسانوں کے لئے ممکن تھی۔

محدث دہلوی نے نسل کی نجابت کے لئے قدرت کا اہتمام بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس کے بعد آخری نبی کی پرورش میں کسی کافرہ کا دودھ پینا خلاف عقل ہے۔ جب تک اس کو موحد ثابت نہ کیا جائے یا پھر ماننا پڑے گا کہ ابوجہل کی آزاد کردہ کنیز ثوبیہ، جو عبدالمطلب کے زیر اثر

ہونے کے باعث موحد تھی، حلیمہ سعدیہ کے بجائے اس نے جناب آمنہ کے بعد حضورؐ کو دودھ پلایا تھا اور دودھ کی مدت گزرنے کے بعد آپ قبیلہ بنی سعد میں بھیجے گئے۔

اسی طرح شق الصدر کا واقعہ بھی تصنیف سے مختلف معلوم نہیں ہوتا۔ کسی قسم کی کوئی آلودگی تھی ہی نہیں تو تطہیر کی ضرورت کیوں لاحق ہوئی۔۔۔شاید اپنے سے گنہگار کو لائق نبوت بنانا تھا!

اسی طرح غار حرا سے لیکر بستر مرگ تک نہ جانے کتنی کہانیاں ملتی ہیں جنہوں نے احادیث کی صورت اختیار کر لی ہے۔ جبریل نے غار حرا میں حاضر خدمت ہو کر مشیت ایزدی کا مژدہ سنایا تھا کہ اقراء باسم ربک الاعلیٰ سے نبوت کا آغاز فرمائیں۔ مورخ نے لکھ دیا کہ جواباً آپ نے فرمایا'' میں پڑھنا لکھنا نہیں جانتا،، اس میں پڑھے لکھے ہونے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ آپ کی کتاب تھی۔ اس کا ایک سورہ فرشتے نے پڑھ کر سنایا تھا۔ جامہ انسانی میں آپ اس کو اپنی زبان سے دہرا دیتے۔۔۔لیکن بتانا یہ تھا کہ ہماری طرح کے آدمی تھے لہذا تطہیر کے بعد بھی کلام باری سے خوف اور گھبراہٹ پیدا ہوگئی۔۔۔اس تمہید سے آگے چل کر یہ نتیجہ اخذ کرنا تھا کہ پیدائشی نبی نہیں تھے، چالیس سال کی عمر میں سیرت و کردار کی بناء پر نبوت کے لئے منتخب کر لئے گئے اور نبوت ان پر ختم نہ ہو جاتی تو حضرت عمر کو ملتی!

پھر اپنا سا بشر ثابت کرنے کے لئے احادیث کے انبار لگا دیئے گئے اور جوانی کے تقاضوں کے سلسلے میں ایسا مواد فراہم کیا گیا ہے۔ سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے، ہر نقل و حرکت میں'' پابند مشیت،، نبی کو جنسی مریض بنا کر رکھ دیا۔ حدیث کی کسی ایک کتاب سے اس موضوع پر تمام احادیث یکجا کر دی جائیں تو انھیں دیکھ کر عصمت پیغمبری میں ملبوس نبی ایک شوقین مزاج حکمراں نظر آنے لگتا ہے۔

آنحضرتؐ نے بلا قید سن و سال ہر قبیلے کی ایک ایک عورت کو داخل حرم صرف اس لئے کیا تھا کہ اس کے توسط سے قبیلے کے افراد آپ کے قریب آئیں گے تو انھیں اپنا پیغام پہنچانے کا موقع ملے گا لیکن آپ کو اپنا سا بشر سمجھنے والوں نے دوسرا رنگ دیدیا۔۔۔ خود حضرت عمر کے سوچنے کی بات تھی کہ دوسروں نے حفصہؓ کو عقد میں لینے سے انکار کر دیا تھا مگر رسولؐ برحق نے انھیں خود قبول کر کے ام المومنین بنا دیا۔۔۔ ستم ظریفی قابل ملاحظہ ہے کہ صحیح بخاری کی ایک حدیث کی رو سے حضرت عمرؓ نے حفصہؓ سے کہا تھا۔ تم عائشہؓ کی برابری کیوں کرتی ہو، وہ تم سے زیادہ خوبصورت ہے!

یہ ایک جملہ ہی پورے ذہن کی ترجمانی کرتا ہے۔ دو حدیثیں نظیر کے طور پر پیش

ہیں۔۔۔

سحر بن سعد سے روایت ہے کہ ''عرب کی ایک عورت رسول اللہ کے لئے لائی گئی جو سر سے چادر اوڑھے ہوئے تھی۔ آنحضرت نے اس سے رجوع کیا تو اس نے کہا '' میں اللہ کے نام پر آپ سے پناہ مانگتی ہوں۔ آپ نے اس کو چھوڑ دیا۔''

ابو اسیب سے روایت ہے ''ایک دن میں رسول اللہ کے ساتھ ایک جگہ گیا۔ ایک عورت جونیہ کو لوگ لائے۔ آپ نے اس کی طرف سبقت کی تو وہ سر سے پاؤں تک کانپ گئی اور جب آپ نے اس سے اپنے کو قبول کرنے کی بات کی تو اس نے اعوذ باللہ منک کہا۔ آپ نے اس کو چھوڑ دیا''۔ (۶۳)

احادیث کا یہ انداز ان مقاصد کی نفی کرتا ہے جن کے تحت حضور مختلف قبائل کی عورتوں کو اپنے حبالہ عقد میں لائے تھے۔

صحیح بخاری میں ام المومنین عائشہ سے مروی ایک حدیث پائی جاتی ہے کہ آنحضرتؐ تشریف لائے تو عائشہ دردسر میں کراہ رہی تھیں۔ آپ نے فرمایا کہ تمہارا کیا نقصان ہے، اگر تم میرے سامنے مرجاؤ، میں تمہاری تجہیز و تکفین بڑی دھوم دھام سے کروں گا تو ام المومنین نے جواب دیا' اس سے فارغ ہوتے ہی آپ میرے ہی گھر میں کسی دوسری عورت سے ہم صحبت ہو رہے ہوں گے۔

اس کے بعد جنسیات کی طرف آپ کا میلان محتاج ثبوت نہیں رہتا۔ معیار جمال و شباب آپ کی پسندیدگی کے مسلمات میں داخل ہو جاتا ہے اور کم سن اور حسین ہونے کے سبب ام المومنین کی محبوبیت قطعی ہو جاتی ہے۔ یہی شاید تخلیق احادیث کا منشاء تھا لیکن حضرت عائشہ کی کم سنی اور خوبصورتی طبقات ابن سعد کے بیان سے مشتبہ ہونے کے بعد اس مقصد کو ٹھیس لگتی ہے اور پیغمبر اسلام کی سیرت بھی مجروح ہوئے بغیر نہیں رہتی۔

اگر صرف صحیح بخاری اور صحیح مسلم، احادیث کے دو مجموعوں پر ہی اکتفا کی جائے تو اہل بیت کے کرداروں کی جو حیثیت متعین ہوتی ہے وہ انہیں عام امتیوں کے مقابلے میں پست کر دیتی ہے اور خود رسول اکرم کی جو سیرت سامنے آتی ہے وہ تو انبیائے ماسبق سے بہت مختلف ہے۔ بروئے بخاری حضورؐ نے خود فرمایا تھا کہ مجھ کو موسیٰ پر ترجیح نہ دیا کرو۔ اس کی شہادت میں ایک حدیث پائی جاتی ہے۔ کہاں یہ روایت کہ تمام انبیاء آپ کی امت میں ہیں اور کہاں یہ بیان کہ حضرت موسیٰ آپ

سے برتر تھے۔ اس طرح افضل المرسلین ہونے کا شرف آپ سے چھن جاتا ہے۔

حدیثوں کی روشنی میں پیغمبرؑ اسلام کی سیرت متعین کی جائے تو اس کی ابتداء ان حدیثوں سے ہوتی ہے۔

آپ دوسرے انبیائے آدم کی طرح ایک بشر تھے۔ عرب کے معاشرے میں آپ کے کردار، دیانت اور پاکیزگی کو دیکھ کر خالق کائنات نے نبوت کے لئے منتخب کرلیا۔ ترسٹھ سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔ اب آپ کی حیثیت ایک عام آدمی کی طرح ہے جو نہ کسی کو کوئی فائدہ پہنچا سکتی ہے اور نہ نقصان۔

تیئیس سال کی کے دور نبوت میں کبھی عام آدمی ہوتے اور کبھی نبی۔

حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ نماز شب میں عذاب قبر سے پناہ مانگا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ کسی نے آپ پر جادو کر دیا تھا لیکن خدا نے شفایاب کر دیا۔

~~نسیان و خطا سے مبرا نہ تھے~~

قرآن کی آیات بھول جایا کرتے تھے۔ کسی کو پڑھتے سنتے تو آیات یاد آ جاتیں۔

جنگ خندق میں کئی نمازیں قضا کیں

نماز پڑھانے میں کئی بار بھول گئے۔ دوسروں نے یاد دلایا تو سجدہ سہو ادا کئے۔

ایک مرتبہ ایسا سہو کیا، کسی نے ٹوکا تو آپ غضبناک ہو گئے

سفر میں صبح کی نماز کے وقت سوتے رہے۔ جگانے پر نماز ادا کی۔

بیٹی کی محبت میں دائرہ نبوت سے تجاوز کر جاتے۔

اس طرح کی ان گنت احادیث صرف صحیح بخاری میں پائی جاتی ہیں جنہیں پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ آپ سے تو بعض اصحاب بہتر تھے، جن کے بارے میں آپ کے فرمودات انھیں سطح پیغمبری تک پہنچا دیتے ہیں۔

ایسی تمام حدیثوں کو جمع کر دیا جائے تو مسلمان غور و خوض کرنے کے بجائے جامع کو گردن زدنی قرار دیں گے بلکہ ہوسکتا ہے کہ گردن ہی اڑا دیں۔ اس لئے صرف اشارے کر دیئے گئے تا کہ ~~ان سے ختم الانبیاء کا جو سراپا تشکیل پاتا ہے، اس کو دیکھ کر فیصلہ کیا جائے کہ کیا یہ وہی نبی ہے جس کی~~ لفظی تصاویر مدارج النبوۃ اور سیرت کی دیگر کتب میں پیش کی گئی ہیں؟

اس طرح افضل المرسلین کی ذات گرامی کئی شکلوں میں منقسم ہوگئی۔ ایک وہ جس میں سیرت انبیاء کے ہر جلال و جمال کی تابندگی تھی، دوسری قدرے ترمیم کے ساتھ، تیسری ملوکیت کی مطلوبات کے مطابق ۔۔۔ تیسری صورت پہلی اور دوسری شکلوں کی متضاد ہے، جس کی چند خصوصیات سطور بالا میں پیش کی گئی ہیں۔ انھیں خصوصیات سے تخت وتاج کی کسرائیت اور قیصریت میں تقدس کے پہلو پیدا کئے گئے اور اسلام کی وہ اختراعی دفعات وجود میں آئیں، فرمانرائی کو جن کی ضرورت تھی۔

یہی وہ مقاصد عظیم تھے جن کے لئے احادیث سازی کی ضرورت لاحق ہوئی۔ بلاشبہ یہ کام اتنے سلیقے اور لگن سے کیا گیا کہ خرد کا نام جنوں اور جنوں کا نام خرد پڑ گیا۔ بیت رسالت کے ستون پہلے تو نیرنگی زمانہ کی مسلسل ضربوں سے کمزور کئے گئے پھر منہدم ہوگئے۔ انکی جگہ دور جاہلیت کے ایوانوں کو ایمان کی خودساختہ آب وتاب کا ملمع چڑھا کر استوار کیا گیا۔ آج بیت رسالت کے کھنڈر جابجا نظر تو آتے ہیں لیکن ان کے مقابل تاریخ کے عالیشان محل اس طرح ایستادہ ہیں گویا وہی اسلام کی سطوت ماضی کے آئینہ دار ہیں۔

ہادی اسلام کی حیات طیبہ جادہ ہدایت اور بساط حکومت دو حصوں میں منقسم ہوئی تھی جس کو بالاختصار امامت وخلافت کہا جاسکتا ہے۔ امامت کے لئے خلافت ایک اضافی چیز تھی جو ملنا چاہئے تھی مگر نہیں ملی، پھر بھی امامت نے دوسرے ہادیان عالم کی طرح اپنے مشن کو جاری رکھا لیکن خلافت اس کے علیحدہ وجود کو برداشت نہ کرسکی اور اس کو خلافت کا جزو قرار دے کر شامل اقتدار کرنے کی کوشش کرتی رہی حالانکہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ خلافت خود امامت کی ایک ذیلی چیز تھی۔ یہ کشمکش مدینے سے کوفے تک جاری رہی اور جب دمشق حصول خلافت کے لئے کوفے پر حملہ آور ہوا اور مسلمانوں کے خون پر اس نے فتح کا پرچم لہرایا تو امامت کی کردارکشی کے لئے وضعی احادیث کا کارگر حربہ بروئے کار لایا، جس سے انجام کار توحید، رسالت اور اسلام کے پرخچے اڑ گئے۔

پھر پیغمبرؐ اسلام کی جو صورت منظر عام پر آئی تھی، اس نے اسلام کی ہیئت اور قرآن مجید کے معنیٰ تفاسیر کی منطق سے بدل کر رکھ دیئے۔ محدث دہلوی نے ختم المرسلین کی نجابت، شرافت اور لوازمات ہدایت کو جس طرح بیان کیا ہے، وہ سب قصہ کہانی بن کر رہ گیا۔ اس کے بعد عباسیوں نے مصالح شاہی کی خاطر اس پر مہر توثیق ثبت کردی۔

اساسی طور پر احادیث کے دو سلسلے چلے تھے۔ ایک خانوادہ رسالت سے دوسرا ارباب

سقیفہ سے۔ یہ سلسلے کہیں پر ہم زبان تھے اور کہیں مختلف پھر بھی ان کے مابین ایک آہنگ تھا۔ ان سے بعض کتب احادیث و تاریخ مرتب ہوئی تھیں لیکن زیادہ کام جو کیا گیا، وہ ذخیرہ شام سے ماخوذ تھا۔

اہل بیت نبوت کا سرمایہ احادیث امتدادِ زمانہ کی دست و برد سے بہت کم بچا تھا لیکن جو کچھ تھا وہ بنیادی بیانات کا حامل تھا۔ اس کو کثرت احادیث کا زعم جھٹلاتا رہا پھر بھی بعض مورخین نے دوطرفہ حدیثوں سے اپنی تاریخیں مرتب کیں لیکن اکثر نے صرف خلافت شام کے ذخائر کو معتبر قرار دیا، جو اہل بیت کے بیانات کو صداقت سے عاری قرار دیتا تھا۔ انھیں میں سے بیشتر مجموعہ ہائے صحیحین مرتب ہوئے، جو آنحضرتؐ کی وفات کے ڈھائی سو سال بعد کی باتیں ہیں، جب منصور دوانیقی، ہارون رشید اور مامون اولاد فاطمہ کی منصوص من اللہ امامت کے مقابل ایک امامت بنا چکے تھے، شیعان علی کی ٹکر پر اہل السنّت والجماعت کی تشکیل کر کے اہل اسلام کے دو مستقل دھڑے ترتیب دئے جا چکے تھے اور ''فقہ امامیہ آل رسول،، کے سامنے فقہ حنفیہ کو رواج دے کر اسلام کو دو حصوں میں بانٹ چکے تھے۔

یہ تقسیم ایک خدا ایک رسول، ایک اسلام اور ایک قرآن کے دو ٹکڑوں کا اعلان کر رہی تھی پھر بھی وہ جا بجا ایک ہی نظر آتے۔ صحیحین پر مکمل عملدرآمد کے بعد سے اہل بیت کی سیرتوں پر مستقل اور مسلسل ضربوں کے باوجود ان کے موقف میں کوئی تبدیل نہیں آئی البتہ اہل السنّت والجماعت کے نظریات میں آئے دن متضاد احادیث اور مختلف روایات کے سبب طوفان پر طوفان آتے رہے مسلمان کے فرقوں پر فرقے بنتے رہے اور ان کا سلسلہ خدا جانے کہاں تک جائے گا!

خلاصہ تاریخ

''عوام بادشاہ کے مذہب پر ہوتے ہیں،،

عربی کی اس مشہور کہاوت کا اطلاق دنیا کے ہر حصے اور ہر دور پر ہوتا ہے۔ غریبوں کے مفاد اور امراء کی جاہ طلبی کو اس میں بڑا دخل ہے اور اکثر اقتدار کا دبدبہ اور شمشیر کی چمک شاہی مسلک یا سرکاری مذہب کا نفاذ بھی کرتی رہی ہے۔

بساط زبان و مکان پر دور اور بہت دور جانے کے بجائے، اگر ماضی قریب میں ہندوستان یا پاکستان پر ایک نظر ڈالی جائے تو آئندہ تاریخ اس کی شہادت دے گی کہ ہر عہد کی تاریخ فرمانرواؤں کی مرضی کے مطابق تحریر کی جاتی رہی جس کو بجا طور پر صاحبان اقتدار کا نثری قصیدہ کہا جا سکے گا۔

پھر امتداد زمانہ سے اگر حکومت پر کسی دوسرے کا قبضہ ہو گیا تو وقت نے اچانک کروٹ لی، رات کو دن کہا جانے لگا، ماضی کی ہر روایت بدل گئی، مشاہیر تختہ دار پر دکھائی دینے لگے، کل جو صدق تھا، آج اس کو کذب کہا جانے لگا اور آج کے کذب کو جامہ صداقت پہنا دیا گیا۔

حالات حاضرہ نے اگر طول کھینچا تو مستقبل پر بھی اس کے نقوش قدم ثبت ہو گئے اور تاریخ کے ہاتھ پاؤں پھیلتے چلے گئے مگر اس کی بقاء بقائے اقتدار کی پابند رہی۔

بیسویں صدی عیسوی کی تیسری چوتھی دہائی تک ہندوستان کی تاریخ کا یہی عالم تھا۔ پروفیسر ایشوری پرشاد اور بعض مسلم اہل قلم کی تاریخیں جو درسیات میں شامل ہیں، ان میں انگریزوں کے عدل وانصاف، رعایا پروری اور انسان دوستی کی وہ داستانیں پائی جاتی تھیں کہ جیسے وہ کسی نجات دہندہ کی طرح ہندوستان میں وارد ہوئے تھے اور خود ہندوستان کے محب وطن حکمران ٹیپو سلطان، سراج الدولہ اور دیگر ہندو مسلم راجہ ومہاراجہ حد درجہ ظالم، عیش پرست اور نا اہل تھے بالخصوص ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے ہیرو خود غرض، باغی اور لیٹرے تھے۔ جھانسی کی رانی، ملکہ حضرت محل تو بالخصوص سرپھری اور وطن دشمن تھیں لیکن جب ملک آزاد ہوا تو تمام مشاہیر تخریب کار کے بجائے حریت پسند لکھے جانے لگے، ان کے نقش قدم لائق تقلید قرار پائے اور ارتقائے زمانہ میں ملک کا نشان عظمت سمجھے جائیں گے۔

ہندوستان سے برطانوی اقتدار ختم نہ ہوتا تو تاریخ وہی رہتی جو ظلم وتشدد کی چھاؤں میں لکھوائی گئی تھی۔ اسلام کے ساتھ بدقسمتی سے ایسا ہی کچھ پیش آیا کہ نجات دہندہ کی آنکھ بند ہوتے ہی بوریہ تقدس پر جو تخت شاہی بچھایا گیا، وہ پھر کبھی ہٹ نہ سکا۔ ایک نسل کے بعد دوسری نسل نے اس کی جگہ لی، دوسری کے بعد تیسرا اس کا جانشین ہوا لیکن بقائے حکومت کے مصالح ہر ایک کو پیش نظر رکھنا پڑے کیونکہ پیغمبرؐ کے حقیقی وارثوں کو کچلے بغیر بقائے اقتدار نہ ہو سکتا۔ کسی وقت بھی اصل حقدار کے میدان میں آجانے کا خطرہ لاحق رہتا اسلئے استقرار حکومت کے ساتھ ساتھ نسل پیغمبری کی بیخ کنی لوازمہ شاہی بنی رہی۔ جس کی تفصیلات ممکن اختصار سے گوش گزار کی جا چکی ہیں۔

اسلام بلاشک وشبہ نسل آدم کے لئے خدا کا آخری پیغام تھا اور پیغمبرؐ عرب سفارت الہیہ کے آخری نمائندے۔ آپ نوع بشر کو صحیح معنی میں اشرف المخلوقات بنانے کے لئے آئے تھے۔ ممکن حد تک انسانیت کا فروغ، خودشناسی اور خداشناسی کی تعلیم آپ کا منصب تھا۔ جس کا آغاز ہی بطحیٰ کے اجارہ داروں کو برداشت نہ ہو سکا اور وہ متحد ہو کر چڑھ دوڑے لیکن شکست ان کا مقدر تھی۔ ہر بار

وہ پسپا ہوئے اور ہر حملے میں اپنے متصرفات پیغمبر کو سونپتے چلے گئے جن میں زمین کے بعض حصے بھی تھے۔ یہ حصے مل جل کر ایک چھوٹی سی مملکت بن گئے۔

پیغمبرؐ کی آنکھ بند ہوئی تو آپؐ کے باقیات الصالحات میں اسلام کا تحفظ اور وہ مملکت تھی جس پر دنیا کی نظریں آپؐ کی زندگی ہی سے لگی ہوئی تھیں۔

تحفظ اسلام کا منصب، منصب الٰہیہ تھا، وہ اس نے لے لیا جس کو ازل سے تفویض ہوا تھا، مملکت کا نظم ونسق بعض اصحاب نے کدو کاوش کر کے حاصل کر لیا لیکن غضب یہ ڈھایا کہ منصب الٰہیہ کو بھی کہنے کے لئے اس سے وابستہ کر لیا۔ کسی نے یہ نہیں سوچا کہ رضائے الٰہی بزور بازو حاصل کرنے کی چیز نہیں، اس کا انحصار خدائے بخشندہ کی دین پر ہوتا ہے۔۔۔ مگر مجبوری یہ پیش آ گئی تھی کہ مملکت ختم المرسلین سے منسوب تھی جس کا قانون اسلام تھا۔ اسلام کا نام نہ لیا جاتا تو اقتدار کو کوئی تسلیم نہ کرتا لہٰذا مملکت کے ساتھ اسلام پر قبضہ کرنا ناگزیر تھا۔

اس طرح بیک وقت مرسل برحق کے دو جانشین وقوع میں آئے۔ ایک صرف پیغمبرانہ بساط کا دوسرا تخت خلافت اور آئین اسلام دونوں کا۔ ایک کو اہل دنیا نے بنایا تھا دوسرے کو خدا نے شروع شروع میں حکومت کا گروہ کچھ برا تھا۔ دنیا کو امید تھی کہ خدا کا بنایا ہوا جانشین اقتدار کے لئے میدان میں آئے گا اور مملکت پر قبضہ کر لے گا مگر اللہ کا کوئی سفیر کبھی لاؤ لشکر لے کر نہیں آتا اور نہ مادی چیزوں کو اہمیت دیتا ہے اس کا کام تو نوع بشر کی اصلاح ہوتا ہے، افضل الانبیاء کے جانشین کا منصب بھی یہی تھا، وہ تو خدا کی بخشی ہوئی تلوار کو صرف اسلام کی خاطر بے نیام کر سکتا تھا، حصول مملکت کے لئے نہیں ورنہ اس میں اور دنیاوی حکمرانوں میں کوئی فرق ہی نہ رہ جاتا لہٰذا اس نے خاموشی اختیار کر لی اور اپنے منصبی کام میں لگ گیا۔ انجام کار دنیا دار بتدریج طلب دنیا میں اقتدار کی طرف جھکنے لگے اور رسولؐ کے ازلی جانشین کا حلقہ تنگ سے تنگ تر ہوتا چلا گیا۔

پھر حکومت کی بقاء کے لئے اصل حقداروں کے ساتھ وہ روش اختیار کی گئی جو کوئی نیا بادشاہ پرانے بادشاہ کے اہل خاندان کے ساتھ کرتا آیا ہے اور آئین الٰہیہ میں مصلحتی ترامیم وتنسیخ کے ساتھ اسلام کے نام سے جو قانون نافذ ہوا وہ جابجا پیغمبری قانون سے مختلف تھا۔

یہ عہد اگرچہ خانوادہ ختم المرسلین کے لئے صبر آزما تھا لیکن ایسا بھی نہیں جس کی نظیر شام کے دوسرے دور میں سامنے آئی کہ وضعی احادیث سے ہادی مطلق اور دین الٰہی سب کو بدل ڈالا گیا پھر اور جو تاریخ لکھوائی گئی ہے وہ چاند پر خاک اڑانے کے مرادف ہے۔

اس دور کا آغاز کردار انسانی کا ایک المیہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ عشق اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے۔ اس کی نظیر اس عہد میں پیش کی گئی اور قرآن مجید کو آلہ فریب کے طور پر استعمال کیا گیا پھر اصل جانشین کو جس طرح راستے سے ہٹایا گیا، وہ سیاست فرمانروائی کا شاہکار ہے جس کے لئے بڑی دیدہ دلیری سے ایک کہانی گڑھ لی گئی۔۔۔ وقت کے ارتقاء کے ساتھ تاج شاہی دین کے زیب سر کردیا گیا اور بوریہ نشینی کو وہ سطوت و جبروت عطا کیا گیا کہ قیصریت اور کسرائیت کی آنکھوں میں ایک چکا چوند پیدا ہوگئی۔

پھر وقت کے محور پر پیغمبرؐ برحق کے چچا کی اولاد پیغمبر کا نام لیکر اٹھی اور اس نے غاصبوں کا قل پڑھ دیا پوری نسل کو اس طرح ناپید کیا کہ قبروں تک کو بنیاد سے اکھاڑ پھینکا۔ تاریخ میں شاید پہلی مرتبہ زندوں کے ساتھ مردوں کا نام ونشان تک مٹا ڈالا گیا لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ فاتح مفتوحین کی سیرتوں پر عمل پیرا رہے کیونکہ استقرار حکومت کے لئے اس کی ضرورت تھی۔

عرب کی بساط حکومت پر ظالمانہ شاہی کا یہ تیسرا دور پیش رووں سے زیادہ سفاکانہ تھا بنگاہ غائر دیکھا جائے تو اس دور میں اسلام اور بانی اسلام دونوں پر زبان وتلوار کی جو ضربیں لگائی گئیں ان کی جھنکار آج بھی فضائے اسلام میں سنائی دیتی ہے

حدیث سازی سے اسلام کی تاریخ یقیناً پہلے سے بدل گئی تھی لیکن اس کے خال وخد کو اس زمانے میں سنوارا گیا اور حاشیوں پر اتنی رنگ آمیزی کی گئی کہ مانویت، افلاطونیت، اسرائیلیت اور نصرانیت کے سارے رنگ اس میں دکھائی دینے لگے۔ فی زمانہ اسی کو اسلام کہا جاتا ہے اور مرسل ازل کی جو سیرت مدون کی گئی ہے اس کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ عرش سے اترا ہوا انسان آب وگل کا ایک پیکر ہفت رنگ بن گیا کہ کبھی اس میں عرش کی ملکوتیت جھلکنے لگتی اور کبھی شاہانہ آب وتاب اتنی غالب آجاتی کہ پہچاننا مشکل ہو جاتا تھا۔

جور وستم کی راہیں پہلے ہی سے کچھ کم کشادہ نہ تھیں، انھیں ممکن حد تک وسعت دی گئی۔ اتنی وسیع کہ اکثر تصور میں ان پر دورویہ کٹے ہوئے سروں کی قطاریں نظر آتیں۔ یہ سر اہل بیت رسالت اور محبان آل رسولؐ کے ہوتے پھر انھیں کے خون سے تاریخ اسلام لکھوائی گئی جو ماضی کی گرد میں دب چکی ہے اور اس کے بجائے معدلت گسترانہ مظالم کی داستانیں تاریخ بن گئی ہیں۔

اس طرح صدیوں پر صدیاں گزر جانے کے بعد کانوں میں پڑی ہوئی سیرتیں اور وضعی تاریخ اسلام عقیدہ بن چکی ہے اور اس کو کسی صحیفہ آسمانی کی طرح سچ سمجھا جاتا ہے۔۔۔ کس کس کو بتایا

جائے کہ یہ تاریخ جھوٹ سچ کا آمیزہ ہے، اس میں خاصان خدا کے کرداروں کو میزان شاہی پر تولا گیا ہے مگر موروثی عقیدے کے سامنے آواز صداقت کانوں میں گونجے گی تو سروں کو جھٹک دیا جائے گا پھر بھی میرا معروضہ یہی ہوگا کہ ایک بار ذہن کے دریچے کھول کر حالات پر غور ضرور کیا جائے پھر بھی معقولیت کے دروازے وا ہونے کے بجائے اشتعال پیدا ہو تو۔

راہ حق میں آج بھی حاضر ہیں گردن کی رگیں
رسم قربانی تو اپنے خوں میں چلتی آئی ہے

مآخذ

۱۔ ماخوذ از تاریخ مغربی یورپ مولفہ ڈاکٹر راجسن مترجمہ محمد یحییٰ تنہا صفحہ ۸ مطبوعہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی ہندوستان

۲۔ قدیم مشرق از پروفیسر عین الحق باب سوم صفحہ ۳۵۱ تا صفحہ ۳۵۷ مکتبہ فریدی اردو کالج کراچی ۱۹۵۸ء

۳۔ صحیح بخاری جلد اول باب ۱۳۳۵ صفحہ ۷۹۷ مطبوعہ فرید بک اسٹال لاہور ۱۹۹۱ء

۴۔ خلافت وملوکیت از مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صفحہ ۱۰۰ مطبوعہ ترجمان القرآن لاہور ۱۹۸۸ء

۵۔ تاریخ اعثم کوفی (اردو ایڈیشن) مکتبہ تعمیر ادب لاہور صفحہ ۳۸۷

۶۔ مدارج النبوہ از شاہ عبدالحق محدث دہلوی صفحہ ۶۹۸ مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی ۱۹۷۵ء

۷۔ صحیح مسلم جلد پنجم کتاب الامارت صفحہ ۱۵۰ تا صفحہ ۱۵۱ مطبوعہ مشتاق بک کارنر اردو بازار لاہور ۱۹۹۵ء

۸۔ ہسٹری آف سیراسنز (اردو ترجمہ) صفحہ ۸۵ مطبوعہ اردو اکیڈمی سندھ کراچی ۱۹۷۹ء

۹۔ تاریخ اسلام از شاہ معین الدین ندوی صفحہ ۳۵۲ مطبوعہ دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۵۲ء

۱۰۔ تاریخ اسلام از شاہ معین الدین ندوی صفحہ ۳۸۹ مطبوعہ دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۵۲ء

۱۱۔ تاریخ ابوالفدا جلد ۱ باب ذکر تسلیم الحسن صفحہ ۱۹۷ دار الطباعہ العربیہ بیروت لبنان

۱۲۔ خلافت وملوکیت از سید ابوالاعلیٰ مودودی صفحہ ۱۶۶ ادارہ ترجمان القرآن لاہور ۱۹۸۸ء

۱۳۔ عقد الفرید جلد ۲ صفحہ ۳۱۳ مطبعۃ الجمالیہ مصر ۱۳۳۱ھ

۱۴۔ تاریخ اعثم کوفی صفحہ ۴۰۱ مکتبہ تعمیر ادب لاہور

۱۵۔ صحیح مسلم جلد ششم صفحہ ۱۷۲ مطبوعہ مشتاق بک کارنر لاہور ۱۹۹۵ء

۱۶۔ صحیح مسلم جلد اول صفحہ ۱۹۵ مطبوعہ مشتاق بک کارنر لاہور ۱۹۹۵ء

۱۷۔ روضۃ الصفا جلد ۲ صفحہ ۷۷ مطبع نولکشور لکھنو ۱۹۱۴ء
۱۸۔ مدارج النبوہ از شاہ عبدالحق محدث دہلوی صفحہ ۵۲۲ مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی ۱۹۷۵ء
۱۹۔ السیرۃ الحلبیہ جلد ۲ صفحہ ۲۳۲ مصطفیٰ البابی الحلبی مصر ۱۳۴۹ھ
۲۰۔ مدارج النبوہ از شاہ عبدالحق محدث دہلوی صفحہ ۵۳۰ مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی ۱۹۷۵ء
۲۱۔ المسند احمد ابن حنبل جلد ۳ صفحہ ۲۸۳ مطبع میمنہ مصر ۱۳۱۳ھ
۲۲۔ مدارج النبوہ از علامہ عبدالحق محدث دہلوی صفحہ ۶۷۹ مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی ۱۹۷۵ء
۲۳۔ صحیح مسلم جلد ۲ باب فضائل علی صفحہ ۱۰۹، ۱۱۰ مطبع المصطفیٰ البابی الحلبی مصر ۱۳۴۹ھ
۲۴۔ ذخائر العقبی من محب الدین احمد بن عبداللہ طبری مکتبۃ القدسی قاہرہ ۱۳۵۶ھ
۲۵۔ صحیح مسلم جلد پنجم صفحہ ۱۲۴ مطبوعہ مشتاق بک کارنر لاہور ۱۹۹۵ء
صحیح بخاری جلد اول صفحہ ۲۵، جلد ۲ صفحہ ۱۳۸، جلد ۳ صفحہ ۱۶۵، جلد ۴ صفحہ ۵، ۱۹۲ مطبع المصطفیٰ البابی الحلبی مصر ۱۳۴۹ھ
تاریخ ابن خلدون حصہ اول اردو ترجمہ ۲۰۸ مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی ۱۹۷۶ء
رحمتہ للعالمین مولفہ قاضی محمد سلیمان حصہ اول صفحہ ۲۴۲ مطبوعہ پروگریسیو بک اردو بازار لاہور ۱۹۹۴ء
۲۶۔ صحیح بخاری جلد سوم کتاب الاحکام باب ۱۱۸۶، حدیث ۲۰۸۶، صفحہ ۸۳۰ مطبوعہ فرید بک اسٹال اردو بازار لاہور ۱۹۹۱ء
۲۷۔ صحیح بخاری جلد سوم باب ۱۲۱۱، صفحہ ۸۶۳ مطبوعہ فرید بک اسٹال لاہور ۱۹۹۱ء
۲۸۔ اشعۃ اللمعات جلد ۳ فصل ۳ صفحہ ۵۲۴ مطبوعہ نولکشور لکھنو ہندوستان
۲۹۔ شرح نہج البلاغہ جلد اجزو الرابع صفحہ ۳۵۷ من علامہ ابن ابی الحدید معتزلی طبع مصر
۳۰، ۳۱۔ سر العارفین مقالہ رابع صفحہ ۹ از امام غزالی مطبوعہ بمبئی ہندوستان
۳۲۔ سیرۃ حلبیہ از علامہ حلبی جلد ۳ صفحہ ۳۶۳ مطبوعہ مصر
۳۳۔ صحیح بخاری جلد دوم باب ۱۰ حدیث ۱۵ صفحہ ۴۰ مطبوعہ فرید بک اسٹال اردو بازار لاہور ۱۹۹۱ء
۳۴۔ صحیح مسلم جلد ۳ صفحہ ۱۴۳ مطبع المصطفیٰ البابی الحلبی مصر ۱۳۴۹ء
۳۵۔ مدارج النبوہ حصہ دوم صفحہ ۷ از علامہ الحق محدث دہلوی مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی ۱۹۷۵
۳۶۔ صحیح بخاری جلد سوم باب ۱۵۵ حدیث ۲۳۴ صفحہ ۱۱۲۴ مطبوعہ فرید بک اسٹال اردو بازار لاہور ۱۹۹۱ء

۳۷۔ تاریخ اعثم کوفی صفحہ ۴۳ (اردو ترجمہ) مکتبہ تعمیر ادب لاہور

۳۸۔ مدارج النبوۃ حصہ دوم صفحہ ۱۶ از علامہ عبدالحق محدث دہلوی مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی ۱۹۷۵ء

۳۹۔ تاریخ فرشتہ حصہ اول صفحہ ۳ مطبوعہ نولکشور پریس لکھنو ۱۹۳۴ء

۴۰۔ ماخوذ از تاریخ ابن خلدون (اردو ترجمہ) مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی

۴۱۔ صحیح بخاری جلد سوم باب ۶۷۵ حدیث ۱۱۴۷ صفحہ ۴۴۹ مطبوعہ فرید بک اسٹال لاہور ۱۹۹۱ء

۴۲۔ صحیح مسلم حصہ اول باب "ضعیف راوی" صفحہ ۳۲، ۳۳ مطبوعہ مشتاق بک کارنر اردو بازار لاہور ۱۹۹۵ء

۴۳۔ صحیح مسلم حصہ اول باب ضعیف راوی صفحہ ۳۱ صفحہ ۴۱ نوٹ حاشیہ مطبوعہ مشتاق بک کارنر اردو بازار لاہور ۱۹۹۵ء

۴۴۔ صحیح مسلم حصہ اول باب ضعیف راوی صفحہ ۲۲، ۳۸ مطبوعہ مشتاق بک کارنر اردو بازار لاہور ۱۹۹۵ء

۴۵۔ ماخوذ از سلیم بن قیس مولفہ مرزا محمد جعفر لائبریرین مکتبۃ العلوم ناظم آباد کراچی

۴۶ صحیح بخاری جلد دوم باب ۸۶۳ حدیث ۱۹۷۰ مطبوعہ فرید بک اسٹال لاہور

۴۷۔ صحیح بخاری جلد ۲ باب ۲۹۵ حدیث صفحہ ۵۲۵، صفحہ ۲۵۱، ۴۰۷ مطبوعہ فرید بک اسٹال لاہور۔

۴۸۔ ماخوذ از صحیح بخاری جلد اول مطبوعہ فرید بک اسٹال لاہور ۱۹۹۱ء

۴۹۔ صحیح مسلم جلد دوم صفحہ ۳۷۳ مطبوعہ مشتاق بک کارنر اردو بازار لاہور ۱۹۹۵ء

۵۰۔ صحابیات از علامہ نیاز فتح پوری صفحہ ۵۸ مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی ۱۹۵۷ء

۵۱۔ صحیح مسلم جلد ششم کتاب الفضائل صفحہ ۸۲ تا ۸۶ مطبوعہ مشتاق بک کارنر اردو بازار لاہور ۱۹۹۵ء

۵۲۔ صحیح مسلم جلد اول مقدمہ صفحہ ۲۷ مطبوعہ مشتاق بک کارنر اردو بازار لاہور ۱۹۹۵ء

۵۳۔ صحیح بخاری جلد سوم باب ۱۱۱۳ حدیث ۱۹۵۵ صفحہ ۷۷۰ مطبوعہ فرید بک اسٹال لاہور ۱۹۹۱ء

۵۴۔ صحیح مسلم جلد اول صفحہ ۱۹۵ مطبوعہ مشتاق بک کارنر اردو بازار لاہور ۱۹۹۵ء

۵۵۔ صحیح مسلم جلد ششم باب الفضائل صفحہ ۸۷ نوٹ حاشیہ مطبوعہ مشتاق بک کارنر لاہور ۱۹۹۵ء

۵۶۔ ماخوذ از خلافت و ملوکیت مولفہ سید ابوالاعلیٰ مودودی صفحہ ۱۶۶ مطبوعہ ترجمان القرآن لاہور ۱۹۸۸ء

۵۷۔ صحیح مسلم جلد ششم کتاب البر الصلہ والادب صفحہ ۲۰' صفحہ ۳۲۷ مطبوعہ مشتاق بک کارنر لاہور ۱۹۹۵ء

۵۸۔ صحیح بخاری جلد سوم صفحہ ۴۰۷'۴۰۸ مطبوعہ فرید بک اسٹال لاہور ۱۹۹۱ء

۵۹۔ صحیح بخاری جلد سوم صفحہ ۷۷۸'۷۷۹ مطبوعہ فرید بک اسٹال لاہور ۱۹۹۱ء

۶۰۔ نہج الاسرار من کلام حیدر کرار مولفہ سید غلام حسین رضا آقا پیش کش محمد بشارت علی صفحہ ۲۸۰ مطبوعہ حیدر آباد دکن ۱۳۹۹ھ

۶۱۔ نہج البلاغہ مترجمہ رئیس احمد جعفری و مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی صفحہ ۱۱۹ تا ۱۲۱ مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۱۹۶۹ء

۶۲۔ صحیح بخاری جلد سوم باب ۶۸۵ حدیث ۱۱۵۷ صفحہ ۴۵۳ مطبوعہ فرید بک اسٹال لاہور ۱۹۹۱ء

۶۳۔ صحیح البخاری جلد ۳ صفحہ ۱۹۲' صفحہ ۲۳۴ مطبوعہ المصطفیٰ البانی الحلبی 'مصر ۱۳۵۵ھ

یہ کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرونِ ملک مقیم ھیں

مو منین بھی اس سے استفادہ حاصل کرسکتے ھیں.

منجانب.

سبیلِ سکینہ

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدر آباد پاکستان

Knowledge for All
SABIL E SAKINA
یا عباس
۷۸۶
۱۱۰-۹۲
یاصاحب الزماں ادرکنی
DVD
Version
NOT FOR COMMERCIAL USE
لبیک یا حسینؑ
www.ziaraat.com
خصوصی تعاون: ندر عباس
رضوان رضوی
اسلامی کُتب (اردو) DVD
ڈیجیٹل اسلامی لائبریری ۔
SABEEL-E-SAKINA
Unit#8,
Latifabad Hyderabad
Sindh, Pakistan.
www.sabeelesakina.co.cc
sabeelesakina@gmail.com